ترمیم و اضافہ شدہ تیسرا ایڈیشن
آزادی کی قیمت
1947 کی داستان خونچکاں
میاں محمد ابراہیم طاہر
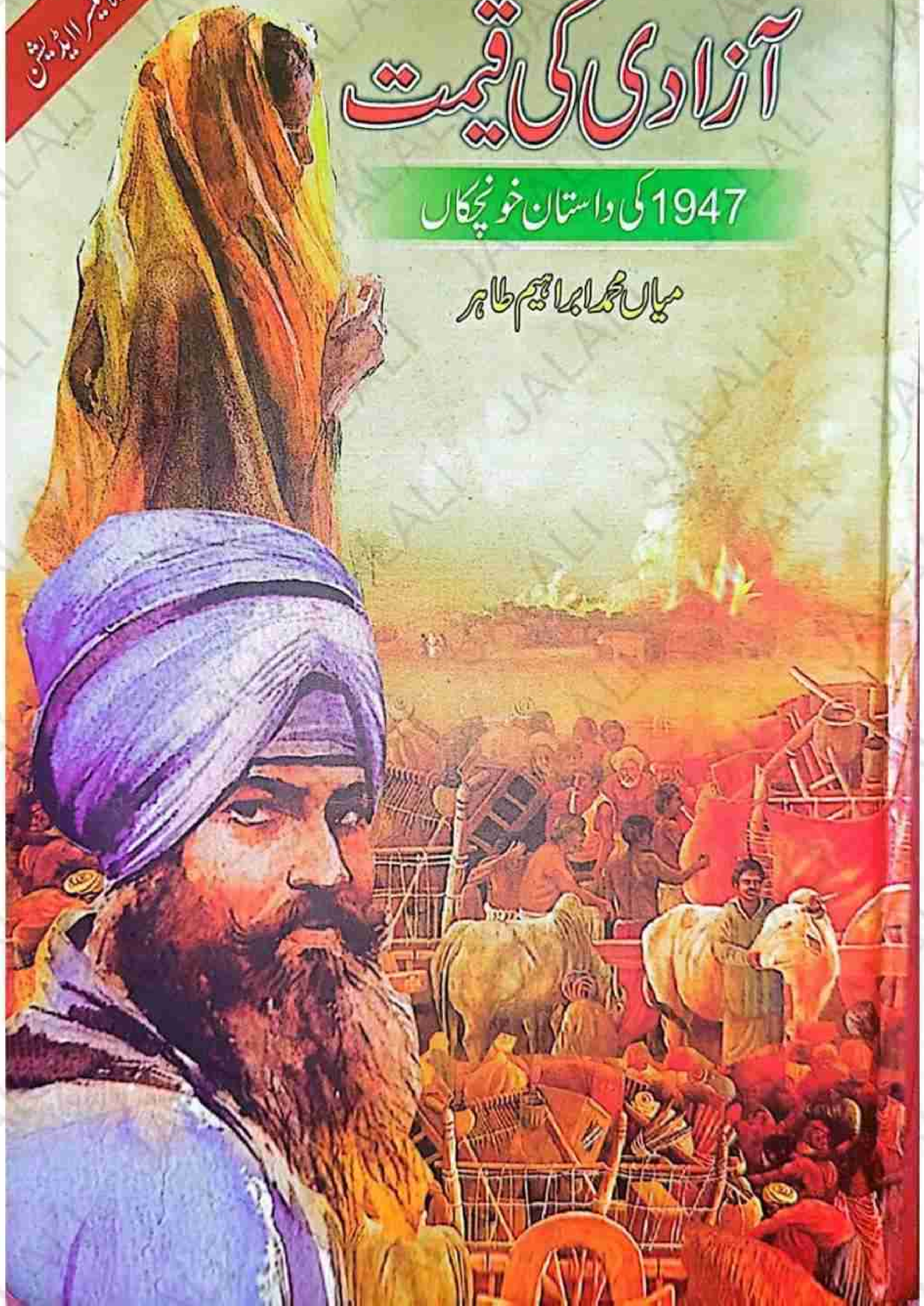
1947ء کی داستان خونچکاں

آزادی کی قیمت

حصولِ پاکستان کی راہ میں سکھ ریاست کپورتھلہ،
پٹیالہ اور دیگر علاقوں میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی دلخراش داستانیں

میاں محمد ابراہیم طاہرؔ
گولڈ میڈلسٹ تحریکِ پاکستان

حکایت پبلشرز
26 پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور.....فون 042-37356541

نام کتاب: آزادی کی قیمت، تیسرا ترمیم واضافہ شدہ ایڈیشن 2018ء
تحریر و ترتیب: میاں محمد ابراہیم طاہر، موبائل 0300-4154083
منتظم اشاعت: عارف محمود
سال اشاعت: 2007ء، 2009ء، تیسرا ایڈیشن 2018ء
کمپوزنگ+فارمیٹنگ: محمد عقیل عمر 0300-8141019
قیمت: -/600

رابطہ کے لیے:
ماہنامہ حکایت، 26 پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور، فون 042-37356541
میاں محمد ابراہیم طاہر، 205۔ایم، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700

ناشر: حکایت پبلشرز۔26 پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور، فون 042-37356541

انتساب

اپنے والدین کی پاک روح کے نام

جن کی دعاؤں کی قبولیت کے طفیل اللہ رب العزت نے مجھے زندگی کے کٹھن مراحل بطریق احسن طے کرنے کے لیے صبر و استقامت کی طاقت بخشی اور اپنی بے پایاں رحمت سے ہر ہر قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور بے حد و حساب کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کیا۔

اور

ان لاکھوں شہداء کے نام

جن کا لہو سرزمینِ پاک کی بنیادوں میں شامل ہے۔

فہرست

عرضِ حال

میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے ”آزادی کی قیمت“ کے 2007ء کے پہلے اور 2009ء کے دوسرے ایڈیشن کو بے پناہ پذیرائی بخشی اور کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ مختلف اخبارات و جرائد نے اس پر شاندار الفاظ میں تبصرے شائع کئے اور بعض نے اس کے مضامین یوم آزادی کے موقع پر اپنے صفحات کی زینت بنائے۔ متوقر و مؤثر اخبار روزنامہ ”نوائے وقت“ نے خصوصی طور پر اپنے سنڈے میگزین کی اشاعت میں کتاب کے چند اہم مضامین اور کتاب کے ٹائٹل کور رنگین صفحات پر شائع کیا۔

مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ کتاب نے سب سے زیادہ پذیرائی ہمارے نوجوان طلباء و طالبات میں حاصل کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو مرتب و مدون کرتے وقت یہی نوجوان طبقہ میرا مخاطب بھی تھا۔ ہمارے بزرگوں کو اکثر یہ شکایت کرتے دیکھا اور سنا جاتا ہے کہ ہماری نوجوان نسل اپنی تاریخ سے لاپرواہ اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد اور اس سلسلے میں دی گئی قربانیوں سے نابلد ہے۔ اب میں اپنے تجربے کی بناء پر فخر سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں میں اپنی تحریکِ آزادی سے بے پناہ دلچسپی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ قیامِ پاکستان کے محرکات کو جاننے کے خواہشمند ہیں۔

تحریکِ آزادی کے بزرگ کارکنوں نے بھی جو بفضلِ تعالیٰ حیات ہیں، میری بے پناہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ ”کارکنانِ تحریکِ پاکستان ورکرز ٹرسٹ“ اور ”نظریہ پاکستان ٹرسٹ“ میرے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے یومِ آزادی 14 اگست 2007ء کی

تقریب میں میری اس کاوش کو متعارف کرایا۔

کتاب کے اس تیسرے ایڈیشن میں بعض تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کچھ ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے اور چند نئے مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔

میں نے 14 اگست 2007ء کو ''نظریہ پاکستان ٹرسٹ'' اور ''کارکنانِ تحریک پاکستان ورکر ٹرسٹ'' کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریب میں یہ اعلان کیا تھا کہ میری یہ کتاب سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے بلا قیمت، تحریکِ پاکستان کے کارکنوں اور طلباء و طالبات کے لئے نصف قیمت پر دستیاب ہوگی۔ اگرچہ نئے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت کاغذ کی قیمت میں بے پناہ اضافہ اور پرنٹنگ اور بائنڈنگ کے اخراجات بھی بہت زیادہ بڑھ چکے ہیں، لیکن میں اپنے اعلان پر قائم ہوں، کیونکہ میرا مقصد منافع کمانا نہیں، تحریکِ پاکستان کے لئے دی گئی قربانیوں کی مصدقہ داستانوں کو نوجوان نسل تک پہنچانا ہے۔ امید واثق ہے کہ یہ ایڈیشن بھی پہلے ہی کی طرح پذیرائی حاصل کرے گا۔

''آزادی کا سفر'' ہر اس شخص کی داستان ہے جو بھارت سے ہجرت کے بعد خون کے کئی دریا عبور کر کے زندہ سلامت ''مملکتِ خداداد پاکستان'' پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اس لئے 1947ء کی داستان خونچکاں کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں بانیانِ مملکت خداداد پاکستان'' کی عظیم قربانیوں کو یاد رکھ سکیں۔ ہندوؤں اور سکھوں نے 1947ء میں قتل و غارت، ظلم و بربریت، وحشت و درندگی کا جو بازار گرم کیا تھا اگر انہیں دوبارہ موقع ملا تو وہ مسلمانوں کے خلاف پہلے سے کئی گنا زیادہ شدت کے ساتھ اسی تاریخ کو دہرائیں گے کیونکہ اب وہ نہ صرف ایٹمی قوت ہیں اور امریکہ کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی دوسری بڑی سپر پاور سمجھتے ہیں بلکہ انہیں روس کے ساتھ ساتھ اب امریکہ اور اسرائیل کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اس مکار دشمن سے نہ صرف ہوشیار رہنے بلکہ ہمہ وقت اپنے گھوڑے تیار رکھنے کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی بھی ضرورت ہے۔

بعض حلقوں سے یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پون صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد اس داستانِ پارینہ کو سنانے کا فائدہ؟ جب کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے ہمارے

نوجوان حکمرانوں کا ایک خاص حلقہ جن کے آباؤ اجداد کا تحریکِ پاکستان میں کوئی کردار نہیں ہے، بھارتی پنجاب کے حکمرانوں سے محبت و خیر سگالی کے نام پر چھپے ڈالنے اور پگڑیاں بدلنے میں بڑا سرگرمِ عمل رہا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں دونوں ملکوں کے ساتھ ساتھ تجارت بڑھانے کے حامی پیٹ کے پجاری تاجروں، بھارت کا نمک کھا کر پاکستان کو ایک ناکام ریاست ثابت کرنے پر زورِ صرف کرنے والے لکھاریوں، نیم عریاں ساڑھیاں پہن کر اپنے بے ہنگم پیٹ کی نمائش کرنے والی ناریوں اور سرکاری و نیم سرکاری افسران کی اِدھر سے اُدھر آنیاں جانیاں لگی رہی ہیں۔ دونوں طرف ایک دوسرے کی بڑی آؤ بھگت ہوتی رہی ہے۔ عیش و عشرت کے دیوانے اور پینے پلانے کے فرزانے اپنی اپنی ترنگ میں آ کر دونوں ملکوں کے درمیان 1947ء میں کھینچی گئی ''لکیر'' کو مٹانے کی باتیں کرتے رہے ہیں اور ٹی وی چینلوں پر بھی ''امن کی آشا'' کے گیت الاپے جاتے رہے ہیں۔ افسوس یہ ہماری نئی نسل کے وہ حکمران ہیں جنہوں نے نہ ہندوؤں، سکھوں کی وحشت و بربریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے نہ ہی غالباً ان کے بزرگوں نے خون کے وہ دریا پار کیے ہیں جن سے گزر کر مشرقی پنجاب کے اہلِ ایمان لاکھوں شہیدوں کی جانوں، دخترانِ اسلام کی عصمتوں اور اربوں کی املاک کی قربانی دے کر مملکتِ خداداد پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لہٰذا دوستی، امن اور بھائی چارے کی باتیں بھارت کی مکارانہ چالیں ہیں۔ اس نے پاکستان کو صدقِ دل سے نہ 1947ء میں تسلیم کیا تھا نہ اب کیا ہے۔ پاکستان کو کمزور کرنے بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹانے کا جو مقصد بھارت اب دوستی اور خیر سگالی کی آڑ میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ مقصد ہماری نظریاتی سرحدوں کو اپنے وظیفہ خواروں، گماشتوں اور تنخواہ دار ایجنٹوں کے ذریعے تباہ کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بھارت دُنیا کی نظروں میں دھول جھونک رہا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ پرامن طور پر رہنا چاہتا ہے، جبکہ وہ پاکستان کو بے آب و گیاہ ریگستان میں تبدیل کرنے کے لئے ہمارے دریاؤں کے رُخ موڑ کر ان پر بند باندھ کر ہمیں پانی کے ایک ایک قطرے کے لئے اپنا محتاج اور دستِ نگر بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بھوکے ننگے عوام کے پیٹ کاٹ کر اربوں ڈالر کے اسلحے کے انبار کس کے خلاف لڑنے کے لئے لگا رہا ہے؟ وہ

کشمیر کی جنگ بندی لائن پر باڑھ لگا کر اسے مستقل سرحد بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی وحریت کو کچلنے کے لئے مقبوضہ کشمیر میں اپنی سات لاکھ سے زائد فوج کے ذریعے قتل وغارت گری، ظلم واستبداد اور دہشت گردی کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔ دوستی اور بھائی چارے کی چکنی چپڑی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کشمیر کو اپنا ''اٹوٹ انگ'' بھی قرار دیتا ہے اور آزاد کشمیر پر بھی اپنا حق جتاتا ہے اور اپنے مؤقف سے سرِ مو ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنی خفیہ ایجنسی ''را'' کے ذریعے پاکستان میں وسیع پیمانے پر دہشت گردی، تخریب کاری اور بم دھماکوں سے بے گناہ شہریوں، عورتوں اور معصوم بچوں کا قتل عام کروا رہا ہے۔ کیا دوستی اور خیر سگالی کی ٹریفک یک طرفہ طور پر چل سکتی ہے؟ ہماری بوڑھی نسل جواب ناپید ہوتی جارہی ہے اور جس نے اس ملک کے قیام اور تحریکِ پاکستان میں عملاً حصہ لیا اور ہندوؤں اور سکھوں کے وحشت وبربریت کے مظاہرہ کو بچشمِ خود دیکھا، ان خونی واقعات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ کاش ہماری نئی نسل ہندوؤں اور سکھوں سے خیر سگالی اور محبت کی پینگیں بڑھانے سے پہلے لاکھوں انسانوں کے اس خون کو جس سے دونوں ملکوں کے درمیان کھینچی گئی ''لکیر'' کو سینچا گیا ہے، پیشِ نظر رکھے اور قومی عزت و وقار ملی حمیت وغیرت اور حب الوطنی کے تقاضوں کو فراموش نہ کرے۔

تحریکِ آزادی کے دوران ہمارا قومی نعرہ تھا۔

''پاکستان کا مطلب کیا! لا الہ الا اللہ کے نام سے بنے اس ملک کو جس نے بھی نقصان پہنچایا، اُسے اپنی طبعی موت مرنا نصیب نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے اور اُس کے پورے خاندان کو نیست ونابود کرکے دُنیا کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا۔ ان کا تذکرہ ہم کتاب کے آخر میں کریں گے۔

میاں محمد ابراہیم طاہر

آزادی کی قیمت

پروفیسر محمد حنیف شاہد

"آزادی کی قیمت" اس مردِ مجاہد کی تالیف ہے جس نے "سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپاہ گری" کی بجائے ذرا تحریف کے ساتھ "سو پشت سے ہے پیشۂ آباء صحافت گری" کے مصداق اپنی زندگی مستعار "صحافت" اور "سفر" میں گزاری ہے۔ ہماری مراد میاں محمد ابراہیم طاہر ہیں جنہوں نے قریباً پچپن برس قبل اپنی صحافتی زندگی کا آغاز فیصل آباد سے اپنے وقت کے نہایت مؤقر اور مؤثر اور مقبول اور معروف اخبار "زمیندار" کے نمائندے کی حیثیت سے کیا اور بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان سے ان کے بقول "عصمت صحافت" کی تربیت حاصل کی۔ جناب طاہر نہایت خوش نصیب اور خوش قسمت انسان ہیں کہ بابائے صحافت کی سرپرستی اور رہنمائی میں ان کے خوابیدہ اور خفتہ جوہر کھلے، پڑھنے لکھنے کا شوق تو انہیں بچپن سے ہی تھا لیکن مولانا ظفر علی خان نے اسے جلا بخشی، انہوں نے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ اور امریکہ کے متعدد سفر کیے، چنانچہ آپ کے اکثر و بیشتر سفرنامے قومی اور نظریاتی اخبار روزنامہ "نوائے وقت" کی زینت بنے اور انہوں نے عوام وخاص سے داد پائی۔ آپ کی اوّلین تصنیف "عالمی سفرنامہ" قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب "آزادی کی قیمت" 1947ء کی داستانِ خونچکاں ہے جو دو حصوں یعنی "قتل گاہ کپورتھلہ" اور "پٹیالہ میں قتل عام" پر مشتمل ہے۔ اس میں شک نہیں اس دل دوز موضوع پر سینکڑوں کتب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں اور شہرت عام اور

بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں، لیکن یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ہماری تاریخ کا ایک خونیں باب ہے اور سکھوں اور ہندوؤں کی سفا کی، قتل عام، غارت گری اور لوٹ مار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ہندو اور سکھ ہمارے ازلی اور ابدی دشمن ہیں۔ مقام صد افسوس ہے کہ ہم انتہائی سادہ لوح ثابت ہوئے ہیں اور تلخ حقائق سے آنکھیں موند لی ہیں۔ ہم نے ہندوؤں اور سکھوں کی عیاریوں، مکاریوں اور چالبازیوں کو نہیں سمجھا۔ ہمارا جانی دشمن ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے دن رات مصروف عمل ہے اور ہمارے حکمران عاقبت نا اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ دوستی اور خیر سگالی کے لئے بے تاب اور پریشان ہیں۔ یہ وہی ازلی، ابدی، عیار اور مکار دشمن ہے جس کے بارے میں بابائے قوم حضرت قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا۔

''نئی مملکت کا عین اس کے قیام کے وقت دیگر کئی طریقوں سے ''گلا گھونٹنے'' کی کوششوں سے مایوس ہو جانے کے بعد ہمارے دشمن یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ معاشی حربوں سے اپنا دلی مقصد حاصل کر لیں گے۔ تعصب اور بد دیانتی کی بنیاد پر گھڑے گئے طول طویل دلائل سے لیس ہو کر وہ یہ پیش گوئی کر بیٹھے تھے کہ ''پاکستان دیوالیہ'' ہو جائے گا اور جو کچھ دشمن آتش اور آہن سے نہ چھین سکا وہ مملکت کی تباہ حال معیشت سے اسے حاصل ہو جائے گا، لیکن ''بدی کے یہ دیوتا'' رسوا ہو کر رہ گئے ہیں''۔

(پاکستان کی پہلی سالگرہ پر قوم کے نام الوداعی پیغام، کراچی، 14 اگست 1948ء)

بانئ پاکستان کا مذکورہ بالا پیغام ہمارے لئے لحہ فکریہ ہے اور قیام پاکستان سے لے کر تادم تحریر پیش آنے والے حالات اور واقعات پکار پکار ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہے ہیں کہ ہندو بنیا جسے قائد اعظم ''بلیک بنیا'' (Black Banya) کہا کرتے تھے، وہ شب و روز کوشاں ہے کہ پاکستان کو معاشی طور پر مفلوک الحال، تباہ و برباد اور نیست و نابود (خاکم بدہن) کر دے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک باون سے زیادہ ڈیم بنا چکا ہے اور ابھی مزید ڈیموں کی تعمیر کا بھوت اس پر سوار ہے۔ ڈیموں کی تعمیر سے وہ پاکستان کو پانی کی سپلائی روک کر مفلوج کرنا چاہتا ہے اور ہماری سبز و شاداب اراضی کو ریگستان اور بنجر بنانا چاہتا ہے،

لیکن اس شیطان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت ہمارے ساتھ ہے، بقول حضرت قائداعظمؒ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور ہمیشہ قائم ودائم رہے گا۔انشاءاللہ'':

تاریخی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت میں اس لئے اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس میں تحریکِ پاکستان کی ممتاز اور قد آور شخصیات کے رشحات قلم کو نہایت سلیقے اور قرینے سے پیش کیا گیا ہے، ان میں خواجہ عبدالرحیم، حضرت مولانا مجاہد الحسینی، حبیب اللہ شاہین، فیروز خان نو، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش، سردار علی احمد خان، جسٹس سید جمیل حسین رضوی، بیگم سلمیٰ تصدق حسین قابل ذکر ہیں جنہیں پڑھ کر ہمیں نہ صرف عبرت حاصل کرنی چاہئے بلکہ ''بدی کے دیوتا'' کا اس ضمن میں مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔ یہ کتاب جہاں ہمارے لئے سامانِ عبرت مہیا کرتی ہے وہاں ہماری غیرتِ ملی کو بھی ابھارتی ہے اور ہمارے لئے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتی ہے۔

......☆......

آزادی کی قیمت

فضل حسین اعوان

ہمیں آزاد پاکستان ملا، آباد پاکستان ملا، آزادی کی قیمت ان لوگوں نے ادا کی جو تلواروں، کرپانوں اور بندوقوں سے خاک میں ملا دیئے گئے، خون میں نہلا دیئے گئے۔ آزادی کی اتنی بھاری قیمت شاید ہی کسی اور قوم نے ادا کی ہو جو برصغیر کے مسلمانوں نے ادا کی۔ معصوم بچوں اور خواتین سمیت لاکھوں افراد کو قتل کر دیا گیا۔ ایک لاکھ سے زائد بیٹیوں کی عصمت اس آزادی کی بھینٹ چڑھی۔ آزادی کی ان لوگوں نے قیمت ادا کی جو اپنے پیاروں کی خون میں لت پت لاشیں چھوڑ کر ارض پاک پر خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کتنے بدبخت ہیں وہ لوگ جو ان قربانیوں کو فراموش کر کے بسنت منانے کی ضد کر رہے ہیں۔ خاک اور خون کا دریا عبور کر کے ہندوستان سے پاکستان پہنچنے والوں کی ہزاروں داستانیں ہیں جن کو زبان مل گئی اور لاکھوں ان سینوں میں دفن رہ گئیں جو جان سے گئے اور ہزاروں ایسی بھی ہیں جنہیں اس لئے زبان نہ مل سکی کہ ان کو سننے والا کوئی نہیں تھا اور چند ایک ایسی داستانیں بھی منظر عام پر آ گئیں جن کو بے زبانی کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ آزادی کے سفر میں ہزاروں مسلمان بیٹیوں کو جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر سکھوں اور ہندوؤں کے گھر بسانا پڑے۔ آج بھی ان خواتین کے دل میں پاکستان کی محبت کے دیئے روشن ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک پاکستانی جوان کو بارڈر کے اس پار سکھوں نے سمگلر سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ ایک سکھ نے اسے اپنے گھر کی کوٹھڑی میں بند کر دیا، تاکہ صبح

حکومت کے حوالے کر سکے۔ شام ہوئی تو سکھ کی عمر رسیدہ بیوی اس پاکستانی جوان کو کچھ کھانے کے لئے دینے آئی۔ اس عورت نے پاکستانی جوان کو کھانا تو دے دیا مگر ساتھ ہی ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم سمگلنگ جیسا گھٹیا اور ناجائز کام کرتے ہو، کیا ''ہم'' نے پاکستان اس لئے بنایا تھا۔ پاکستانی جوان بہرحال سمگلر تو نہ تھا، لیکن اسے خاتون کے لفظ ''ہم'' پر تعجب ہوا۔ بھلا سکھوں نے تو پاکستان نہیں بنایا تھا تو پھر اس ''سکھنی'' نے لفظ ''ہم'' کیوں استعمال کیا۔ اس معمے کو حل کرنے کے لئے جوان نے ''خاتون'' سے پوچھ ہی لیا۔ ''اماں جان آپ تو پڑھی لکھی اہل خاندان کی خاتون معلوم ہوتی ہیں، مگر آپ کے خاوند تو آپ سے بالکل مختلف ہیں اور وہ پھر آپ کی ڈانٹ میں بھی مجھے شفقت اور محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ آخر اس کی وجہ، اس نے کہا ٹھہرو میں کنڈی لگا آؤں، گھر کا دروازہ بند کر کے عورت واپس آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک رہے تھے۔ وہ کہنے لگی کہ میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان خاندان کی نوجوان بیٹی تھی۔ 1947ء میں میرے سامنے میرے سارے گھر والوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے قتل کر دیا، میں اپنے دس سالہ بھائی کو لے کر بھاگی ایک سکھ نے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تو میرا ننھا سا بھائی مجھے اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک ہندو نے اسے پکڑ کر ایک طرف کھینچا اور پھر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اُڑا دی۔ بھائی کی گردن کاٹ کر ہندو نے کہا کہ لو اتنی آسانی سے مسلے کی گردن کٹ گئی، خواہ مخواہ میری تلوار اس کے خون سے بھرشٹ (ناپاک) ہوگئی۔ اب کئی سکھوں نے میرے کپڑے نوچ کر اتار دیے اور میری عصمت دری کی اور پھر میں متعدد ہندو، سکھوں کے ہاتھوں آگے آگے فروخت ہوتی رہی۔ آخر اس سکھ نے مجھے گھر ڈال کر میرے ساتھ شادی کر لی۔ پھر وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی کہ میں نے اپنے خاندان، اپنے معصوم بھائی اور اپنی عصمت کی قربانی دی ہے، اپنے پاکستان کے لئے۔ پاکستان میرے لئے اس قدر مقدس ہے کہ جب میرے بچے بیمار ہوتے ہیں تو میں لفظ پاکستان کہہ کر ان پر دم کر دیتی ہوں اور میرا اللہ انہیں شفا بخش دیتا ہے۔'' آزادی کی بھاری قیمت ادا کرنے کے باوجود آزادی کا سفر ابھی ختم نہیں

ہوا"۔ یہ سفر اس دن پایہ تکمیل تک پہنچے گا جب تقسیم ہند کے نامکمل ایجنڈا کی تکمیل کشمیر کی آزادی کی صورت میں ہوگی۔ تاہنا ک مستقبل کے لئے ماضی میں جھانکنا اور اس سے سبق حاصل کرنا ضروری ہے۔ ماضی اور اپنی تاریخ یاد دلانے کے لئے میاں محمد ابراہیم طاہر کی تصنیف آزادی کی قیمت کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں تقسیم سے قبل مسلمانوں کی حالت زار، آزادی کا سفر، مسلمانوں کا قتل عام، مہاجر کیمپوں کی صورت حال اور رقت آمیز واقعات سمیت بہت کچھ ہے۔ (نوائے وقت)

......☆......

آزادی کی قیمت (تبصرہ)

آغا امیر حسین

زیرِ نظر کتاب کے پیش لفظ میں آغا امیر حسین نے لکھا ہے:

"بھارت آزادی کے بعد سے اب تک اپنے عوام کو آزادی کی نعمتوں سے سرفراز کرنے کی بجائے انہیں خط غربت کی لکیر سے بہت نیچے لے جاچکا ہے۔ یہ بھی المناک حقیقت ہے کہ آزادی کے ساٹھ سے زیادہ برس گزار لینے اور ایٹمی طاقت کا درجہ حاصل کرلینے کے باوجود پاکستان کے چاروں صوبوں کے عوام میں قومی یکجہتی کا تصور پیدا نہیں ہوسکا اور قومی انتشار روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ دہشت گردی، بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ، کرپشن اور اقربا پروری کی اس فضا میں ہم نے ان لاکھوں جاں نثاروں کو نظر انداز کردیا ہے جنہوں نے اپنے آج کو ہمارے مستقبل کے تحفظ کے لئے اپنی جانوں کی قربانی دی تھی اور پاکستان کی طرف ہجرت کر کے نئی تاریخ رقم کی تھی۔ ہم ان ان بہنوں اور بیٹیوں کی قربانیوں کو بھلا دیا جو پاکستان کی طرف ہجرت کرتے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بربریت کا نشانہ بن گئیں۔ ظلم وتشدد کی یہ داستانیں ماضی میں لکھی جاتی رہی ہیں اور اب میاں محمد ابراہیم طاہر نے ہمارے احساسِ غیرت کو بیدار کرنے کے لئے دوبارہ کتاب کی صورت دی ہے جس کا عنوان ہے "آزادی کی قیمت" اور جو اس حقیقت کو نئی نسل کے سامنے لاتی ہے کہ تقسیم برصغیر کتنی خونچکاں داستان تھی اور ایک نظریاتی وطن قائم کرنے کے لئے ہمارے گزشتگان نے اپنا نقد جان کس طرح پیش کیا تھا اور آج ہم اس نعمت عظمیٰ کو

کس طرح پامال کرر ہے ہیں۔اس کتاب کے تمام دردناک اور خونچکاں واقعات آغا امیر حسین، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش، جسٹس سید جمیل حسین رضوی، سردار احمد علی خان، بیگم سلمیٰ تصدق، خواجہ افتخار اور جمیل اطہر قاضی وغیرہ نے 1947ء کے حالات سے اخذ کئے ہیں۔ یہ وحشت و بربریت کے خونیں دریا سے گزر کر پاکستان آنے والی متعدد لوگوں کی داستانیں ہیں جو ان کی زبانی سنی گئیں یا کتابوں میں لکھی گئی ہیں اور ان سب کو حوالوں کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔اس ضمن میں میاں محمد ابراہیم کی محنت کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے قومی غیرت کو بیدار کرنے کے لئے سینکڑوں لوگوں کی کتابوں کا مطالبہ کیا اور ان سے وہ خونچکاں داستانیں تلاش کیں۔

زیر نظر کتاب بھی قوم کی خدمت کے خالص جذبے سے لکھی گئی اور اس کی وسیع اشاعت کے لئے آغا امیر حسین نے ''سپوتنک'' میں شائع کیا۔

......☆......

ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار

ڈاکٹر مجید نظامی (مرحوم)

ہندوستان کی آزادی سے قبل جب ہندوستانی مسلمان قائداعظمؒ کی قیادت میں اپنے حقوق اور آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے تو ہندو کانگرس کے ''پروپرائیٹر'' مسٹر گاندھی دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ہندوستان میں کوئی ہندو مسلم مسئلہ ہے ہی نہیں اور آل انڈیا مسلم لیگ جسے مسئلہ قرار دیتی ہے، وہ بیرونی حاکموں انگریزوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب وہ یہاں سے واپس چلے جائیں گے تو کانگرس اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے حل کر دے گی۔ بعض نام نہاد مسلمان جن کا تعلق قوم پرست گروہ سے تھا کانگرس کے اس وعدے سے خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ حصولِ آزادی کے بعد کانگرس مسلمانوں کے مسائل کو واقعی حل کر دے گی۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہندو کانگرس نے یہ مسئلہ اس طرح حل کیا کہ اس نے ہندوستان میں مسلمان اقلیت کے وجود کو ہی غیر مؤثر بنا کر رکھ دیا۔ بھارتی مسلمانوں کے بارے میں ہندو کانگرس کی پالیسی یہ رہی ہے کہ اس اقلیت کو اپنی بے انصافیوں کے جواز کے لئے جسمانی طور پر تو زندہ رکھا جائے لیکن ہندوستانی معاشرے میں اس کے وجود کو نہ ہونے کے برابر بنا دیا جائے۔ گاندھی کا فلسفہ یہ تھا کہ اگر ہندو ایک مفلس و قلاش مسلمان کو مار ڈالتے ہیں اور اس کے جواب میں یہ قلاش مسلمان کسی ہندو کو ہلاک کر دیتے ہیں تو اقتصادی نقصان ہندو قوم کا ہوگا، کیونکہ قلاش مسلمان کے مقابلے میں کوئی ہندو لکھ پتی سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ آج بھی ہندو قوم اپنے باپو کے اسی فلسفے پر عمل پیرا ہے۔ اس نے بھارت کی مسلمان اقلیت کو محض اس

لئے زندہ رکھا ہوا ہے کہ اپنی متشددانہ بے انصافیوں کے جواز کے لئے ایسا کرنا اس کے لئے بے حد ضروری ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھارت میں اس وقت 92 فیصد مسلمان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ سابق بھارتی وزیر اعظم سردار من موہن سنگھ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے گزشتہ مارچ میں عدالت عالیہ کے سربراہ جسٹس راجندر سچر کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ حال ہی میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی ہے لیکن اس کی تفصیلات ابھی منظرِ عام پر نہیں آئیں، تاہم ابتدائی طور پر اس کے جو مندرجات اخبارات کی زینت بنے ہیں، ان کے مطابق بھارتی مسلمان اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے ملک میں موجود دیگر برادریوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں میں غربت اور ناخواندگی دوسری برادریوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں ان کی نمائندگی تشویش ناک حد تک کم ہے۔ شہری علاقوں میں مسلمان عموماً جھگی جھونپڑی والے علاقوں میں رہتے ہیں، جہاں صاف پانی اور صفائی کی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ سچر کمیٹی نے مسلمانوں کی حالت زار بہتر بنانے کے لئے ایک جامع پروگرام شروع کرنے کی سفارش کی ہے۔ سچر کمیٹی نے مسلمانوں کی زیادہ آباد تیرہ (13) ریاستوں سے اعداد و شمار جمع کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انصاف اور امن و امان کے حوالے سے بھی مسلمانوں کو شدید تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مہاراشٹر میں مسلمانوں کی آبادی 30.9 فیصد ہے اور جیلوں میں ان کی تعداد 28.1 فیصد ہے۔ کرناٹک میں مسلمانوں کی آبادی 12.23 فیصد ہے، جبکہ جیلوں میں ان کی تعداد 17.9 فیصد ہے۔ نئی دہلی کی تہاڑ جیل میں 14328 قیدیوں میں سے 5620 مسلمان ہیں۔ رپورٹ کے مطابق پولیس مسلمانوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیتی ہے اور عدالتوں سے انہیں انصاف نہیں ملتا۔ مغربی بنگال میں مسلمان کل آبادی کا 25 فیصد ہیں، لیکن ان کی نمائندگی صرف پانچ فیصد ہے۔ آسام کی 31 فیصد مسلم آبادی میں سے نمائندگی کی شرح صرف 9.4 فیصد ہے۔ مقبوضہ جموں و کشمیر کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی

حالت بے حد خراب ہے۔انہیں بہت کم سرکاری ملازمتیں ملتی ہیں۔اسی طرح مغربی بنگال کے مسلمان اعلیٰ عہدوں سے یکسر محروم ہیں۔مسلمانوں سے امتیازی سلوک روا رکھنے کے حوالے سے بھارت کی حزبِ اقتدار ہو یا حزب اختلاف، یکساں ذہنیت کی حامل ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے حکومت کو پہلے متنبہ کر دیا ہے کہ وہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی بہتر بنانے کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔واضح رہے کہ جب چند ماہ قبل سچر کمیٹی نے فوج کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی تعداد جاننے کی کوشش کی تھی تو خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی تھی۔بھارتی حکام لاکھ دعویٰ کریں کہ ان کے ہاں رنگ ونسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر تمام شہریوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔صرف دنیا کو دکھانے کی خاطر ایک مسلمان کو سربراہ مملکت بنا دیا گیا ہے، جبکہ عام مسلمانوں کو ان کی بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ دنیا بھر کی انٹیلی جنس ایجنسیوں میں بھرتی صرف میرٹ پر ہوتی ہے، لیکن بھارت دُنیا کا واحد ملک ہے جہاں تعیناتی کی بنیاد مذہب ہے۔ان ایجنسیوں میں ملازمت کے لئے اگر کوئی مسلمان یا سکھ درخواست دے تو اس کو صرف مذہب کی بنیاد پر ملازمت نہیں دی جاتی۔ایک بھارتی جریدے ''آؤٹ لک'' کی رپورٹ کے مطابق اگرچہ ایک سکھ بھارت کا وزیر اعظم ہے، مگر ان کے تحفظ کے لئے کوئی سکھ یا مسلمان بطور باڈی گارڈ نہیں رکھا گیا۔ایک طے شدہ پالیسی کے تحت ملک کی اعلیٰ قیادت کی حفاظت کے لئے کسی مسلمان یا سکھ کو باڈی گارڈ نہیں رکھا جا سکتا۔سکیورٹی اداروں میں ملازمت کے حوالے سے مسلمانوں کو نا قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے۔1969ء کے بعد سے کسی مسلمان کو بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' میں بھرتی نہیں کیا گیا۔اس ایجنسی کے کوڈ کے مطابق کوئی مسلمان ''را'' میں ملازمت کا اہل نہیں ہے۔ بھارتی فوج گیارہ لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد صرف 29 ہزار ہے اور انہیں بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، معاشرتی طور پر بھی مسلمانوں کی حالت اتنی خراب ہے کہ مسلمان لڑکیاں ہندو لڑکوں کے ساتھ شادیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بھارتی حکومتوں نے مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں دیدہ و دانستہ

پالیسی اپنائی کہ وہاں لڑکیوں کے لئے تو اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کیے، مگر لڑکوں کے لئے قائم نہ کیے۔ اس کی وجہ سے مسلمان لڑکیاں کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کر لیتی ہیں، مگر بے چارے مسلمان لڑکے تعلیمی لحاظ سے ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا اپنے سے کم تر تعلیمی قابلیت کے حامل مسلمان لڑکوں سے ان کی ذہنی ہم آہنگی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ سرکاری طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد سترہ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اور یہ ناروا سلوک صرف مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ دوسری اقلیتوں کے ساتھ بھی ہو رہا ہے، جن میں عیسائی اور ادنیٰ ذات کے ہندو بھی شامل ہیں۔ ہندوستان میں دوقومی نظریے کی حقانیت قدم قدم پر ظاہر ہو رہی ہے، لیکن ہٹ دھرم ہندو قوم نہ تو اس نظریے کو تسلیم کرتی ہے، کیونکہ اسے قبول کر کے اسے تقسیم ہند کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے اور نہ وہ مسلمانوں سمیت دیگر اقلیتوں کو مسلمہ بین الاقوامی حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ قائداعظمؒ نے پاکستان اور بنگلہ دیش کو آزادی دلا کر برصغیر کے 32 کروڑ مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے، لیکن برصغیر کے مسلمانوں بالخصوص پاکستان کی جاہ پسند قیادتوں کی کمزوری کی وجہ سے ایک بدبخت گروہ نے ابھی تک قیامِ پاکستان کو سوالیہ نشان بنا رکھا ہے۔ یہ عنصر جسے نرم سے نرم الفاظ میں ''احسان فراموش'' کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، اس نے مسلمانوں کی ان لازوال قربانیوں کو بھی فراموش کر دیا ہے، جن میں شاید ان کے آباؤ اجداد کا خون بھی شامل ہو، کیونکہ ہندو نے قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کے قتل عام میں مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا تھا۔ اگر اس قدر ٹھوس دلائل کے باوجود اس گم کردہ راہ عنصر کو اب بھی ہندو کے انصاف پر بھروسہ ہے تو وہ ہندوستان جا کر مزید تجربہ کر لے۔ اگر دو چار ماہ میں ہی اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ، لیکن ایسی حالت میں اسے دوبارہ پاکستان آ کر آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہونے کا موقع شاید نہ مل سکے۔

بشکریہ ''نظریۂ پاکستان'' نومبر 2006ء

......☆......

آزادی کا سفر۔ 1947ء کی داستانِ خونچکاں

قتل گاہِ کپورتھلہ

(حصہ اوّل)

حصولِ پاکستان کے لئے قربانیوں کی دل خراش داستانیں

تحریر و ترتیب
میاں محمد ابراہیم طاہر

آزادی کا سفر

سفر کا شوق ہر انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ بلکہ انسانی زندگی بھی ایک سفر ہی ہے، جو انسان کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپے کی منزلیں طے ہوتی ہیں اور موت کی منزل پر ختم ہو جاتا ہے۔

مجھے بچپن ہی سے سفر کا شوق رہا ہے۔ بچپن میں زندگی کا اوّلیں سفر جو میں نے کیا، وہ کپورتھلہ سے امرتسر تک کا تھا۔ یہ 1947ء کے پُر آشوب سال کے ماہ مئی کا ذکر ہے۔ والد صاحب کو کاروباری سلسلے میں امرتسر جانا تھا۔ امرتسر کے حالات ان دنوں بڑے خراب تھے، مگر امرتسر کے مسلمان بھی بڑی پامردی اور جرأت کے ساتھ غیر مسلموں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں ان دنوں پورے پنجاب میں گشت کر رہی تھیں، چنانچہ جب والد صاحب امرتسر جانے کے لئے تیار ہوئے تو میں بھی بضد ہوا کہ ان کے ساتھ امرتسر جاؤں گا۔ میری عمر غالباً اس وقت دس سال تھی مگر مجھے اس سفر کے تمام واقعات بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ والدہ مرحومہ ان پر آشوب دنوں میں مجھے والد صاحب کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھیں کیونکہ ان کے خیال میں اکیلا مرد تو کسی ناگہانی صورتحال میں اپنا دفاع کر سکتا ہے، مگر بچے ساتھ ہوں تو اس کے لئے اپنی مدافعت بھی مشکل ہو جاتی ہے اور امرتسر شہر میں ان دنوں ہر طرف موت کا رقص جاری تھا۔

بہر حال میری ضد کے سامنے والدہ کو مجھے والد صاحب کے ساتھ جانے کی

اجازت دینی پڑی۔ہم ایک صبح کو کپورتھلہ سے روانہ ہوکر امرتسر پہنچ گئے۔

امرتسر ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہر میں کرفیو نافذ ہے اور ملٹری گشت کر رہی ہے۔ دوسرے شہروں سے آنے والے مسافروں میں سے صرف ان مسافروں کو شہر جانے کی اجازت ہے جنہوں نے خود اپنے یا اپنے عزیز واقارب کے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ان کو بھی ملٹری اپنے ٹرکوں میں لاد کران کے گھروں تک پہنچاتی ہے۔اجنبیوں کو شہر میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔

ہمیں ہال بازار میں ایک ہندو کھتری کے ہاں جانا تھا، مگر ملٹری والے ہمیں کسی صورت میں ادھر جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ سٹیشن پر خطرہ موجود تھا، کیونکہ ریلوے کے سکھ ملازمین ننگی کرپانیں لئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

خوش قسمتی سے ہمیں سٹیشن پر ایک مسلمان اہلکار مل گیا۔اس نے ہمیں اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بٹھایا اور خود ٹیلی فون پر ہمارے شریک کاروبار کھتری کو ہماری آمد سے مطلع کیا (غالباً اس کھتری کا نام کروڑی مل تھا) کھتری نے ہمیں 11 بجے تک سٹیشن پر ہی ٹھہرنے کا مشورہ دیا، کیونکہ 11 بجے سے ایک بجے تک کرفیو میں وقفہ ہوتا تھا، اس نے وعدہ کیا وہ اس وقفے کے دوران خود سٹیشن آکر ہمیں اپنے گھر لے جائے گا۔

چنانچہ ہم ناشتہ وغیرہ کر کے سٹیشن پر ہی ٹھہرے رہے۔ ریلوے کے مسلمان اہلکار ہمیں بار بار کہہ رہے تھے کہ امرتسر کے غیر محفوظ اور مخدوش حالات کے پیش نظر ہمیں امرتسر آنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بہر حال انہوں نے 11 بجے تک ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا، بعد ازاں وہ دہلی سے آنے والی ٹرین کے کچھ مسلمان مسافروں کو بھی اپنے ساتھ اسی کمرے میں لے آئے اور انہیں اپنے عزیز رشتہ دار ظاہر کرتے رہے۔ سوا گیارہ بجے کے قریب کروڑی مل آ گیا اور ہم اس کے ساتھ ایک ٹانگے میں بیٹھ کر اس کے گھر چلے گئے۔ والد صاحب نے جلدی جلدی اس سے اپنا کاروباری حساب کتاب ختم کیا اور ہم ایک بجے سے پہلے ہی واپس سٹیشن پہنچ گئے، کیونکہ ایک بجے پھر کرفیو کا نفاذ ہو جانا تھا اور ہم ہندو کے گھر کی نسبت سٹیشن کو اپنے لئے زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹرین

دہلی کے لئے روانہ ہونے والی تھی، ہم اس میں سوار ہو کر جالندھر اور وہاں سے بذریعہ بس شام تک واپس کپورتھلہ پہنچ گئے۔ والدہ نے ہمارے سلامتی سے واپس آنے پر شکرانہ کے نفل ادا کئے۔

ہجرت:

دوسرا بڑا سفر ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کا سفر تھا۔ یہ سفر اس قدر پر خطر، کٹھن اور دلدوز واقعات سے پر ہے کہ اسے اگر موت سے زندگی کی طرف سفر یا کفرستان سے ایمانستان کی طرف ہجرت کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سفر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ کیونکہ اس سفر کے ہر مسافر کی داستان دوسرے مسافر سے مختلف اور ہر شخص پر گزرنے والے واقعات دوسروں سے جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں اور پاکستان پہنچنے والا ہر مسلمان خون کے کئی دریاؤں اور موت کی کئی وادیوں سے گزر کر پاکستان پہنچا ہے، اس لئے ہر شخص کے تجربات و مشاہدات الگ الگ ہیں اور اس میں داستان گوئی یا مبالغہ آمیزی کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ اس لئے اس سفر کے متعلق لکھا جانے والا ہر سفرنامہ، ہر داستان اور ہر واقعہ آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور تاریخ آزادی کا ایک الگ باب ہے۔ ریاست کپورتھلہ، فیروزپور، نکودر تحصیل، جالندھر، ہوشیارپور اور دسوہہ کے علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی 55.30 فیصد تھی اور باؤنڈری کمیشن نے ان علاقوں کے علاوہ ان سے ملحقہ علاقوں میں مسلم اکثریت کو تسلیم کیا تھا۔ صرف ریاست کپورتھلہ میں آبادی کی شرح مندرجہ ذیل تھی، مسلمان 64.00 فیصد، سکھ 30.00 فیصد، ہندو 6.00 فیصد۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق کپورتھلہ میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ تیرہ ہزار سات سو چون تھی۔

کپورتھلہ کی غیر مسلم ریاست میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ یہ ریاست کی کل آبادی میں 64 فیصد تھے۔ ان کے قتل کے منصوبے بنائے گئے آج اگر آپ کپورتھلہ جائیں تو آپ کو وہاں ایک بھی مسلمان نظر نہیں آئے گا۔

تحریکِ آزادی:

اِس وقت ہندوستان بھر میں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ شہر میں ہر روز ہی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے جلسے ہوتے اور جلوس نکلتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سخت کشیدگی پائی جاتی تھی اور ہندوؤں نے سکھ رہنماؤں کو خالصتان کا لالچ، روپے پیسے کا چکمہ اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر رکھا تھا۔ سکھ ریاستوں کی طرف سے خالصوں میں بے تحاشہ مہلک ہتھیار اور آتشیں اسلحہ خفیہ طور پر تقسیم کیا جا رہا تھا، جس کی وجہ سے سکھ بہت دلیر اور طاقتور ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اکا دکا وارداتیں بھی شروع کر رکھی تھیں۔ سکھ ریاست پٹیالہ اور کپورتھلہ نے اپنے مسلمان فوجیوں اور سپاہیوں سے اسلحہ واپس لے کر اُنہیں نہتا کر دیا تھا۔ امرتسر میں تو مئی کے مہینے سے ہی فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔

جناح کے بچونگڑے، پاکستان کے شتونگڑے:

اِس وقت میری عمر تقریباً بیس سال تھی اور میں جلوخانہ سکول میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی محمد اسماعیل اور میرا ہم نام ماموں زاد کزن محمد ابراہیم (مرحوم) بھی میرے ہم جماعت تھی۔ ہم نے آٹھ دس مسلمان لڑکوں پر مشتمل ایک ''بچہ مسلم لیگ'' بنا رکھی تھی۔ میں اس گروپ کا سرپنچ تھا۔ ہم نے محلے کے ایک مسلمان درزی کی منت سماجت کر کے ہرا جھنڈا بنوالیا تھا، چنانچہ سکول سے چھٹی کے بعد ہم سب لڑکے سکول میں اکٹھے ہو کر پاکستان کے حق میں جلوس نکالتے اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ میں مسلم لیگ کا پرچم تھام کر اس گروپ کی قیادت کیا کرتا تھا، کیونکہ میں ایک اچھا مقررہ بھی تھا اور پاکستان کے حق میں پرجوش تقریریں کیا کرتا تھا۔ سکول کے بعد یہی ''جلوس'' شہر کے بازاروں سے نعرے بازی کرتا گزرا کرتا تھا۔

ہمارے گروپ نے والدین سے ضد کر کے اپنے لئے سبز پرچم کی ہم رنگ سبز

قمیصیں اور سفید نیکریں بھی سلوائی تھیں۔ ان دنوں یونیفارموں کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہمارے مسلمان اساتذہ شلوار قمیص اور اکثر ہندو دھوتیاں پہن کر سکول آیا کرتے تھے۔ ہمارا گروپ اپنے "پاکستانی لباس" کی وجہ سے پورے سکول میں نمایاں اور منفرد نظر آتا تھا۔ جہاں ہمیں سبز و سفید لباس میں دیکھ کر مسلمان اساتذہ خوش ہوتے تھے اور ہماری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ وہیں ہندو اساتذہ اندر ہی اندر کڑھتے اور ہم سے خار کھاتے تھے۔ ہمارا ریاضی کا ایک ہندو ٹیچر کرم چند تو باقاعدہ ہمیں "جناح کے بچونگڑے اور پاکستان کے شتونگڑے" کے القابات سے نوازا کرتا تھا اور ہم اسے اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے تھے۔

ہمارا گھر محلہ عارف والا میں شیخوپورہ چونگی کے قریب واقع تھا۔ ہمارے گھر اور سکول کے درمیان ایک گردوارہ پڑتا تھا۔ سکول سے دو پہر کو گھر آتے وقت ہم گردوارہ کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے نعرہ بازی کیا کرتے تھے۔ وہاں کے گرنتھی برا نہیں مناتے تھے، بلکہ اکثر ہماری تواضع "کڑاہ پرشاد" (حلوے) سے کیا کرتے تھے۔ دیسی گھی، بادام پستہ، گری (ناریل) کشمش اور سوجی سے بنا ہوا یہ "کڑاہ پرشاد" نہایت لذیذ ہوتا تھا اور وہاں نعرے لگانے کا مقصد بھی عموماً گرنتھیوں کو اپنی آمد سے مطلع کرنا ہوتا تھا۔ اس گردوارے میں گرنتھ صاحب (سکھوں کی مذہبی کتاب) کا پاٹھ چوبیس گھنٹے جاری رہتا تھا اور گرنتھیوں کی آواز اتنی سریلی اور میٹھی ہوتی تھی کہ اب تک میرے کانوں میں رس گھولتی ہے۔

شرنارتھی:

امرتسر سے واپسی کے چند روز بعد، شام کے وقت والد صاحب اور میں اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ میں سکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر ہوم ورک کر کے کچھ دیر آرام کے بعد والد صاحب کے زمینداری اور کھیتی باڑی کے کام میں مدد دینے کے لئے اکثر شام کو زمینوں پر چلا جایا کرتا تھا۔ ہماری زمینیں سلطان پور روڈ اور ریلوے لائن کے درمیان سٹیشن سے کچھ فاصلے پر واقع تھیں۔ ہم لوگ اپنی گھریلو ضرورت کے مطابق گندم اور مکئی، جانوروں کے لئے چارہ مثلاً جوار، باجرہ اور برسین کاشت کرنے کے علاوہ

زیادہ تر سبزیاں کاشت کیا کرتے تھے۔ سبزیوں کی کاشت سے ہمیں تھوڑے وقت میں کافی نقد آمدنی ہو جاتی تھی۔ ہماری آلو کی فصل خصوصی طور پر بہت منافع بخش ہوتی تھی۔ والد صاحب شاہی باغات کے مہتمم بھی تھے، لیکن ساتھ ساتھ اپنی زمینوں پر بھی کاشتکاری کرتے تھے۔

جون کی ایک شام میں والد صاحب کے ساتھ اپنی مونگ پھلی کی فصل کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ فیروز پور کی طرف سے ایک ٹرین آئی اور کپورتھلہ ریلوے سٹیشن پر رُکے بغیر جالندھر کی طرف نکل گئی۔ ٹرین کے ڈبے نہ صرف اندر سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ چھتوں پر بھی بے پناہ خلقت سوار تھی۔ یہ میرے لئے بالکل نئی بات تھی، کیونکہ اس طرف سے دن میں جو ایک دو ٹرینیں گزرا کرتی تھیں، ان میں بہت کم سواریاں ہوتی تھیں۔

جب میں نے اس بارے میں والد صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ ہندوؤں اور سکھوں کی ٹرین تھی، جو پاکستان میں آنے والے علاقوں سے نقل مکانی کر کے ہندوستان کی طرف جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہر روز ہی ایسی ٹرینیں ہمارے سامنے سے گزرنے لگیں۔ مسلمان جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ چونکہ کپورتھلہ کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے اور وہ پاکستان میں شامل ہوں گے، تشویش اور فکر مندی میں مبتلا ہونے لگے۔ انہیں اب یقین ہونے لگا کہ انہیں بھی اپنی زمینیں، جائیدادیں، گھر بار، کاروبار، مال مویشی اور آباؤ اجداد کی آخری آرام گاہیں چھوڑ کر پاکستان جانا پڑے گا۔

حضرت قائداعظمؒ سے ملاقات:

آزادی سے چند سال پہلے کی بات ہے (مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں) مجھے اپنے سکول کے ایک مسلمان استاد کی زبانی معلوم ہوا کہ بابا جناحؒ (اس زمانے میں حضرت قائداعظمؒ کو زیادہ تر مسلمان بابا جناحؒ کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے) جالندھر تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے گھر آ کر والد صاحب سے ضد کرنا شروع کر دی کہ میں بابا جناحؒ کو دیکھنے کے لئے جالندھر جانا چاہتا ہوں۔ والدہ مرحومہ نے منت سماجت کر کے والد صاحب کو آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے بابا جناحؒ کی ایک جھلک دکھانے کے لئے جالندھر لے جائیں۔

حضرت قائداعظمؒ کی جالندھر آمد سے ایک روز پہلے ہی والد صاحب اور میں جالندھر پہنچ گئے اور اپنی پھوپھی جو جالندھر کے محلہ عالی میں بیاہی ہوئی تھیں، کے گھر رات گزری اور صبح کو ٹرین کی آمد سے بہت پہلے جالندھر ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے سبز قمیص اور سفید نیکر پہن رکھی تھی اور مسلم لیگ کا جھنڈا اتھام رکھا تھا۔ جیسے جیسے ٹرین کی آمد کا وقت قریب آ رہا تھا، سٹیشن پر مسلمانوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ قائداعظمؒ زندہ باد کے پرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ اتنے میں ٹرین سٹیشن پر آ کر رُکی اتفاق سے جس جگہ والد صاحب مجھے کاندھوں پر اُٹھا کر کھڑے تھے، حضرت قائداعظمؒ کا ڈبہ عین سامنے آ کر رُکا۔ جیسے ہی حضرت قائداعظمؒ ڈبے کے دروازے میں تشریف لائے، استقبالی ہجوم نے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ حضرت قائداعظمؒ نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے ہاتھ بلند کر کے ہجوم کے نعروں کا جواب دیا۔ پھر چند لمحوں بعد ہجوم کو خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ کیا تا کہ وہ کچھ ارشاد فرما سکیں۔ ان کا اشارہ پا کر ہجوم ایک دم خاموش ہو گیا، لیکن میں والد صاحب کے کندھوں پر سوار پرجوش انداز سے نعرہ بازی میں مصروف رہا۔ حضرت کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ مسکراتے ہوئے اشارے سے والد صاحب کو اپنے قریب بلایا۔ ہجوم نے یک بیک والد صاحب کو ریل کے ڈبے کے دروازے تک پہنچنے کے لئے راستہ دے دیا۔ جیسے ہی والد دروازے کے قریب پہنچے، حضرت نے ہاتھ بڑھا کر تبسم فرماتے ہوئے میرا کاندھا تھپتھپایا اور انگریزی میں میرے سبز لباس کی تعریف کی۔ میں خاموش ہو گیا اور حضرت ہجوم سے خطاب فرمانے لگے۔

میں آج بھی اپنے کاندھے پر حضرت قائداعظمؒ کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا ہوں اور اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا، سب سے قیمتی اور سب سے عظیم تر اعزاز سمجھتا ہوں۔

حضرت قائداعظمؒ کی کپورتھلہ میں آمد:

عمائدین مسلم لیگ کی انتہائی خواہش تھی کہ جب قائداعظمؒ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسہ کو رونق بخشنے کے لئے جالندھر شہر میں تشریف فرما ہوں تو مسلمانانِ ریاست کو بھی شرف باریابی سے نوازیں۔ چنانچہ اراکین مسلم لیگ کے ایک وفد نے وزیراعظمؒ عبدالعزیز فلاک پیلا کی وساطت سے مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔

مہاراجہ نے وفد کی مذکورہ خواہش کو درخورِ التفات فرماتے ہوئے کہا کہ ”دنیا کی ایک عظیم سیاسی شخصیت کا ہماری ریاست میں قدم رنجہ فرمانا میرے لئے اور میری رعایا کے لئے انتہائی خوش قسمتی کی بات ہے۔ اگر قائداعظمؒ ریاست کو شرف باریابی بخشیں تو ان کا ڈنر لنچ اور چائے حکومت کی طرف سے ہونا چاہیے“۔ چنانچہ اس باہمی رضامندی کے بعد قائداعظمؒ کی خدمت میں دعوت نامہ کی صورت میں درخواست لکھی گئی، جسے قائداعظم نے بصد خوشی قبول فرمایا، اس طرح جب نومبر 1942ء کو جالندھر کے مذکورہ اجلاس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تو جالندھر کے اجلاس کی صدارت کے علاوہ دیگر مصروفیات سے فارغ ہو کر حسب پروگرام بذریعہ کار براستہ سڑک کپورتھلہ تشریف فرما ہوئے۔

قائداعظمؒ کے راستہ سے گزرنے کی خبر آن واحد میں بستی بابا خیل، موضع منڈ، وڑانہ، بستی برہم خان اور سنگل سول و دیگر قرب و جوار کے دیہاتوں میں پہنچ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے محبوب قائد کو ایک نظر دیکھنے کے لئے سڑک پر دورویہ قطار اندر قطار انتظار میں کھڑے ہونا شروع ہو گئے، ان میں مردوں کے علاوہ ان گنت عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ قائداعظمؒ کا قافلہ جب جالندھر سے روانہ ہوا تو ان کی کار کے آگے اور پیچھے علاوہ عشاق کی کاروں کے چالیس کے قریب سبز وردیوں میں ملبوس دورویہ قطاروں میں موٹر سائیکل سوار رواں دواں تھے۔ القصہ جالندھر شہر سے ریاست کپورتھلہ تک کی یہ گزرگاہ قائداعظمؒ زندہ باد پاکستان، زندہ باد مسلم لیگ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور قائداعظمؒ کی کار اپنے عشاق اور پروانوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قائداعظمؒ اپنے مشاقانِ دید کے نعروں کا جواب اپنے ہاتھ کی جنبش سے دے رہے تھے اور اپنے اس استقبال کا منظر دیکھ کر بہت خوش تھے۔

ادھر کپورتھلہ میں قائداعظمؒ کے استقبال کا منظر دیدنی تھا۔ کپورتھلہ سے دو میل کے فاصلے پر ریلوے پھاٹک تک ہزاروں کی تعداد میں لوگ سڑک کے دونوں اطراف ہاتھوں میں بینر اور جھنڈیاں لہراتے ہوئے قائداعظمؒ زندہ باد پاکستان اور مسلم لیگ زندہ باد کے نعروں کے ساتھ قائداعظمؒ کو خوش آمدید کہنے کے لئے بے قرار دکھائی دے رہے تھے۔

ریاستی بینڈ اپنی سریلی دُھنیں بجا رہا تھا۔ وزیراعظم عبدالعزیز فلک پیا، عدلیہ وانتظامیہ کے افسران اور سینکڑوں عمائدین واکابرین مسلم لیگ قائد پر نچھاور کرنے کے لئے پھولوں بھری جھولیوں کے ساتھ ان کی آمد کے منتظر تھے۔ ہر ایک کی آنکھیں قائداعظمؒ کی راہ پر جمی ہوئی تھیں، جالندھر سے مسلم لیگی کارکنان اور عمائدین معہ ہزاروں شہریوں کے اپنے اپنے وسائل سے پہلے ہی ریاستی استقبالیوں میں شامل ہو چکے تھے۔ الغرض قائداعظمؒ کے استقبال کے لئے ہر شخص بے قرار تھا، منتظر تھا، مضطرب اور بے چین دکھائی دیتا تھا۔ دور سے قائداعظمؒ کا قافلہ دکھائی دیتا ہے۔ یک لخت خاموش جذبات اُبل پڑتے ہیں۔ زندہ باد کے نعروں نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ ریاستی بینڈ باجہ نے اپنی سریلی اور دلنواز دھنوں سے اس دلنشین منظر کو دو آتشہ بنا رکھا تھا۔ جوں جوں قائداعظمؒ کا قافلہ قریب آ رہا تھا، دل پھڑک پھڑک جا رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بھی رواں تھیں جو خلوص و محبت کے دبے ہوئے جذبات کی وارفتگی کا ایک اظہار تھیں۔

جیسے ہی قائداعظمؒ معہ اپنے رفقاء اور ساتھیوں کے ریاست کی حدود میں داخل ہوئے، ہر طرف سے ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور ہو رہی تھیں۔ فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ مسلمانان ریاست کے لئے گویا یہ ہلال عید تھا۔ مہاراجہ کی طرف سے سرکاری مہمان خانہ آپ کے قدوم میمنت لزوم کے لئے دیدہ ودل فرش راہ کئے ہوئے تھا۔ مگر آپ نے وزیراعظم عبدالعزیز فلک پیا کی دعوت قبول کرتے ہوئے ان کی رہائش گاہ میں ٹھہرنے پر ہی اکتفا کیا۔ مہاراجہ نے آپ کو خوش آمدید اور ملاقات کا پیغام بھیجا، آپ نے شکریئے کے ساتھ قبول فرمایا۔ ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔

دوسرے دن شام کے وقت راجہ کے رہائشی محل میں آپ کی راجہ کے ساتھ ملاقات ہوئی، راجہ نے اپنے درباری امراء کے ہمراہ آپ کا خیر مقدم کیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ باہم گفتگو رہی، راجہ موصوف کی دعوت پر رات کا ڈنر آپ نے راجہ اور دیگر مہمانوں کے ہمراہ دکھایا اور پھر ان سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد آپ واپس اپنی رہائش گاہ تشریف لے آئے۔

''ادائیگی نماز''

دوسرے دن جمعہ کے روز آپ نے جامع مسجد میں ریاستی مسلمانوں کے ہمراہ جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس روز مسجد میں نمازیوں کا ہجوم دیدنی تھا۔ ساٹھ ستر ہزار افراد نے قائداعظمؒ کے ہمراہ نماز جمعہ ادا کی، یہ ایک بہت بڑا تاریخی اجتماع تھا۔ اسی روز دیگر مصروفیات کی بنا پر آپ واپس جالندھر تشریف فرما ہوئے اور جالندھر میں اپنی دیگر مصروفیات سے فارغ ہو کر لاہور پہنچ گئے۔ کپورتھلہ میں آپ نے کسی جلسۂ عام میں خطاب نہیں فرمایا، کیونکہ ایسا کوئی پروگرام پہلے سے طے نہیں تھا۔

کپورتھلہ میں قیام کے دوران حضرت قائداعظمؒ کے حفاظتی گارڈ کے فرائض مصنف کے دادا جان صوبیدار پیر محمد شہید) نے جو مقامی مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے انچارج تھے، اپنے ہمراہیوں کے ساتھ انجام دیئے اور ہر لحہ اپنے چاک و چوبند دستے کے ساتھ قائداعظمؒ کے ہمراہ رہے۔ انہوں نے نماز جمعہ شاہی مسجد کپورتھلہ میں قائداعظمؒ کے ہمراہ ہی ادا کی، جبکہ وزیراعظم ریاست، مسلم وزرا، ریاستی مسلم اہلکار اور عمائدین شہر نے بھی قائداعظمؒ کے ہمراہ نماز جمعہ شاہی مسجد کپورتھلہ میں ادا کی۔

سخت حفاظتی انتظامات کی بنا پر کپورتھلہ میں مجھے قائداعظمؒ کے قریب جانے کا موقع نہ مل سکا، لیکن دور سے ان کی جھلک کئی بار دیکھی۔

تقسیم ہند:

ہندوستان کی تقسیم کا کام لارڈ مونٹ بیٹن نے سر سائرل ریڈکلف کے سپرد کیا تھا اور کانگرس اور حضرت قائداعظمؒ محمد علی جناح سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ ریڈکلف کا فیصلہ دونوں ہندو اور مسلمان لیڈروں کو منظور ہوگا۔ فیصلہ کے اعلان کے بعد نہ کانگرس اور نہ مسلم لیگ کسی کو بھی اس فیصلہ میں کسی قسم کی ترمیم یا اعتراض کا حق نہ ہوگا۔ جہاں تک حضرت قائداعظمؒ کا تعلق تھا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ گو انگریز کو ابتدائے حکومت سے ہندوستان چھوڑنے تک جب بھی موقع ملا ہے اس نے مسلمانوں سے کبھی انصاف نہیں کیا

اوران کے جائز حقوق سے اغماز برتنے کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، لیکن من حیث القوم حضرت قائداعظمؒ انگریز کو بددیانت نہیں سمجھتے تھے اور غالباً اسی لئے انہوں نے لارڈ مونٹ بیٹن کی یہ شرط مان لی تھی کہ وہ ریڈ کلف کے فیصلہ کو قطعی تسلیم کریں گے اور اس میں کسی قسم کے ردوبدل کا کوئی مطالبہ نہیں کریں گے۔ لیکن مونٹ بیٹن نے جس بے باکی اور دیدہ دلیری سے حضرت قائداعظمؒ کے اعتماد کو ٹھوکر لگائی اور کانگرس کو خوش کرنے کے لئے مسلمانوں سے جو مجرمانہ بے انصافی اور بددیانتی کر کے ساری انگریز قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا، وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔

تاریخ اقوام میں یہ واقعہ ہمیشہ انتہائی شرمناک کام سمجھا جائے گا، یہ کیسے ہوا کیونکر ہوا، اس شرمناک داستان کا پردہ سب سے پہلے ملک کے نامور قانون دان خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لاء نے چاک کیا، لارڈ مونٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کے لئے سر ریڈ کلف کی سرکردگی میں ایک کمیشن جو "ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن" کے نام سے مشہور ہے۔ مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن میں دو نمائندے کانگرس کی طرف سے[1] اور دو مسلم کی طرف سے تھے۔ خواجہ عبدالرحیم ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن کے سیکرٹری تھے، یہ داستان خواجہ عبدالرحیم صاحب کی زبانی سنیے۔

> "3 جون 1947ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے ایک اعلان میں اس بات پر خاص زور دیا تھا کہ کسی بڑے رقبے کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کسی ایک ایسی حکومت کے تحت رہے، جس میں دوسرے فرقہ کے لوگوں کی اکثریت ہو۔ کیونکہ اقلیت کے دل سے اکثریت کا خوف دور کرنے کے لئے ہی ملک تقسیم کیا جا رہا ہے۔ باؤنڈری کمیشن جو سرحدیں متعین کرے گا وہ کسی صورت میں بھی خیالی خطوط پر نہیں کھینچی جائیں گی۔ اس اعلان میں انہوں نے سکھوں کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ سکھ پنجاب میں اپنے لئے ایک علیحدہ صوبے کا مطالبہ کر رہے تھے، وائسرائے نے کہا۔

---

[1] کانگرس کے نمائندے سردار تیجا سنگھ اور مسٹر مہر چند مہاجن تھے دونوں قانون پیشہ تھے اور مسٹر جسٹس محمد منیر جسٹس دین محمد مسلم لیگ کے نمائندے تھے۔

"سکھوں نے چونکہ ہندوؤں کے اکسانے پر پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا ہے، حکومت ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی"۔

لارڈ مونٹ بیٹن کی مرضی کے مطابق پارٹیشن کونسل کے سربراہ سر ریڈ کلف کو سرحدی کمیشن کا جائنٹ چیئرمین مقرر کیا گیا اور اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ فریقین کے تمام مطالبات پر پورے پورے انصاف سے کام لیا جائے گا، سرحدی کمیشن کے فیصلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرحد قائم کرنے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ فریقین کے مطالبات میں کوئی غیر واجب قطع برید نہ کی جائے۔

30 جون کو بنگال اور پنجاب کے لئے باؤنڈری کمیشن کا اعلان کر دیا گیا۔ سرکاری اعلان کے مطابق دونوں کا دائرہ عمل یکساں تھا۔ باؤنڈری کمیشن کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور تقسیم میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ تقسیم کے وقت کمیشن کو دوسری ضروری باتوں کو بھی زیر غور رکھنا ہوگا"۔

......☆......

مسلم لیگ کا مطالبہ

خواجہ عبدالرحیم صاحب لکھتے ہیں۔

''جہاں تک پنجاب کی تقسیم کا تعلق تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا۔

1- راولپنڈی ڈویژن میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 81/1/2 فیصدی ہے۔
2- ملتان میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 75 فیصدی ہے۔
3- لاہور ڈویژن میں مسلمانوں کی آبادی 58/1/2 فیصدی ہے، اس لئے یہ مسلم لیگ کو دیئے جائیں۔
4- ان علاقوں کے اضلاع کی وہ سب تحصیلیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

مثال کے طور پر:

1- ضلع فیروز پور...... فیروز پور تحصیل سالم۔
2- تحصیل زیرہ سالم۔
3- تحصیل نکودر سالم۔
4- ضلع جالندھر میں، جالندھر تحصیل سالم۔
5- ضلع ہوشیار میں، ہوشیار پور تحصیل سالم۔
6- تحصیل دسوہہ سالم۔

مندرجہ بالا تمام تحصیلوں میں مسلمانوں کی آبادی 30 و 55 ہے۔ یہ سب علاقے پاکستان میں شامل کئے جائیں۔ باؤنڈری کمیشن کے غیر مسلم ارکان نے بھی ہر تحصیل کی تقسیم کو ''اکائی'' تسلیم کر لیا تھا۔ کیونکہ ان سب علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت

تھی، اس کے علاوہ ان علاقوں کے چاروں جانب جو علاقے تھے، ان سب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ تحصیل قصور، تحصیل اجنالہ اور ریاست کپورتھلہ کی مجموعی آبادیوں میں آبادی کا تناسب یہ تھا۔

مسلمان 64.51 فی صد

سکھ 30.56 فی صد

ہندو 4.93 فی صد

ریاست کپورتھلہ کی تینوں تحصیلیں، جالندھر، نکودر، تحصیل فیروز پور اور زیرہ تحصیل سے ملحق تھیں اور ان سب تحصیلوں میں مسلمانوں کی اکثریت باؤنڈری کمیشن نے تسلیم کرلی تھی۔ لیکن ریڈکلف نے انصاف کے تمام تقاضوں کو چھپر پر رکھ کر مسلمانوں کی اکثریت کے سارے کے سارے علاقے مشرقی پنجاب (کانگرس) میں شامل کردیئے، لیکن ریڈکلف کی بے انصافی چیرہ دستی اور ہندو نوازی کی داستان کچھ آگے بھی چلتی ہے، ریڈکلف نے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں ملحقہ علاقے بٹالہ، گورداسپور، اجنالہ، فیروز پور، زیرہ اور نکودر اور جالندھر کی تمام تحصیلیں اور قصور کی تحصیل کا بہت سا علاقہ کانگرس کو دے دیا۔ ریڈکلف نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ مغربی پاکستان (مسلم لیگ) کو فاضلکا، مکتسر، دوسوہا اور ضلع ہوشیار کے ان تمام ملحقہ علاقوں میں جو دفاعی نقطہ نظر سے پاکستان کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے اور ان سب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی محروم کردیا اور یہ سب علاقے کانگرس کے حوالے کردیئے۔ تقسیم کے مسلمہ اصولوں کے مطابق تحصیل پٹھانکوٹ کا کچھ علاقہ بھی مغربی پاکستان میں شامل ہونا چاہئے تھا، لیکن ہندو، سکھوں اور انگریزوں نے مل کر محض بھونڈے دلائل کے مدنظر مسلمانوں کے حقوق بالکل نظر انداز کردیئے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ریڈکلف (لارڈ مونٹ بیٹن کے ایما سے) چھ لاکھ سکھوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر چودہ لاکھ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کردیا اور بے انصافی کی حد تک یہ ہے کہ امرتسر اور ترن تارن کی تحصیلوں میں مسلمانون کی اکثریت کو بالکل نظر انداز کرکے کانگرس کے حوالے کردیا۔ دوسرے الفاظ میں ان بے

انصافیوں کا مطلب صرف یہ تھا کہ اس غیر منصفانہ تقسیم کے بہانے ہندوستان سے پاکستان جانے والے مہاجرین کے قتل عام کی کھلی چھٹی سکھوں اور ہندوؤں کو دیدی جائے"۔

خواجہ عبدالرحیم لکھتے ہیں:

"یہاں اس بحث کا ذکر کرنا شاید بے محل نہ ہوگا، جو شملہ میں ریڈکلف اور میرے درمیان ہوئی تھی، اس ملاقات کے لئے میں اپنے ساتھ بہت سے ضروری نقشہ جات بھی لے گیا تھا۔ جسٹس دین محمد بھی میرے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ میں نے اپنی گفتگو کا آغاز ضلع فیروزا اور فاضلکا سے ملحقہ علاقوں کے متعلق کیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے نقشوں کی مدد سے ان دونوں مقامات کے نقشے اور پوری تفصیلات بیان کیں، جس کے جواب میں سر ریڈکلف نے بڑے وثوق سے مجھے کہا۔

"مسٹر رحیم! آپ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں، یہ سب علاقے تو آپ کی جیب میں ہیں۔ (پاکستان میں شامل ہیں) آپ مجھ سے ان علاقوں کے متعلق بات چیت کریں۔ جس کا مسلم لیگ نے مطالبہ کیا ہے"۔ اس بحث کے دوران میں جسٹس دین محمد بھی موجود تھے۔ چونکہ ریڈکلف نے فیروز پور کے علاقوں کے متعلق ہماری تسلی کرادی تھی۔ میں نے ان کے متعلق کچھ مزید کہنا ضروری نہ سمجھا اور ضلع لدھیانہ کے "بیٹ" کے رقبہ کے متعلق جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی بحث شروع کی۔ اس بحث کے دوران میں میں نے "بست دوآب" کے علاقوں کا حوالہ دیا اور امرتسر اور گورداسپور علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سے قبل باؤنڈری کمیشن کے مسلم اراکین نے اعداد و شمار کے ذریعہ کمیشن پر یہ ثابت کردیا تھا کہ گورداسپور، امرتسر اور لاہور نہ صرف آبادی کے لحاظ سے بلکہ ان اضلاع کی ملحقہ آبادیوں میں بھی بین طور پر مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہمیں یقین تھا کہ آبادی کے نقطہ نظر سے یہ سب ملحقہ علاقے مغربی پاکستان کے حصے میں آئیں گے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس، ریڈکلف نے جو فیصلہ دیا تھا اس کے نوواں اور گیارہواں جملہ (پیرا) میں گو ان تینوں اضلاع کا ذکر وضاحت سے موجود ہے، لیکن ریڈکلف نے اپنے ایوارڈ میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو بھی دوسری دلیلوں پر قربان کردیا تھا۔ ان حقائق میں جو ریڈکلف کے مدنظر تھے

لاہور اور امرتسر کا محل وقوع اور اپر باری دوآب نہر کی آب پاشی پر بہت زور دیا گیا تھا۔ اگر آپ ان تینوں اضلاع کو اکٹھا لیں۔ یا ان میں سے تحصیل شکر گڑھ کو خارج کر دیں یا اپر باری دوآب نہر سے آبپاشی کے نظام پر نظر ڈالیں آپ چاہیں کوئی پیمانہ یا معیار قائم کریں ان علاقوں کی مسلم اکثریت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ ان کی اہمیت کم ہوسکتی ہے۔ مسلم اکثریت ہر حال میں مسلم اکثریت ہی رہتی ہے، باؤنڈری کمیشن نے بھی اکثریت کے اصولوں کو مختلف کھوٹیوں پر رکھ کر دیکھا تھا اور یہ تسلیم کرلیا تھا کہ اپر باری دوآب نہر سے سیراب ہونے والا یہ سارا علاقہ مغربی پاکستان میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ریڈکلف نے علاقائی اکثریت کے اصولوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ریڈکلف نے فیروز پور کے متعلق جو فیصلہ دیا تھا۔ وہ اس کے اپنے اصولوں کے خلاف جاتا ہے۔ یہاں اس نے ''مسلم اکثریت سے ملحق'' اصول سے بالکل انحراف کیا تھا۔ حالانکہ یہ اصول باؤنڈری کمیشن کی ابتدائی کارروائیوں میں متفقہ فیصلہ سے قائم کیا گیا تھا۔ ریڈکلف نے ہندوؤں کے مفاد کے مدنظر پوری بے اصولی برت کر صرف نہری نظام کی ترکیب پر اس تمام علاقے کو مشرقی پنجاب میں شامل کر دیا تھا۔

(1) لارڈ مونٹ بیٹن لارڈ از مے، پنجاب کا گورنر سر ایون جنکنز وائسرائے کا پرائیویٹ سیکرٹری سر جارج ایبل، ریڈکلف کا پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر ایچ سی بومانٹ ان دونوں سیکرٹریوں نے لاہور ڈویژن کے بندوبست میں کام کیا تھا اور کچھ اور انڈین سول سروس کے انگریز عہدہ دار کھلم کھلا سکھوں کے طرف دار تھے، یہ وہی ''بے چارے سکھ'' تھے جنہوں نے جنگ آزادی 1857ء میں (جسے انگریز ''بغاوت'' کہتے ہیں) برطانوی راج کی حمایت میں اپنی جانوں کی بازی لگا کر اور اپنے ہم وطنوں سے شرم ناک غداری کی تھی، آج وہی سکھ اس غداری کا انگریزوں سے صلہ یا انعام مانگ رہے تھے اور ساتھ کے ساتھ طاقت استعمال کرنے، یعنی خون خرابہ کرنے کی بھی دھمکیاں دے رہے تھے۔ پنجاب کے گورنر ایون جنکنز کو مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر تھا، وہ اپنی رپورٹوں میں وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ پنجاب کو تقسیم کرتے وقت اگر سکھوں

کے مطالبات پورے نہ کئے گئے تو پنجاب میں جنگ کی آگ کے شعلے بھڑک اُٹھیں گے، ان لوگوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ وی۔ پی مینن نے جوایک طرف سردار پٹیل کا خاص معتمد اور صلاح کار تھا اور دوسری جانب لارڈ مونٹ بیٹن بھی اسے قابل اعتماد سمجھتا تھا، سکھوں کو خوش کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب میں سکھوں کے سب سے مقدس مقام ننکانہ کو ''ایک قسم کا ویٹیکن'' بنادیا جائے، اسی طرح لاہور کی تحصیل قصور کی تقسیم اس کے گاؤں گاؤں کے مطابق کی سکیم سر جارج ایبل نے جو 1935ء سے 1939ء تک ضلع لاہور کے ''افسر بندوبست'' نے تیار کی تھی۔ سر جارج ایبل سے زیادہ سکھوں کی حمایت کسی نے کم کی ہوگی۔

(2) یہ شملہ کا ذکر ہے ایک روز مسٹر بومانٹ نے کمیشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے (خواجہ عبدالرحیم) پوچھا کہ کیا میں انہیں کمیشن کے دفتر میں جو نقشے اور ریکارڈ موجود ہیں، دکھا سکتا ہوں۔ میں نے وہ سب نقشے پیش کردیئے۔ مسٹر بومانٹ جس انہماک اور غور سے نقشوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ ''ہڈیارہ نالہ'' کی جائے وقوع تلاش کر رہا ہے۔ اس سے ہمارے قیاس اور شبہات اور بھی پختہ ہوگئے۔ سر ریڈکلف نالہ ہڈیارہ کے ساتھ ساتھ مغربی پنجاب کی سرحدیں متعین کرنے کا منصوبہ باندھ رہا ہے۔

(3) سر جنکنز کے بعد سر فرانسیس موڈی پنجاب کا گورنر ہو کر جب آیا تو اسے سر جنکنز کے کاغذات میں وہ نقشہ بھی مل گیا۔ جس کی بنیاد پر ریڈکلف نے اپنا تاریخی فیصلہ مرتب کیا تھا، اس نقشے کے مطابق فیروز پور اور زیرہ کی دونوں تحصیلیں مغربی پنجاب کے حصے میں آئی تھیں، مسٹر ہاؤس نے اپنی مشہور کتاب ''گریٹ ڈیوائڈ'' (Great Divide) میں لارڈ مونٹ بیٹن کے کاغذات کا بھی جائزہ لیا ہے اور اپنی کتاب کے صفحہ 362 پر اس خط کا حوالہ دیا ہے، جو مونٹ بیٹن کے پرائیویٹ سیکرٹری سر جارج ایبل نے پنجاب کے گورنر سر جنکنز کے سیکرٹری مسٹر ایبٹ کو لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا۔ جس میں ریڈکلف کے مجوزہ سرحدی خطوط سرسری طور پر دکھائے گئے تھے، اس خط اور نقشہ کے مطابق

زیرہ اور فیروز پور دونوں تحصیلیں مغربی پنجاب میں شامل تھیں اور ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ضلع لاہور کی ذیل اور بستی کی سرحدوں کو قطعی طور پر متعین کرنے کے سوا بقیہ سرحدی خطوط طے پا چکے ہیں، دو دن پہلے شملہ میں میرے اور ریڈکلف کے درمیان جو بحث ہوئی تھی اور اس میں فیروز پور اور زیرہ کے متعلق جو فیصلہ ہوا تھا یہ نقشہ اس کے عین مطابق تھا"۔

خواجہ عبدالرحیم صاحب لکھتے ہیں کہ وہ "مسٹر جسٹس دین محمد صاحب کے حکم سے فوراً کراچی پہنچے اور حضرت قائداعظمؒ کو ان سب حالات سے آگاہ کر دیا جس کا انہیں شدید صدمہ ہوا۔ وہ شاید خود دہلی جا کر لارڈ مونٹ بیٹن سے ملتے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب مشرقی پنجاب میں سکھوں نے آگ اور خون کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ ریلوں میں سفر کرنے والے مسلمانوں کو ٹرین روک کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا، لیکن دُنیا جانتی ہے کہ حضرت قائداعظمؒ ایک بااصول آدمی تھے اور لارڈ مونٹ بیٹن سے وعدہ کر چکے تھے کہ ریڈکلف کا فیصلہ انہیں منظور ہوگا۔ اس لئے گو انہوں نے یہ نہایت خطرناک اور غیر منصفانہ فیصلہ تو منظور کر لیا، لیکن پھر بھی ریڈکلف ایوارڈ کے متعلق یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

> "ہندوستان کی تقسیم اب حتمی طور پر ختم ہو چکی ہے، ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ حصولِ آزادی میں ہماری عظیم مسلم ریاست کے ساتھ سخت بے انصافی کی گئی ہے۔ پہلے تو ہمیں ممکن سے ممکن حد تک بہت کم علاقہ دیا گیا ہے، اس کے بعد باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ ہم پر آخری ضرب ثابت ہوا ہے۔ یہ فیصلہ نامنصفانہ اور نافہم ہے، چونکہ ہم سے اسے تسلیم کرنے کا پہلے وعدہ لیا جا چکا تھا۔ اس لئے یہ آج ہم پر ٹھونسا جا رہا ہے۔ یہ فیصلہ قانونی نہیں صرف سیاسی فیصلہ کہلا سکتا ہے"۔

خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ "اس نامنصفانہ ایوارڈ پر یورپ کے بڑے بڑے اہل الرائے حضرات کی طرف سے بڑی کڑی نکتہ چینی ہوئی، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا"۔

ریڈکلف ایوارڈ

مسلمانوں کی اکثریت کے بہت سے علاقے ریڈکلف نے ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیئے۔ حالانکہ جب باؤنڈری کمیشن کا اعلان ہوا تھا تو ان علاقوں کے مسلمانوں نے اپنے گھروں پر چراغاں کیا تھا اور پاکستانی پرچم لہرا دیئے تھے، مگر ریڈکلف نے مونٹ بیٹن اور نہرو سے مل کر مسلمانوں کے گلے پر چھری پھیر دی اور انہیں مفسد ہندوؤں اور وحشی سکھوں کی کرپانوں کے سامنے ڈال دیا۔ اس کے علاوہ دفاعی نقطہ نظر سے تمام اہم علاقے بھی ہندوستان کو بخش دیئے، تحصیل پٹھان کوٹ اور بٹالہ محض ہندوستان کو کشمیر کا راستہ دینے کی خاطر اس کے حوالے کر کے کشمیری مسلمانوں کی شہ رگ کاٹ دی۔

15,14 اگست 1947ء ماہ رمضان المبارک کی 27 ویں تاریخ اور جمعۃ الوداع کے روز حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا اور اس کے ساتھ ہی پنجاب میں سکھوں نے ہندوؤں کی شہہ پر وحشت و بربریت اور درندگی کا بازار گرم کر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ آزادی کے چند روز بعد آنے والی عید الفطر پر مشرقی پنجاب کی عیدگاہوں اور گلی کوچوں میں مسلمانوں کا اس قدر خون بہایا گیا کہ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی شرما گئی ہوں گی۔

......☆......

ماؤنٹ بیٹن نے بھارت کے حق میں سرحدیں تبدیل کروائی تھیں، ریڈکلف کے سیکرٹری کے انکشافات

1947ء میں برصغیر کی تقسیم سے متعلق باؤنڈری کمیشن کے سربراہ اور سینئر برطانوی جج سر سائرل ریڈکلف کے پرائیویٹ سیکرٹری کرسٹوفر بیوماؤنٹ نے اپنی یادداشتوں میں انکشاف کیا ہے کہ برطانوی راج نے اپنے آخری دنوں میں جو کردار ادا کیا ہے وہ قابل فخر ہرگز نہیں ہے۔ کرسٹوفر کے صاحبزادے رابرٹ بیوماؤنٹ نے اپنے والد کی وفات کے بعد پہلی بار ان کی تحریریں برطانوی ذرائع ابلاغ کے سامنے پیش کی ہیں، جن میں تقسیم ہند سے متعلق سنسنی خیز انکشافات موجود ہیں۔ متوفی برطانوی سول سرونٹ کے خاندان کی تحویل میں موجود بوسیدہ کاغذات میں سے ایک پر کرسٹوفر نے اپنی یادداشت اس طرح رقم کی ہے "وائس رائے ماؤنٹ بیٹن کو لازماً یہ الزام اپنے سر لینا چاہئے کہ تقسیم کے وقت پنجاب میں جو قتل وغارت گری ہوئی اور جس میں 5 لاکھ سے زائد مرد، عورتیں اور بچے قتل کردیئے گئے، اس کے ذمہ دار بڑی حد تک وہ خود تھے۔ اگرچہ پوری ذمہ داری صرف ان پر عائد نہیں کی جاسکتی"۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقتدار کی منتقلی میں بہت جلد بازی کی گئی اور تقسیم کے معاملے میں ماؤنٹ بیٹن نے صرف قوانین ہی کو اپنی خواہشات کے تابع نہیں کیا بلکہ انہوں نے سرحدوں کے تعین میں اس بات کا حد سے زیادہ خیال رکھا کہ اس سے بھارت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ ان دستاویزات میں متعدد بار یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے

ریڈکلف پر دباؤ ڈال کر بھارت کے حق میں سرحدیں تبدیل کروائیں۔ بیوماؤنٹ نے بالخصوص ایک واقعے کا ذکر کیا جس میں ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کے درمیان ظہرانے پر ہونے والی ملاقات میں انہیں جان بوجھ کر شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ اس ملاقات میں برطانوی راج کے ان دونوں نمائندوں نے مسلمانوں کے ایک اکثریتی علاقے کو جسے طے شدہ اصول کے مطابق پاکستان میں شامل ہونا چاہئے تھا، بھارت میں شامل کرنے کی منظوری دی گئی۔ بیوماؤنٹ نے لکھا ہے کہ اس صریح دھاندلی کے بعد یہ دونوں افراد بہت زیادہ بدنام ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ''پنجاب کی تقسیم بہت بڑا سانحہ تھی۔ اس خطے کا جغرافیہ نہریں، ریلوے اور سڑکیں سب تقسیم کے خلاف گواہی دے رہی تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسلمان، ہندو اور سکھ سب مل جل کر یکجہتی کے ساتھ وہاں رہ رہے تھے اور پنجاب کو تقسیم کرنے کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ لوگوں کی بڑی آبادی کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا جاتا، لہٰذا خانہ جنگی کے نتیجے میں ہزاروں، لاکھوں افراد مارے گئے یا گھر سے بے گھر کئے گئے۔ 1947ء کے آخر تک صورت حال یہ تھی کہ مغربی پنجاب میں جو کہ اب پاکستان کا حصہ ہے، عملاً ایک بھی ہندو یا سکھ موجود نہیں تھا، اسی طرح بھارتی مشرقی پنجاب مسلمانوں سے یکسر خالی ہو چکا تھا۔ اس سانحے کے لئے بہرحال برطانوی حکومت اور ماؤنٹ بیٹن کو بڑی حد تک ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔ بیوماؤنٹ نے اپنی تحریروں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو غیر ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ احتجاج کے باوجود انہوں نے صرف چھ ہفتے کی ڈیڈ لائن کے اندر سرحدوں کے تعین پر اصرار کیا تھا۔ کشمیر کے بارے میں کرسٹوفر بیوماؤنٹ نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اگر اس متنازعہ علاقے کو ایک الگ ملک بنا دیا جاتا تو یہ زیادہ دانش مندانہ فیصلہ ہوتا۔ بیوماؤنٹ 2002ء میں انتقال کر گئے، لیکن اُن کے صاحبزادے اپنے والد کو بہت احترام کے ساتھ یاد کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں ''میرے والد میں انتہائی اعلیٰ درجے کی ایمان داری موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند سے متعلق بہت سے معاملات پر انہوں نے سرکاری برطانوی مؤقف سے ہٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے ملک کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی ہے''۔

پاکستان کی پہلی خونی عید

خواجہ افتخار مرحوم نے پاکستان کی پہلی خونی عید کی آنکھوں دیکھی تصویر اپنی کتاب ''جب امرتسر جل رہا تھا، میں اس طرح کھینچی ہے۔

''مجھے امرتسر کی وہ آخری اور پاکستان کی پہلی خونی عید الفطر کبھی نہیں بھولی جو قیامِ پاکستان کے تین روز بعد یعنی 18 اگست 1947ء کے روز اسلامیانِ پنجاب کو دیکھنا نصیب ہوئی۔ آج میری آنکھوں کے سامنے وہ خونیں عہد گھوم رہا ہے جب مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو کلمہ گوئی اور مطالبہ پاکستان کے جرم کی پاداش میں سنگینوں پر اچھالا جا رہا تھا اور وہ پیدل قافلوں اور سپیشل ٹرینوں کی صورت میں پاک سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان لرزہ خیز واقعات کا تصور کرکے ہی میری پلکوں پر عقیدت و احترام کے آنسوؤں کے جھلملاتے ستارے تحریک آزادی کے نامور اور گمنام شہیدوں، غازیوں اور اغوا شدہ مسلم بہنوں، بیٹیوں، ماؤں اور معصوم بچوں کی قربانیوں کی یاد میں لہرا رہے ہیں اور مجھے بازاروں اور گلیوں میں زندگی کی ہماہمی اور گہما گہمی کے علاوہ چوڑیاں بیچنے اور خریدنے والوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو بااختیار تقسیم کے موقع پر اغوا ہونے والی 90 ہزار مسلمان خواتین کی عصمتوں کے لٹنے کا دلخراش منظر اور ان کے مادرزاد برہنہ جلوس نکالنے والے خونخوار بھیڑیوں کے مکروہ چہرے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور ان مظلوم و مجبور بہنوں اور ماؤں کے ہاتھوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے میرے احساس میں نیزے کی زک کی طرح چبھ رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اگست 1947ء کی عید بھی اپنی نوعیت کی کتنی عجیب و غریب عید تھی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد اس پہلی عید کے موقع پر نہ تو بچوں نے گوٹے کنارے والے کپڑے پہننے کا تقاضا کیا، نہ نئے جوتے خریدنے کی فرمائش کی، نہ لڑکیوں نے روایتی انداز میں مہندی لگائی، نہ عید کارڈوں اور تحفوں کا تبادلہ ہوا، نہ کسی کو میٹھی سویاں پکانے کا دھیان آیا اور نہ ہی کسی نے عیدی مانگی، کیونکہ ان کی مسرت بھری زندگی میں تو زہر گھول دیا گیا تھا۔ معصوم بچوں کو برچھوں کی نوک پر اچھالا جا رہا تھا۔

10 اگست 1947ء کے روز امرتسر کے مسلمان پولیس ملازمین سے اسلحہ واپس لے لیا گیا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق گورکھا فوج اور ریاستی فوج نے مقامی مہاسبھائی غنڈوں کے ساتھ مل کر امرتسر کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انتظامیہ کی عیارانہ اور مکارانہ حرکت سے اسلامیان امرتسر کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے بدلے ہوئے حالات میں پاکستان کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ، انجمن اسلامیہ امرتسر اور دیگر رفاہی اداروں کی طرف سے قائم کئے ہوئے ریلیف کیمپوں میں لوگ منتقل ہونے لگے۔ ان مقامات تک پہنچنے کے لئے انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور کئی خاندان تو اپنے عزیز و اقارب کی لاشوں کو نہ صرف بے گور و کفن چھوڑ کر بلکہ ان پر چل کر برائے نام عافیت کے گوشوں تک پہنچے۔ رام باغ پولیس سٹیشن کے سامنے والی گلی کوچہ پانڈیا کے آغا علی خان اس محلے کے ایک ویران اور تاریک مکان میں چھپے رہے اور عین عید کے روز بھنگیوں کا لباس پہن کر صبح سویرے ہاتھ میں جھاڑو اور سر پر گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر شریف پورہ کیمپ تک پہنچے جہاں سے مہاجرین کو پاکستان لے جانے کے لئے حکومت پاکستان کے زیر انتظام سپیشل ٹرینیں چل رہی تھیں۔ آغا علی خان امرتسر کے کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور تحریک پاکستان کے پرجوش کارکن تھے۔

امرتسر کی ان عیدگاہوں میں وحشت برس رہی تھی، جن میں عید کے موقع پر میلے ٹھیلے کا سماں رہتا تھا۔ لوگ جوق در جوق اپنے معصوم بچوں کو گود میں اٹھائے انگلیاں تھامے نماز عید پڑھنے جایا کرتے تھے اور نماز عید کے بعد بچھڑی ہوئی سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے، جس سے دلوں کی کدورت ڈھل جاتی تھی، لیکن یہ کیسی عید تھی جس میں عید کی نماز تو درکنار نماز جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ امرتسر کے وہ گلی کوچے جن میں عید کی نماز کے بعد معصوم بچے رنگ برنگے غباروں سے کھیلتے تھے۔ اسلامیان امرتسر کے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امرتسر کا سکتری باغ اداس اور ویران تھا، کیونکہ عید کی آمد سے چند روز قبل اس باغ میں ٹرو کے میلے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں، لوگ دور دراز سے آ کر اس باغ میں دکانیں سجاتے تھے۔ بچوں کے لئے جھولے لگتے تھے۔ کھیل تماشے

ہوتے تھے اور ٹرو کے روز امرتسر کے تمام مسلمان اپنے بال بچوں کو لے کر سکتری باغ پہنچ جاتے تھے۔ کہیں گنجے مندریاں والے کا مجمع اور موت کا کنواں لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ہوتا تھا تو کہیں نٹوں کے تماشے اور کھلونوں کی دکانوں پر بچوں کے ٹھٹھ لگے ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے اس پرمسرت تہوار کے موقع پر امرتسر کے کمپنی باغ کی پردہ کلب اور ٹھنڈی کھوئی پر بھی خوب رونق ہوتی تھی، مگر آج سکتری باغ کی طرح کمپنی باغ کا سہاگ بھی لٹ چکا تھا۔ ٹھنڈی کھوئی کی خوبصورت مسجد خواجہ صاحب شہید ہو چکی تھی اور پردہ کلب بھی ویران تھی اور اس کے آس پاس شاہراہوں پر مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، کوئی ان کو نہلانے، کفنانے، دفنانے اور اُٹھانے والا نہیں تھا۔ کوچہ رنگریزوں کی جن غیرت مند مسلم دوشیزاؤں نے حملہ آوروں سے اپنی عزت بچانے کے لئے مسجد کے کنویں میں چھلانگیں لگائی تھیں، ان کی نعشیں کنویں کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ اِسلامیان امرتسر اپنی ماؤں، بہنوں اور بہو، بیٹیوں کو ہندو سکھ غنڈوں کی ہولناک نظروں سے بچاتے پاکستان کا رُخ کر رہے تھے۔ عید کے روز جن لڑکیوں کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی کی سرخیاں رچی ہوتی تھیں، آج وہی ہاتھ پاؤں ان کے عزیز و اقارب کے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امرتسر اور لاہور کی درمیانی جرنیلی سڑک پر سکھ وحشیوں کے مشتعل ہجوم مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن کے تمام پلیٹ فارم اور پٹڑیاں مسلمانوں کے خون میں نہائی ہوئی تھیں۔ یہ عید کہاں تھی، یہ تو ہولی کا تہوار تھا جس میں خون مسلم سے دل کھول کر ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ان تمام واقعات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر عید کے روز امرتسر کے مسلمانوں کی یہ حالت تھی تو بھارتی پنجاب کے دوسرے شہروں، قصبات اور دیہات میں نہتے اور بے بس مسلمانوں نے عید کس طرح گزاری ہوگی؟''

بزرگ صحافی وقار انبالوی جالندھر کے مسلمانوں پر عید کے روز ڈھائے جانے والے مظالم کا حال بیان اس طرح کرتے ہیں کہ ''18 اگست 1947ء کے روز عید الفطر تھی۔ اس روز خوف و خطر کی فضاؤں میں جالندھر کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں عید کی نماز ادا

کرنے کے لئے عیدگاہ میں جمع تھے اور ابھی پہلی رکعت میں سجدہ ریز ہوئے ہی تھے کہ ہندوؤں، سکھوں نے تلواروں، گنڈاسوں، برچھیوں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر ان پر حملہ کر دیا اور آن واحد میں سینکڑوں مسلمانوں کے سرتن سے جدا کر دیئے گئے، جو اس وحشیانہ حملے سے جان بچا کر عیدگاہ سے باہر بھاگے انہیں بھالوں کی نوک پر دھر لیا۔ اس کے بعد فرقہ پرست ہندو سکھ طے شدہ پروگرام کے مطابق جالندھر کے آسودہ حال اور ذی اثر مسلمانوں کے گھروں سے زبردستی پردہ نشین عورتوں کو گھیر کر عیدگاہ تک لائے، یہاں ان کے برقعے اور ان کی چادریں ہی نہ اُتاریں، بلکہ ان کے لباس اُتار کر انہیں ننگا کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مردوں کو عید کی مبارک باد دیں اور قیامِ پاکستان کی خوشی میں ان کی لاشوں کے آس پاس رقص کریں۔ یہ وحشیانہ سلوک اور منگولانہ کارروائی ایسی تھی کہ جس کی انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی لاشوں پر ان کو رونے بھی نہ دیا گیا۔ عید کے موقع پر ہندوستان سے لاہور آنے والی ایک مال گاڑی کے ڈبے میں مسلمان کے کٹے ہوئے ہاتھ عید کے تحفے کے طور پر اسلامیان پاکستان کو ارسال کئے، جب وہ ڈبہ لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو اس پر ''پاکستانی مسلمانوں کے لئے عید کا تحفہ'' کے اشتعال انگیز الفاظ لکھے تھے۔

(بشکریہ ''نوائے وقت)

......☆......

عید پر جالندھر میں قتل عام

جالندھر کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ پاکستان کی سرحد دریائے ستلج ہوگا۔ اس بارے میں مسلمانوں کی خوش فہمی ایمان کی حدوں کو چھو رہی تھی، جبکہ ہندو ابتداء سے ہی کہہ رہے تھے کہ حد بندی لاہور اور امرتسر کے درمیان ہوگی۔ بونڈری کمیشن کے قریبی ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے بھی ہندوؤں کے دعوے کی تصدیق ہو رہی تھی، انہی دنوں ''زمیندارہ بینک'' نے اپنا دفتر لائل پور سے بند کر کے جالندھر میں کھولا تو مسلمانوں کی خوش فہمی دُور ہونے لگی۔

13 اگست سے جالندھر شہر میں مسلمانوں پر سکھوں اور ہندوؤں، بلوائیوں کے حملے شروع ہو چکے تھے، شہر میں کرفیو لگ گیا، انہی دنوں باؤنڈری کمیشن کے فیصلہ کا اعلان ہوا تو مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی، ان کے سب ہوائی قلعے چکنا چور اور پاکستان میں شامل ہونے کی خوش فہمی دُور ہوگئی۔ 18 اگست کو عیدالفطر کا دن تھا، اسی رات سے ہی ہندوؤں اور سکھوں نے جو پہلے سے ہی منظم اور ہر قسم کی منصوبہ بندی کر چکے تھے، مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

جالندھر مسلمانوں کے لئے 18,19 اگست کی درمیانی شب، شب محشر تھی۔ رات کے دس بجے چار کاریں مسلمانوں کے محلوں میں چکر لگانے لگیں، بظاہر ان میں پولیس اور حفاظتی فورس کے جوان نظر آتے تھے، لیکن دراصل یہ منظم تخریب کار تھے۔ یہ سب آتشزنی کے ماہرین تھے۔ پہلی کار میں پٹرول چھڑکنے والا پمپ لگا ہوا تھا، یہ کار چیدہ چیدہ مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر پٹرول کی دھار مار کر آگے بڑھ جاتی تھی۔ پچھلی کار میں چار مسلح غنڈے سوار تھے جو آتش گیر مادہ پھینک کر اور آگ بھڑکا کر تیزی سے آگے نکل جاتے تھے۔ تیسری گاڑی میں دس بارہ آدمی مشین اور برین گنوں سے مسلح بیٹھے تھے، جو کسی مکان سے کسی قسم کی مزاحمت کرنے والوں یا آگ سے بچ کر بھاگنے والوں کو اپنی گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیتے تھے۔ چوتھی کار میں اصلی پولیس کے مسلح سپاہی بیٹھے تھے۔ اگر کسی گھر سے ان تخریب کاروں پر فائر ہوتا تو وہ اس مکان کو فوراً گھیر لیتے اور مزاحمت کرنے والوں کو گرفتار کر کے ان

کا تمام اسلحہ چھین لیتے، گویا پولیس کا کام مسلمانوں کو غیر مسلح کر کے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر بے رحم اور جلاد قسم کے ہندوؤں اور سکھوں کے آگے لقمہ تر بنا کر پھینکنا رہ گیا تھا۔

ان کاروں کے علاوہ سکھوں اور ہندوؤں کے تین چار اور گروہ بھی قتل و غارتگری، لوٹ مار اور آتشزدگی میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کو باقاعدہ فوجی تربیت دے کر ملٹری کی وردیاں پہنائی گئی تھیں اور رائفلوں اور دوسرے اسلحہ سے مسلح کیا گیا تھا۔ یہ گروہ شہر کے گردونواح میں مسلمان محلوں کے چکر لگاتا، جہاں کسی مسلمان کو چلتا پھرتا دیکھتا، گولی کا نشانہ بنا دیتا، کرپانوں، برچھیوں، بھالوں، کلہاڑیوں اور دیگر مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر وہ باؤلے کتوں کی طرح ہر طرف مسلمانوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ جہاں انہیں کوئی مسلمان نظر آتا، بے دریغ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔

جالندھر میں ریلوے لائن کے دوسری طرف مسلمان آبادی کا ایک چالیس پچاس گھروں پر مشتمل مختصر سا محلہ آباد تھا۔ آبادی کا زیادہ حصہ غریب محنت کشوں، مزدور یا زمیندارہ کر کے گزر بسر کرنے والے کسانوں پر مشتمل تھا۔ ان کے چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی تھی۔ مارچ کے فسادات میں جب مسلمانوں نے ہندوؤں کی آبادی پر حملہ کیا تھا تو ان محنت کش مسلمانوں نے ہندوؤں اور ان کے اہل و عیال کو اپنے گھروں میں پناہ دے کر بچایا تھا اور ان کی جائیدادوں اور مال و اسباب کی حفاظت کی تھی، جس کی وجہ سے سب ہندو ان کے بڑے ممنون احسان تھے اور ان مسلمانوں کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اس علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت خوشگوار اور برادرانہ تھے۔

17 اگست کو جب ہر طرف فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی تو گردونواح کے ہندوؤں نے ان مسلمانوں کو بڑا یقین دلایا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا، جس طرح مارچ کے فسادات کے دوران مسلمانوں نے ہندوؤں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی تھی۔ اب اسی طرح ہندو ان مسلمانوں کی حفاظت کریں گے۔ سادہ لوح اور ان پڑھ مسلمان مطمئن ہو گئے۔ 18 اگست کی رات کو انہیں ہندوؤں نے

اپنے محسنوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے کرپانوں، برچھیوں، کلہاڑیوں کا مقابلہ ڈانگوں، سوٹوں، اینٹوں اور پتھروں سے کیا۔ صبح نمودار ہونے سے پہلے حملہ آور دس لاشیں محلے کی گلیوں میں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور اپنی جعلی فوج سے مدد کے لئے فریاد کی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی مشین گنوں اور رائفلوں سے مسلح ''ملٹری'' کے دستے نے مقابلے پر ڈٹے ہوئے مسلمان نوجوانوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ گولیوں کے سامنے غیر مسلح جوان کیسے جم سکتے تھے؟ چنانچہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے سب شہید ہو گئے۔ ان کے بعد ان وحشی درندوں نے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو بے دریغ ذبح کر ڈالا، مال و اسباب لوٹ لیا اور گھروں کو آگ لگا کر بھسم کر ڈالا۔

20 اگست کو جعلی سکھ فوج مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئی اور شہر کے مسلمان علاقوں کا چکر لگانے لگی، اس وقت تک مسلمانوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ خوفزدہ ہو کر اپنے بھرے پرے گھروں کو خیر باد کہہ کر بغیر کسی منزل کا تعین کئے، پناہ اور حفاظت کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ ایسے مسلمانوں کو بحفاظت کیمپ میں پہنچانے کا لالچ دے کر یہ جعلی سکھ فوج لاریوں میں بھر کر بلوائیوں کے ہیڈ کوارٹر منڈی فنٹن گنج لے آتی، جہاں ان کی جمع پونجی سے محروم کر کے شہید کر دیا جاتا۔ یہاں انہوں نے آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کر رکھا تھا۔ صحت منداور توانا جسم و جان کے مالک نوجوانوں کو ہاتھ پیر باندھ کر زندہ اس آگ میں پھینک کر ان کے زندہ جلنے کا تماشا دیکھا جاتا۔ اس جگہ سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا گیا یا زندہ جلا ڈالا گیا۔

بعدازاں جالندھر چھاؤنی میں مہاجرین کے لئے ایک کیمپ قائم ہو گیا۔ جالندھر کے بچے کھچے مسلمان اس کیمپ میں منتقل ہو گئے، اس کیمپ کے محافظ ہماری مایہ ناز بلوچ رجمنٹ کے چند افسر اور جوان تھے۔ میری پھوپھی بھی اسی کیمپ میں آ گئیں جہاں سے بعدازاں پاکستان چلی گئیں۔

ریاست کپورتھلہ میں قتل و غارت گری

شہر کی حفاظت:

تقسیم ملک کا اعلان ہوتے ہی کپورتھلہ کے مسلمانوں میں اپنے عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا ہو گیا، چنانچہ فوری طور پر بیرون جات کے علاقوں اور محلوں سے بچوں، عورتوں اور ضعیف العمر افراد کو شہر کے وسط اور نسبتاً محفوظ محلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ مردوں کے مختلف جتھے بنا کر انہیں شہر کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی اور شہر کی ہر طرح سے ناکہ بندی کر کے اجنبیوں اور مشتبہ لوگوں کا شہر کے اندر داخلہ ناممکن بنا دیا گیا۔ جس قسم کا بھی اسلحہ مہیا ہو سکتا تھا اس سے ہر شہری کو مسلح کر دیا گیا، شہر کے اندر ایسا مربوط مواصلاتی نظام قائم کر دیا گیا کہ شہر کے ایک کونے کی خبر دوسرے کونے تک چند منٹوں میں پہنچ جائے۔ تمام رات مرد شہری جاگتے اور نعرے بلند کر کے اپنی بیداری اور ہوشیاری کا ثبوت دیتے رہتے اور دن کو گروپوں کی صورت میں شہر کی حفاظت اور آرام کا فریضہ ادا کرتے۔ مسلمانوں کی اس تنظیم اور مستعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں بسنے والے ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کی سازش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہی وجہ تھی کہ مشرقی پنجاب میں سب سے زیادہ خون ریاست کپورتھلہ کے دیہاتی اور قصبہ جاتی مسلمانوں کا بہایا گیا مگر دشمن شہر کے اندر ایک بھی مسلمان کو گزند پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ریاست کی فوج اور پولیس میں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی، مگر آزادی کا اعلان ہوتے ہی تمام مسلمان سپاہیوں سے اسلحہ رکھوا لیا گیا تھا۔ مسلمان افسروں اور سپاہیوں کو بالکل نہتہ کر دیا گیا تھا، مگر کچھ سر پھرے ایسے بھی تھے جو کافی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود لے کر شہریوں میں آشامل ہوئے تھے۔ کچھ اسلحہ تقسیم ملک سے چند روز پہلے علاقہ غیر سے بھی منگوایا گیا تھا، اس لئے کپورتھلہ شہر پر اندرونی یا بیرونی اطراف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔

عیدالفطر:

18 اگست کو عیدالفطر تھی۔ اکثر دیہات اور آبادیوں میں جب مسلمان خراماں خراماں عید کی نماز ادا کرنے کھلے میدانوں میں جمع ہوئے تو سکھ عین نماز کی حالت میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور نہتے مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ پھر بھی اکثر مقامات پر مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کو مار مار کر بھگا دیا اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں جہاں سول حکام اور پولیس غیر جانبدار رہی مسلمانوں نے سکھوں سے کبھی مار نہیں کھائی۔ لیکن جب سول حکام، پولیس اور فوج بھی سکھوں سے مل گئی اور ریاستوں سے سامانِ حرب اور ریاستی فوج بھی مسلمانوں کے خلاف قتل و خون میں شامل ہو گئی تو مسلمان وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

18 اگست عیدالفطر کے روز مسلمانوں نے گروپوں کی صورت میں نمازِ عید ادا کی۔ نوجوانوں کا ایک گروپ پہرہ دیتا تھا اور دوسرے نمازِ عید پڑھتے تھے، اسی اثناء میں جالندھر سے یہ وحشت ناک خبر موصول ہوئی کہ وہاں شہر میں بہت سی جگہوں پر عید پڑھتے ہوئے مسلمانوں پر سکھوں نے حملہ کر کے بے شمار مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ جن مسلمانوں کے عزیز و اقارب جالندھر شہر میں رہتے تھے۔ ان کے لئے تشویش کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ میری ایک پھوپھی جالندھر میں رہتی تھیں، چنانچہ ہمارے گھر میں بھی ہر فرد ان کے متعلق فکر مند تھا۔ پہلے تو والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے کسی سکھ دوست کو ساتھ لے کر جالندھر جائیں اور پھوپھی اور ان کے اہل خانہ کو نکال لائیں، مگر پھر اسے مصلحت کے خلاف سمجھا گیا کیونکہ شہر کے باہر ہر طرف کشت و خون جاری تھا، پھر حالات ایسے تھے کہ ماضی میں خواہ کتنے ہی اچھے تعلقات رہے ہوں، موجودہ حالات میں کسی غیر مسلم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کپورتھلہ شہر کے اردگرد آگ اور خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ دیہات کے نہتے مسلمان سکھوں کے لئے لقمہ تر بنے ہوئے تھے۔ شہر کے قریب ہی ایک گاؤں تھا جس کا نام شیخوپورہ تھا، اس گاؤں میں مسلمانوں اور سکھوں کی آبادی تقریباً مساوی تھی۔ اس گاؤں کے تمام مسلمانوں کو ان کے مکانوں کے اندر بند کر کے جلا دیا گیا اور کسی کو بچ کر نکلنے کا موقع

نہ دیا گیا، چونکہ شہر محفوظ تھا اس لئے بہت سے قریبی دیہات کے لوگ چھپ چھپا کر شہر میں آ گئے اور شہر کے مسلمانوں نے انہیں اپنے گھروں میں پناہ دی اور دامے درمے سخنے ہر طرح سے ان کی مدد کی اور میثاقِ مدینہ کی یاد تازہ کر دی۔ ان میں بہت سے زخمی اور بیمار تھے، جن کی تیمارداری اور آئندہ حالات کے مدنظر مزید زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے محلہ عارف والا میں ایک بڑی حویلی کے اندر ایک عارضی ہسپتال قائم کر دیا گیا تھا۔

سپیشل ٹرین:

پھر مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانہ پر قتل عام کے لئے ریاستی انتظامیہ نے ایک اور سکیم تیار کی۔ شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ ایک سپیشل ٹرین شہر کے مسلمانوں کو لے کر پاکستان جائے گی اور ملٹری اس ٹرین کی حفاظت کرے گی۔ شہر کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کی یہ ایک گھناؤنی سازش تھی، جس کی شہر کے مسلمانوں کو بروقت خبر ہو گئی۔ مگر اس کے باوجود بہت سے گھرانے اپنا مال و اسباب لے کر اس ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میرے دادا صوبیدار پیر محمد دادی اور میری ایک پھوپھی اور ان کا تمام گھرانہ بھی والد صاحب کے علم کے بغیر، اس ٹرین میں جا سوار ہوئے۔ خود ہم نے اس ٹرین پر سوار ہونے کے لئے اپنا تمام ضروری سامان ایک گڈے پر لاد لیا تھا اور سٹیشن کی طرف روانہ ہونے ہی والے تھے کہ والد صاحب کے ایک سکھ دوست جو ریاست میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے، ہمارے گھر آئے اور والد صاحب کو الگ ایک طرف لے جا کر بتایا کہ اس ٹرین پر سوار نہ ہوں۔ یہ ٹرین منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گی۔ ان سردار صاحب کے گھرانے سے ہمارے گھرانے کے بہت دیرینہ، مخلصانہ بلکہ برادرانہ تعلقات تھے، لہٰذا والد صاحب کو ان کی بات کا یقین کرنا پڑا اور اپنا سامان گڈے سے اُتار کر دوبارہ مکان میں رکھ لیا۔ اس سے چند روز پیشتر ہی سب سے چھوٹی ہمشیرہ کی پیدائش ہوئی تھی اور والدہ زچگی کی حالت میں سفر کرنے کے قابل بھی نہ تھیں۔

اگلے روز علی الصبح یہ ٹرین جو بغیر چھت کے 82 چھکڑوں پر مشتمل تھی، جالندھر کی طرف روانہ ہوئی تو اس کی رفتار ایک عام گدھا گاڑی سے زیادہ نہ تھی۔ بظاہر کچھ باوردی

فوج بھی اس کی ''حفاظت'' کے لئے اس۔کے ہمراہ تھی۔ابھی یہ ٹرین ریاست کی حدود سے باہر نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کا انجن ایک جھٹکے کے ساتھ پٹڑی سے اُتر گیا۔اس مقررہ مقام پر چاروں طرف مسلح سکھ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اچانک ٹرین پر حملہ کر دیا۔خیال رہے کہ ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے تمام مسلمانوں سے ہر قسم کا اسلحہ حتیٰ کہ چاقو، چھریاں اور ڈنڈے تک فوج نے جمع کرالیا تھا، کیونکہ فوج کی ''محافظت'' میں اس ٹرین نے اپنا سفر طے کرنا تھا۔اب جو قتل عام شروع ہوا تو کسی کے پاس اپنے دفاع کے لئے ایک چھڑی تک موجود نہ تھی۔سکھوں نے ٹرین کے پچھلے حصے سے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔چند گھنٹوں میں ہزاروں مسلمان، مرد، عورتیں اور بچے شہید ہو گئے۔ جو کوئی ٹرین سے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگتا، اُسے اس ٹرین کی ''محافظ فوج'' بھون ڈالتی۔ایک نوجوان ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا جالندھر چھاؤنی کے کیمپ میں پہنچا اور وہاں پر موجود بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کو اس قتل عام کی اطلاع دی۔ پاکستان کی بلوچ رجمنٹ کی دھاک ہر جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے جو بڑی بے باکی اور بے دردی سے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہتے تھے، بلوچ رجمنٹ کا نام سنتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے تھے۔جالندھر چھاؤنی سے چند جوان اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر موٹر سائیکلوں پر فوری طور پر اس جگہ پہنچے اور سب سے پہلے اس سکھ فوجی دستے کو اپنی مشین گن کی بھاڑ ماری جس نے ٹرین سے اُتر کر بھاگنے والے مسلمانوں کو نشانہ بنا رکھا تھا۔ پھر ارد گرد پھیلے ہوئے سکھوں کو اپنی مشین گنوں کی بھاڑوں پر رکھ لیا۔چند لمحوں میں ان رحمت کے فرشتوں نے سینکڑوں سکھوں کو جہنم واصل کر دیا، باقی میدان سے بھاگ نکلے۔اب انہوں نے ٹرین کا کنٹرول خود سنبھالا اور ریل کی پٹڑی کی مرمت کر کے بچے کھچے مسلمانوں کو حفاظت کے ساتھ جالندھر سٹیشن تک پہنچا دیا۔اس ٹرین کے قتل عام کی چشم دید روداد خلیفہ امام دین نے ''محشرستان کپورتھلہ'' کے نام سے لکھی ہے۔اس میں سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

کٹی ہوئی گردنیں:

''7 ستمبر 1947ء کو سرکاری اعلان شہر و دیہات میں کیا گیا اور ملٹری کے سپاہی گھروں میں داخل ہو کر دورانِ کرفیو میں ترغیب دیتے رہے کہ یہ ٹرین پاکستانی ملٹری کی حفاظت میں پاکستان پہنچائی جائے گی، اس کے بعد کوئی ٹرین نہیں جائے گی۔ چونکہ شہر اور دیہات میں اغوا اور لوٹ مار ہو رہی تھی، مسلمان جوق در جوق بے انتہا ٹرین پر سوار ہوتے گئے، اگر کوئی اسٹیشن سے شبہ یا خطرہ محسوس کرتا ہوا واپس آنا چاہتا، اسے دھمکی سے یا چاپلوسی سے سوار کر دیا جاتا۔ اسٹیشن پر اکثر اہلکاران ریاست بھی موجود تھے۔ کرتار پور کے مہاجرین اور دیگر لاتعداد قریب و جوار کے پناہ گیر جو مدرسۂ اسلامیہ میں کئی یوم سے مسلمانانِ کپورتھلہ کے زیرِ حفاظت تھے، ٹرکوں پر سوار کر کے ٹرین پر چڑھا دیئے گئے۔ اسٹیشن پر پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کارخانہ برف بانیاں کو بھی مقفل کر کے پانی بند کر دیا گیا۔ ابھی یہ ٹرین اسٹیشن پر کھڑی تھی کہ ایک ٹرین جالندھر کی جانب سے گزری جس میں صرف مسلح نوجوان سکھ تھے، جو خون آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ٹرین کچھ وقت ٹھہر کر روانہ ہو گئی۔

9 ستمبر بوقت ایک بجے دوپہر ٹرین روانہ کی گئی جس کے تقریباً 82 چھکڑے تھے۔ مسلح سکھ گروہ در گروہ لائن سے قدر دور سواریوں کو دکھائی دے رہے تھے۔ اپنے شکار کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ سواریاں انہیں دیکھ کر بدحواس ہو رہی تھیں۔ ٹرین نہایت کم رفتار پر چلائی جا رہی تھی۔ چند سپاہی ملٹری پھاٹک وڈالہ پر متعین تھے۔ جے سنگھ ٹینک سوار گشت کر رہا تھا۔ اس نے بے وقت ٹرین ٹھہرا لی۔ جب تجویز کردہ جائے حادثہ پر ٹرین پہنچی جہاں پہلے ہی پٹری اکھاڑی ہوئی تھی، انجن زمین میں دھنس گیا۔ سواریوں نے بے ساختہ ہیبت ناک شور و غل پیدا کر دیا۔ جائے۔ حادثہ سے صرف دو فرلانگ پر جے سنگھ ٹینک سوار کھڑا تھا۔ یکایک جگدیش متر ولد گنڈی بانیاں نے پہلا بم مارا، جو سیوک سنگھ کپورتھلہ کا ممبر تھا۔ اس کا دوسرا بھائی اور امر درزی امرتسری برابر بمباری کرتے رہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی، ہندو، سنگھ، خاکروب اور بوریوں نے جو پہلے ہی ہزارہا حملہ آور بلائے ہوئے

تھے، بموں، رائفلوں، ٹومی گنوں، تلواروں اور بلموں سے قتل عام شروع کر دیا۔ اس ہیبت ناک ہنگامۂ قتل میں سوائے گریہ وزاری اور موت کی چیخ وپکار کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ فوجی سپاہی باوردی و بلاوردی اور ہندو وسکھ مسلمانوں کو بے دریغ گاجر مولی کی طرح کاٹتے جارہے تھے۔ گویا مسلمانوں پر قیامت صغریٰ کا نمونہ درپیش تھا۔ ایسے وقت پر یہ بدبخت کیا مدافعت کر سکتے تھے، جبکہ اس ظالم حکومت نے پہلے ہی تلاشیاں لے کر ایک چھڑی تک نہ رہنے دی تھی۔ ان خونخوار درندوں کے جابرانہ حملوں سے اوسان گم ہو رہے تھے۔ بعض صدمہ نہ برداشت کرتے ہوئے مفقود الحواس ہو گئے۔ ماں باپ کو بیٹے بیٹی کی، خاوند کو عورت کی خبر تک نہ رہی۔ قتل گاہ میں لاشیں ہی لاشیں، دور دراز بے شمار زخمی خون آلود اور شیر خوار اور کم سن بچے زمین پر تڑپ رہے تھے۔ جو ہاتھ باندھتا، ہاتھ کاٹ ڈالتے، جو پاؤں پڑتا، گردن کاٹ ڈالتے، ایک سنگدل انسان کا بھی ایسے دلخراش منظر الم دیکھ کر دل پارہ پارہ ہو جاتا۔ ان ظالموں نے خونخوار درندوں سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کا قتل عام کیا، کئی عورتوں کی تلاشی کر کے برہنہ کیا، کئی عورتوں کی برہنہ لاشیں دیکھی گئیں۔ نوجوان عورتوں کو جبراً بازوؤں سے پکڑ کر چیخ وپکار کرتے ہوئے بے آبروئی سے بھگا لے گئے۔ جس نے مقابلہ کیا، قتل کر دیا، بعض کو زمین پر گرا کر کمرے سے دو ٹکڑے کر دیئے۔ حتیٰ کہ باپ بیٹے کے روبرو ذبح کیا۔ ماں کے سامنے بیٹی کی بے عزتی کی۔ ظلم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے بچوں کو پیشاب تک پلایا گیا۔ کئی ایک نے بلا پانی کے جان دے دی۔ ایسے ناقابل برداشت حوادث سے خوفزدہ ہو کر بکثرت سواریوں نے چھلانگیں لگا کر بھاگنا شروع کر دیا۔ مارے خوف جان کے بھاگتے ہوئے مرد وزن نے شیر خوار اور کم سن بچوں تک کو پھینک دیا۔ ظالم سکھ بچوں کو بنوک کرپان قتل کرتے، پاؤں تلے روندتے، ابھار کر نوک بلم پر دبوچتے اور کہتے "یہ تمہارا پاکستان ہے" بھاگنے والوں میں سے جو زندہ بچے، وہ بستی باباخیل پہنچ گئے۔ وہاں پر مہاجرین کا کیمپ ابھی اٹھایا جا رہا تھا، لیکن پاک ملٹری موجود تھی، ملٹری خبر سنتے ہی فوراً جائے حادثہ پر پہنچی۔ حملہ گیر انہیں دیکھ کر بھاگ گئے۔ جو مسلمان باباخیل پہنچے، اہلیان بستی نے ان کی خورد ونوش اور پارچات وغیرہ سے خوب تواضع کی۔ دوسری طرف دو

مہاجرین جو ریل کی پٹڑی پر بھاگے، انہوں نے حملہ آوروں کا سنگریزوں سے مقابلہ کر کے بھگا دیا۔ تیسری جانب جو موضع سواہ نسی کی طرف بھاگے، وہ جرنیلی سڑک پر چڑھ گئے، انہیں تین لاریاں بلوچ ملٹری کی ملیں۔ گاڑی کے قتل کے بے پناہ مظالم سن کر ان میں سے ایک لاری چھاؤنی جالندھر کو اور دو لاریاں بجانب حادثہ پہنچیں۔ انہوں نے موضع کھوجے وال کے سکھوں کو بلا کر کہا۔ اگر اب حملہ کرو گے، قتل کر دیئے جاؤ گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ حملہ آور تو جے سنگھ کے بلائے ہوئے تھے، تاکہ ٹرین قتل کریں۔ میں نے خود کئی زخمیوں کو دیکھا۔ بعض کیمپوں میں اور بعض ہسپتال میں جاں بحق ہوئے۔ بعض ایسے بھی تھے جو صحت یاب ہونے پر بھی کاروبار کے لائق نہ رہے۔

یہ ٹرین جائے حادثہ پر دو یوم پڑی رہی۔ ٹرین کے قتل کی خبر جالندھر پہنچنے پر دو ٹینک اور کچھ فوجی ٹرک پہنچ گئے۔ جنہوں نے تمام رات حفاظت کی، پھر دوسری ٹرین منگوائی گئی۔ یہ ٹرین بھی تھوڑی دُور چلی کہ پھر پٹڑی اکھاڑی ہوئی تھی۔ پھر وہی حشر برپا ہوا۔ الغرض کپورتھلہ تا جالندھر جو صرف گیارہ میل لمبائی پر ہے، تین جگہ ٹرین پٹڑی سے اُتاری گئی، اسٹیشن جالندھر پر بوقت شب ٹرین پہنچی۔ وہاں بھی ہزارہا حملہ گیر موجود اور پانی نایاب تھا۔ یہاں پر بھی بے شمار قتل اور مستورات اغوا کی گئیں۔ یہاں سے ٹرین نصف شب چلائی گئی جو صبح نو بجے امرتسر پہنچی۔ دشمنانِ اسلام چوطرفہ حلقہ باندھے برہنہ تلواریں چمکا کر باآواز بلند کہہ رہے تھے کہ اب پاکستان کے بجائے قبرستان کو جانا ہوگا۔ ہر طرف پانی بافراط مگر مسلمانوں کے لئے کربلا کا نمونہ تھا۔ جو پانی لینے گیا، قتل کر دیا گیا۔ ایک انگریز لیفٹیننٹ نے رحم کھا کر پانی کی جبراً اجازت دی۔ ایک سکھ افسر نے حکم دیا کہ اگر جان سلامت چاہتے ہو تو تمام سامان پھینک دو۔ سب نے رہا سہا سامان بھی پھینک دیا، پھر بھی ان ظالموں نے جامہ تلاشی لی، یہاں تک کہ عورتوں کے ازار بند کھلوائے گئے اور بکثرت بمباری کر کے کئی مسلمان شہید اور کئی زخمی کر دیئے۔ مجھے منشی محمد جمیل نے بتایا کہ میں نے امرتسر کے اسٹیشن پر جنوب کی جانب گردنیں کٹی ہوئی اور پستان کٹے ہوئے بذریعہ تار شکل حروف ''جے ہند'' لٹکایا ہوا پڑھا''۔

”قتل گہہ کھوجے والی“

خلیفہ امام الدین مرحوم ریاستی مسلم لیگ کے صدر اور فعال شخصیت تھے۔ انہوں نے ریاست کے مسلمان معززاور با اثر شخصیات سے مل ملا کر ایک میٹنگ کی۔ جس میں طے پایا کہ ایک وفد کی صورت میں وزیر اعظم لکھپت رائے سے ملاقات کر کے مسلمانوں کے تحفظ اور بقا کے لئے التجا سے کام لیا جائے۔ دیوان اجودھیا داس مشیر مال ایک رحم دل، معتدل مزاج اور ایک حد تک مسلمانوں کے ہمدرد واقع ہوئے تھے، انہیں بھی وفد میں شامل کیا گیا اور 9 ستمبر 1947ء کو وزیر اعظم لکھپت رائے سے ملاقات کر کے وفد نے اپنی عاجزانہ معروضات اس کے سامنے پیش کیں۔ وزیر اعظم مذکور نے سردار سندر سنگھ آئی جی پولیس میجر کوٹہ والا اور فوج کے جرنیل جے سنگھ کو طلب کیا اور فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو بحفاظت بذریعہ ریل گاڑی جالندھر پہنچا دیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد شہر میں سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا کہ 11 ستمبر کو صبح دس بجے کپورتھلہ سے ایک ریل گاڑی پاکستان کو جانے والے مسافروں کو جالندھر تک پہنچانے کے لئے جا رہی ہے، لہٰذا تمام مسلمانوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا ضروری سامان لے کر اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں سوار ہو جائیں۔

مذکورہ اعلان سنتے ہی پچیس تیس ہزار افراد (مرد، عورتیں اور بچے) اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی میں سوار ہونا شروع ہوئے۔ ریل گاڑی سے 82 بوگیاں جوڑی گئی تھیں۔ جو پوری طرح بھر گئی تھیں۔ لوگ گاڑی کی بالائی چھتوں پر اور بیشتر پائیدانوں پر سوار تھے۔ بارہ ایک بجے گاڑی اپنے ان معصوم اور فریب خوردہ مسافروں کو لے کر آہستہ رفتار کے ساتھ اپنے ان جانی منزل کے مسافروں کو لے کر خراماں خراماں کپورتھلہ سے رخصت ہوئی۔ گاڑی کے سوار انتہائی مسرور اور مطمئن اپنی منزل مقصود ”پاکستان“ کی طرف رواں دواں تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ موت کے بے رحم سائے ان کے سروں پر منڈلاتے ہوئے ان کے ساتھوں ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ بدمعاش ”جے سنگھ“ جرنیل اپنی بدمعاشی کی مہلک چال چل چکا تھا۔ ریل گاڑی قریباً تین چار میل چل کر ”کھوجے والی“ اسٹیشن کے قریب پہنچی تھی کہ ریل کی اکھڑی ہوئی پٹڑی کی وجہ سے انجن ایک جھٹکے کے ساتھ پٹڑی سے اُتر کر رُک

گیا۔ گاڑی کا رکنا تھا کہ چاروں طرف چھپے ہوئے مسلح سکھ جتھے گاڑی کے مسافروں پر حملہ آور ہو گئے۔ مظلوم ومقہور بے بس اور بے یارومددگار یہ بھولے بھالے اللہ کے بندے اور شمع پاکستان کے متوالے دھوکہ اور فریب کا شکار ہو چکے تھے۔ ہر طرف ان کے خون کی ارزانی تھی۔ معصوم عصمتوں، بے غیرتی اور بے حیائی کے بڑھتے ہوئے ناپاک ہاتھوں کو روکنے کا آخری اور صرف ایک ہی راستہ باقی تھا۔

"مقابلہ اور عزت کی شہادت"

چنانچہ لہو کی جائے نماز پر نمازِ شہادت ادا کرنے کے لئے غیرت مند اور بہادر نوجوانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے کفار حملہ آوروں پر یلغار کر دی۔ ان بہادر نوجوانوں کے دوش بدوش کہنہ سال بزرگوں نے بھی جانبازی کا ثبوت دیتے ہوئے قدم قدم پر حملہ آور کفار کا راستہ روکنا شروع کر دیا۔ ان بزرگ ہستیوں میں سابق کورٹ انسپکٹر غلام محمد خان، صوبیدار پیر محمد (مصنف کے دادا) محمد اور منشی شیر محمد تین ایسی ہستیاں تھیں، جن کے پاس اپنے ریوالور اور کچھ گولیاں تھیں۔ چالیس پچاس کفار کو جہنم واصل کر کے میگزین خالی ہو چکے تھے۔ یہ معرکۂ حق و باطل کم وبیش تین گھنٹے تک جاری رہا۔ چار ہزار کے لگ بھگ بہادر نوجوان اور کہنہ سال بزرگ ایک ایک کر کے اپنا تمام اثاثہ حیات نچھاور کرتے اور جام شہادت نوش کر کے عالم علیین کی طرف رخصت ہوئے۔ چار صد کے قریب دخترانِ اسلام دشمنوں کے پنجۂ استبداد کا شکار ہو کر عدم کی وادیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو کر رہ گئیں۔

اِنَّ لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○

مذکورہ بالا شہدائے کرام میں کوتوالی ریٹائرڈ خان غلام محمد خان معہ اپنے دس افراد خاندان، صوبیدار پیر محمد سالار مسلم لیگ نیشنل گارڈ معہ اپنے 14 افراد خاندان اور منشی شیر محمد معہ اپنے 8 افراد خاندان کے علاوہ مسلم لیگ کے معروف کارکنان، رشید احمد، طفیل محمد، اللہ دتا اور ظفر حسین معہ اپنے 32 افراد خاندان شامل ہیں۔

ان شہدا اور غازیوں کی گاڑی کا محافظ لیفٹیننٹ جنگ سنگھ اور اس کی ڈوگرہ فوج

کے سپاہی اس مقتل کے خاموش تماشائی بنے رہے۔ حملہ کے دوران افراتفری اور رستاخیزی کے عالم میں متعدد مرد، عورتیں اور بچے قریب کی فصلوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں چھپ چھپا کر اپنی اپنی جانیں بچانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ شہیدوں کی مقدس لاشیں حدنگاہ تک بکھری پڑی تھیں۔ کھوجے والی کی سرزمین شہدائے کرام کے مقدس خون سے ''لالۂ رنگین قبا'' کا منظر پیش کر رہی تھی۔

اسی دوران کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع پٹھان بستی بابا خیل کے پٹھان نوجوان ملٹری جیپوں میں سوار اور بہار رجمنٹ کے کپتان ''غازی صاحب'' اپنے مسلمان فوجیوں کے ہمراہ کھوجے والی اسٹیشن کی اس قتل گاہ میں پہنچ گئے، حملہ آوروں سے ان کا تصادم بھی ہوا، کئی کفاران ان کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے۔ بقیہ جانیں بچا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ شہدائے کرام جہاں جہاں آسودۂ خاک ہوئے ان کی لاشوں کو وہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ چار صد سے زیادہ زخمیوں کو بحفاظت بستی بابا خیل پہنچا کر ان کی مرہم پٹی کی گئی اور ازاں بعد کیپٹن غازی نے انہیں جالندھر چھاؤنی کے حفاظتی کیمپ میں پہنچا دیا۔

لیفٹیننٹ جنگ سنگھ اور ڈوگرہ فوج کو ہٹا کر کیپٹن وجاہت حسین کو سی۔ آئی۔ ایچ کے تیس چالیس فوجی جوانوں کے ہمراہ متعین کیا گیا۔ انہوں نے ریل کی پٹڑی مرمت کر کے بقیہ السیف مسلمان مسافروں کو گاڑی میں سوار کر کے جالندھر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچایا، جہاں انہیں لاہور جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

لاہور جانے والی اس ریل گاڑی میں انہی طرح کے زخم خوردہ مصائب و مشکلات کا شکار مسافر سوار تھے۔ گاڑی میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ گرمی کی شدت اور حبس سے دم گھٹ رہے تھے۔ پانی کے نل دشمن حکومت نے عملاً بند کر دیئے تھے اور گاڑی سے باہر قدم رکھنے والا موت کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔ جو ضعیف بیمار زخمی اور معصوم بچے ان شدائد و مصائب کو برداشت کرنے کی ہمت و استطاعت نہیں رکھتے تھے، وہ لحہ بہ لحہ دم توڑ رہے تھے۔ ان مرنے والے عزیزوں، بزرگوں اور پیاروں کی مردہ لاشوں کو مجبوراً دفنانے کی بجائے گاڑی کے باہر لڑھکا دیا جاتا تھا اور مامتا کی ماری ہوئی مائیں اگر اپنے

پیاسے معصوموں کی جانیں بچانے کے لئے انتہائی بے بسی کے عالم میں پلیٹ فارم پر پانی کی تلاش میں جانے کی کوشش کرتیں تو انہیں واپس لوٹ کر اپنے لختِ جگروں کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ بے رحم سکھ اور ہندو غنڈے اسے پکڑ کر ہمیشہ کے لئے ایسے عقوبت خانوں میں دھکیل دیتے کہ پھر آج تک ان کا کہیں سراغ تک مل سکا۔

جن کی یادوں سے رگِ جاں میں دُکھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا بھی دل رونے لگے

حکیم حاجی منور احمد کی داستانِ الم

1947ء کی خونچکاں داستانیں اگرچہ قصہ پارینہ بن چکی ہیں، پھر بھی 14 اگست اور اس سے پہلے اور بعد کے لمحات سینکڑوں آنکھوں کو اشکبار کر جاتے ہیں۔ ارضِ پاک کے بیٹے بیٹیاں جشنِ آزادی منا رہے ہوتے ہیں اور لٹے پٹے قافلوں کے زخم خوردہ مسافر اپنی روح کے داغ گن رہے ہوتے ہیں۔ راہِ وفا کے ان شہیدوں میں بیٹے، باپ، بھائی، شوہر سب شامل تھے۔ سفرِ آزادی میں کھو جانے والوں میں مائیں، بیٹیاں، بہنیں اور بہوئیں تمام شریک تھیں، کوئی مارا گیا۔ کوئی بچھڑ گیا، کوئی لوٹی گئی، کوئی چھینی گئی، غرض کہ قدم قدم پر مقتل تھا اور ہر راستہ خون سے ہو کر گزرتا تھا، انسانی زندگی اور مذہبی دیوانگی کے پنجے میں جنم لینے والی یہ کہانیاں اگرچہ کرب و اذیت سے پُر ہیں، مگر انہیں دہراتے رہنا چاہئے کہ نئی نسل اور نوجوان پود جان سکے کہ ہماری آرزوؤں کے گہوارے "پاکستان" کی بنیادوں میں لاکھوں ممتاؤں، محبتوں، رشتوں، سہاگوں اور عصمتوں کا لہو رچا بسا ہے اور قوم کو آزادی یونہی نہیں ملی اور وہ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزر کر منزل تک پہنچی ہے۔

1947ء کے فسادات کا تصور کر کے 14 اگست کے روز چپ چپ آنسو بہانے والوں میں ٹیکسالی گیٹ لاہور کا حاجی منور احمد بھی شامل ہے۔ جالندھر کے حکیم سلطان احمد کا یہ بیٹا غالباً دس سال کی عمر میں پاکستان آیا تھا۔ 9 افراد پر مشتمل اس خاندان پر راہوں میں کیا گزری؟ انہیں کن قیامتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ موت نے کیسے کیسے ان کا پیچھا کیا اور انہوں نے کیا کھو کر آزادی کی نعمت پائی، یہ پُر آشوب کہانی کم از کم ان لوگوں کے

لئے یقیناً سبق آموز ہوگی جو منزل پانے کے بعد اپنے مقاصد کو بھول چکے ہیں۔ وہ خود کو پاکستانی تو کہلاتے ہیں مگر سرزمین پاک سے محبت کا ثبوت فراہم نہیں کرتے۔

حکیم حاجی منور نے اپنی داستان ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

''میرے والد حکیم سلطان احمد قیام پاکستان سے قبل محلہ کیش پورہ جالندھر میں رہتے تھے، یہ کنبہ 19 افراد پر مشتمل تھا، ایک چچا تھے جو ریاست پٹیالہ میں آباد تھے اور وہیں پر کاروبار کرتے تھے۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو جالندھر کے متعصب ہندوؤں اور ان کے آلہ کار سکھوں کے جیسے تیور ہی بدل گئے۔ والد صاحب نے برسوں کے شناسا غیر مسلموں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو خاندان سمیت ریاست کپورتھلہ میں منتقل ہو گئے، ان کا خیال تھا کہ خون خرابہ چند دنوں کی بات ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کا مذہبی اور سیاسی جنون کم ہو جائے گا تو واپس جالندھر آ جائیں گے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کا یہ سفر طویل ہو جائے گا اور اب وہ خوف و وحشت کی وادیوں سے گزرتے ہوئے واہگہ کی سرحد پر ہی جا کر دم لیں گے۔ کپورتھلہ میں اگرچہ امن تھا، لیکن باقی سارے مشرقی پنجاب میں خونریزی، لوٹ مار، قتل و غارت اور فسادات کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔ انسان درندہ بن چکا تھا اور شرافت نے بہیمیت کی صورت اختیار کر لی تھی، چند روز بعد ریاست کپورتھلہ میں بھی آگ اور وحشت کا سیلاب در آیا اور ہندوؤں کے ایماء پر نہتے اور سہمے مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

قتل و غارت اور آتشزدگی کی چند وارداتیں ہوئیں تو راجہ کپورتھلہ نے ریاست میں کرفیو لگوا دیا اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر ان کے گھروں سے نکلوا دیا کہ پاکستان کے لئے ایک گاڑی روانہ کی جا رہی ہے۔ ریاست کی مسلم رعایا ریلوے سٹیشن پہنچ جائے اور گاڑی میں بیٹھ کر پاکستان چلی جائے۔ یہ اعلان ہوتے ہی کپورتھلہ کی مسلم آبادی قافلوں اور گروہوں کی صورت میں سٹیشن پہنچ گئی اور پاکستان جانے کی اُمید لے کر گاڑی میں سوار ہو گئی۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں سے ڈبے کھچا کھچ بھر گئے اور جب گاڑی کے اندر اور چھتوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو انجن آہستہ آہستہ کھسکنے لگا، یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سکھ راجہ[1]

---

[1] یہ سازش ولی عہد پرمجیت سنگھ کی تھی۔ راجہ ان دنوں فرانس گیا ہوا تھا۔ (مصنف)

نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مسلمانوں کو مقتل کی طرف دھکیلا ہے اور گاڑی کبھی پاکستان نہیں پہنچے گی۔

گاڑی کے مسافر دلوں میں پاکستان جانے کی ہزاروں آرزوئیں لئے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے یا کھڑے تھے اور گاڑی کے عقب میں ننگی تلواروں اور عریاں برچھیوں والے نہنگ جتھے چلے آرہے تھے اور شہر سے چند میل دُور گاڑی جونہی ایک دھچکے کے ساتھ رُکی اور انجن ڈبوں سے الگ ہو گیا تو مسلمانوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ درندہ صفت بلوائیوں نے تلواروں، کرپانوں اور بندوقوں سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لائن کے دونوں اطراف لاشیں اور خون بکھر گیا۔ ظالموں نے بچہ دیکھا نہ بوڑھا، عورت دیکھی نہ لڑکی، بس ڈبوں میں گھستے تھے، تلواریں چلاتے تھے اور جسموں کو چھلنی کیے جاتے تھے۔

حشر کے اس عالم میں والدہ نے میرا بازو تھاما، چھ سالہ بھائی کو بازوؤں میں سمیٹا اور دونوں بہنوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ایک طرف کو بھاگیں۔ ماں بچے کو نہیں سنبھال رہی تھی اور شوہر بیوی سے غافل ہو گیا تھا۔ ہم لوگ ابھی گاڑی سے زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ میں نے دیکھا کہ میری بہنیں رضیہ اور نسیم ایک طرف کو بھاگی چلی جا رہی ہیں، میں نے انہیں آوازیں دیں لیکن وہ پلک جھپکتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ تب والدہ نے چھوٹے بھائی کو میرے سپرد کیا اور سر ماتھا چوم کر کہا جاؤ اپنی بہنوں کو ڈھونڈو وہ مل گئیں تو ان کے ساتھ ہی رہنا، بچ گئے تو دوبارہ ملاقات ہو جائے گی ورنہ خدا حافظ بھاگ جاؤ اور اپنی جانیں بچاؤ، میری فکر نہ کرنا۔ میں نے ماں کے چہرے پر حسرت کی نگاہ ڈالی اور بھائی کو گھسیٹتا ہوا اس طرف چل دیا، جدھر نسیم اور رضیہ جا رہی تھیں۔ ہم دونوں بھائی لاشوں کو پھلانگتے خون میں سے گزرتے گرتے پڑتے اپنی بہنوں تک پہنچ گئے، اس بھاگ دوڑ میں چھوٹے بھائی کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ بھیڑ میں ایسے گم ہوا کہ تلاش کے باوجود اس کی صورت نظر نہ آئی، بھائی کو خدا کے سپرد کر کے ہم تینوں ایک طرف کو چل دیئے اور درختوں کی اوٹ میں نامعلوم سمت کی طرف بڑھتے گئے۔

چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں پہلے سے چند مسلمان خاندان چھپے بیٹھے تھے۔

یہ لوگ بھی گاڑی سے جانیں بچا کر بھاگے تھے اور کسی نہ کسی طرح شہر پہنچنا چاہتے تھے۔ ان میں چند بچے دو چار جوان لڑکیاں، کچھ بوڑھی عورتیں اور باقی مرد تھے۔ ہم ان تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ مسلح بلوائیوں نے یہاں بھی حملہ کر دیا شور و غوغا ہوا چیخیں اُبھریں اور بین اور کراہیں بلند ہوئیں اور ہم نے اوٹ میں سے دیکھا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے تمام مردوں کو تہ تیغ کر دیا اور جوان لڑکیوں اور بچوں کو گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس بھگدڑ میں چھوٹی بہن بھی ہم سے جدا ہو گئی، ماں اور دادی کو گاڑی کے قریب مقتل میں چھوڑ آئے تھے، باپ کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ راستے میں بھائی بچھڑ گیا اور اب بہن بھی کہیں چلی گئی تھی، میں نے رونا چاہا تو بڑی بہن نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک کھیت میں لے گئی۔

شام ہو چکی تھی اور ہم بھائی بہنوں کے علاوہ کھیت میں اور بھی بہت سے مسلمان چھپے ہوئے تھے، ایک ضعیفہ کا پورا خاندان شہید کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے مقتولوں کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ بلوائیوں کے کانوں میں رونے کی آواز پڑی تو وہ دندناتے ہوئے کھیت میں گھس گئے اور سب کو باہر لے آئے، انہوں نے پہلے ایک جوان مرد کا سینہ چھیدا پھر اس کی بیوی کی چھاتیاں کاٹیں اور بعد میں بچے کو نیزے میں پرو دیا۔ میں نے یہ منظر دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک طرف کو بھاگ نکلا، مگر بلوائیوں نے مجھے پکڑ لیا، قریب تھا کہ ایک خونی میری گردن اڑا دیتا کہ میری بہن اور ایک بوڑھی عورت نے اس نہنگ کے پاؤں پکڑ لئے اور فریاد کرتے ہوئے بولی یہ بچہ ہے اسے قتل نہ کرو۔ نہنگ نے میری بہن کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کچھ سوچ کر مجھے چھوڑ دیا اور ہم بہن بھائی کو ساتھ لے کر ایک طرف چلدیا، وہ ہمیں اپنے گاؤں لے جا رہا تھا۔

میرا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا اور زبان کانٹا بن گئی تھی، میں نے بلوائی سے منت بھرے لہجے میں کہا خدا کے لئے دو گھونٹ پانی پلوا دو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، ایک کھیت میں بارش کا پانی جمع تھا، اس نے بارش کے پانی سے خون آلود کرپان دھوئی اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولا یہیں سے پی لو میں پانی پر جھکا تو سارا کھیت سرخ ہو رہا تھا، یہ مسلمانوں کا خون تھا، میں نے پانی پینے سے انکار کر دیا اور پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیرتے

ہوئے آگے چل دیا۔

آگے مسلمان لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا...... بلوائی ان مسلم زادیوں کو گاڑی سے اغوا کر کے لائے تھے اور اب انہیں آپس میں تقسیم کر رہے تھے، کم وبیش دوسو لڑکیاں ہوں گی جو ظالموں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ہمیں بھی اس ریوڑ میں دھکیل دیا گیا۔ یہاں بہت سے نہنگوں نے چاہا کہ مجھے قتل کر دیں لیکن وہ سکھ نہ مانا جو ہمیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ بہر حال بلوائی اپنے حصے کی لڑکیاں لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے اور ہم بھائی بہن اس خونی کے پیچھے ہو لئے، ایک جگہ کنواں دیکھ کر میں رُک گیا اور بہن کو اشارے سے بتایا کہ پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔ سکھ نے ہمیں پانی پینے کی اجازت دے دی، میں کنوئیں کی طرف بڑا ہی تھا کہ سامنے سے ایک موٹی توند والا ہندو آیا اور وہاں پر موجود لوگوں سے کہنے لگا کہ یہ سانپ کا بچہ زندہ کیوں چھوڑا ہوا ہے اسے کنوئیں میں پھینک دو۔ میری بہن کی تو جیسے جان ہی نکل گئی، وہ ہجوم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور روتے ہوئے بولی میرے بھائی کو کچھ مت کہنا، ماں باپ کی یہی نشانی تو میرے پاس بچی ہے۔ اسی اثناء میں ہجوم سے ایک معمر شخص سامنے آیا اور بھیڑ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اس بچے کو کچھ نہ کہو، وہ بے اولاد ہے، اسے اپنا بیٹا بنا لے گا۔ اس نے بلوائیوں سے کچھ کہا اور وہ ہمیں معمر شخص کے حوالے کر کے چلے گئے۔

معمر شخص نے مجھے سینے سے لگایا، بہن کو تسلی دی اور ہمیں لے کر اپنے ڈیرے کی طرف چل دیا، ڈیرے پر پہنچ کر اس نے ہمیں گڑ مکئی کھلائی، پانی پلایا اور کہنے لگا کہ تمہارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے، خونی کسی وقت بھی تمہاری تلاش میں آسکتے ہیں، بہتر ہو گا کہ تم کپورتھلہ شہر چلے جاؤ وہاں مسلمانوں کا کیمپ لگا ہے، کیمپ میں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، کیا خبر تمہارے بچھڑے ہوئے ماں باپ اور بھائی بہن وہیں ہوں۔ معمر شخص نے ہمیں شہر کی طرف جانے کا راستہ سمجھایا اور ہدایت کی کہ گاؤں سے ہٹ کر گزرنا، راستے میں قبرستان آئے گا، ہو سکتا ہے قبرستان میں تمہیں کچھ مسلمان مل جائیں جو بحفاظت کیمپ میں پہنچا دیں۔ معمر شخص نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے پیار

کیا اور دیر تک دعائیں دیتا رہا۔

ہم بھائی بہن نے خدا کا نام لیا اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے شہر کی طرف چل دیئے۔ ہمارے دائیں بائیں پتہ بھی کھٹکتا تھا تو جان نکل جاتی تھی۔ جسم میں طاقت باقی نہیں رہی تھی اور پاؤں کے چھالوں سے خون رسنے لگا تھا، موت تھی کہ ہمارے آگے پیچھے سر سراتی پھر رہی تھی، بھوک سے برا حال تھا اور صدمات سے سینے چھلنی ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے شام ہوگئی تو ہم نے سوچا کہ رات کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہے، کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہو جائیں گے۔ ابھی ہم مشورہ کر رہے تھے کہ ہندوؤں کے چنگل سے بھاگی ہوئی ایک مسلمان لڑکی ہانپتی کانپتی آئی اور وحشت زدہ لہجہ میں بولی گاڑی میں ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچا، ظالموں نے مردوں کو قتل کر دیا ہے اور عورتوں کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں، وہ بہت مشکل سے عزت اور جان بچا کر نکلی ہے۔ مجھے ماں کا خیال آیا، باپ کا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ دادی کے بین سنائی دینے لگے اور ایسا لگا سب مارے گئے ہیں، کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔

رات ہم نے قبرستان کے احاطے میں ایک شکستہ قبر کے اندر گزاری اور پو پھٹتے ہی شہر کی طرف چل دیئے، بڑی سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کا ایک بڑا جتھہ ہے جو بڑی سڑک پر چلا آ رہا ہے، اب تو زندگی کی رہی سہی اُمید بھی ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ہم بھائی بہن نے خدا کو پکارا، ہماری ساتھی لڑکی نے بے بس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور مرنے کے لئے تیار ہوگئیں، لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، معاً وسل کی آواز بلند ہوئی اور بلوائی ایک طرف بھاگ نکلے، سڑک صاف ہوتے ہی ہم تینوں درختوں کی اوٹ سے نکلے اور سو گز دور ایک بڑی سی کوٹھی کے مین گیٹ میں داخل ہوگئے۔ کوٹھی سنسان اور ویران نظر آ رہی تھی۔

چند ثانیے بعد کوٹھی کے عقبی کوارٹر سے ایک نوجوان نکلا، اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی، میں نے یہی جانا کہ کوئی بھنگی ہے اور ابھی کوٹھی کے غیر مسلم مکینوں کو خبر کر دے گا اور وہ ہماری تکا بوٹی کر دیں گے، لیکن نوجوان، عیسائی نہیں مسلمان تھا، اس نے بتایا کہ وہ جان

بچانے کے لئے خاکروب کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا اور بھینسوں کے لئے مخصوص کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کر رہا تھا کہ چند بلوائی دندناتے ہوئے اندر آ گئے اور نوجوان سے پوچھنے لگے کہ اس گھر میں کون رہتا ہے، نوجوان نے ہمت کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ عیسائی ہے اور اپنی بہنوں کے ساتھ عقبی کوارٹر میں رہتا ہے۔ بلوائی یہ کہہ کر چلے گئے کہ اگر کوئی مسلمان نظر آئے تو انہیں خبر کر دینا ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ ہمیں سکھوں اور نوجوانوں کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور ہم لوگ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ قصہ مختصر ہم دن بھر وہیں دُبکے رہے اور رات بھی وہیں گزری۔

صبح ہوئی تو کوٹھی کے مکین جو رائے صاحب کہلاتے تھے اور غالباً ریاستی عدالت کے بڑے جج تھے، اپنی بیٹی اور بیوی کے ہمراہ ہمیں دیکھنے کے لئے آ گئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اس بدقسمت گاڑی سے بھاگ کر آئے ہیں جس پر بلوائیوں نے حملہ کر کے پاکستان جانے والے تمام مسافروں کو تہہ تیغ کر دیا ہے۔ رائے بہادر نے ہماری داستان سنی تو ان کی آنکھوں میں آنسو گئے، انہوں نے ہمیں تنبیہ کی کہ کسی کے استفسار پر یہ نہ بتائیں، کیونکہ گاڑی سے بچ کر آنے والوں کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوٹھی میں رہنا ان کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بلوائیوں کا گاؤں یہاں سے دُور نہیں اور اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ رائے بہادر کے گھر میں دو مسلمان لڑکیاں اور ایک لڑکا پناہ گزین ہے تو وہ اہل خانہ کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے، انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں کسی تاخیر کے بغیر کیمپ چلے جانا چاہئے۔

اسی روز رائے بہادر نے کیمپ کے منتظمین سے فون پر رابطہ قائم کیا اور انہیں بتایا کہ وہ مسلمان بچیوں اور ایک لڑکے کو کیمپ میں بھجوانا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد فوجی کیمپ سے چند لوگ آ گئے اور ہمیں جیپ پر بٹھا کر ساتھ لے گئے۔ رائے بہادر نے ہمیں بہت تسلی دی اور کہا کہ ہماری خیریت معلوم کرنے کے لئے اپنے نوکر کو کیمپ میں بھیجتے رہا کریں گے اور واقعی جب تک ہم کیمپ میں رہے، رائے بہادر کا ملازم باقاعدگی سے آتا رہا اور ہماری ضروریات کے بارے میں استفسار کرتا رہا۔ رائے بہادر کی انسان دوستی اور دردمندی آج تک یاد ہے اور جب بھی 14 اگست کا دن آتا ہے، قتل و غارت کے واقعات کے ساتھ ساتھ

معمر سکھ اور رائے بہادر کی مہربانیوں اور شفقتوں کا ضرور خیال آتا ہے۔

ہم کیمپ میں مقیم تھے کہ والد صاحب کے ایک دوست ہمیں ڈھونڈتے ہوئے وہیں آ گئے اور اپنے ساتھ گھر لے گئے اور ان کی زبانی پتہ چلا کہ والدہ دادی اور دوسرے رشتے دار جالندھر کیمپ میں پہنچ چکے ہیں اور خیریت سے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی جالندھر جانے کے لئے مچلنے لگا، لیکن زادراہ کے بغیر وہاں جانے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مشکل والد صاحب کے دوست نے گھر کا سامان فروخت کر کے حل کر دی اور ایک سکھ ڈرائیور کو 500 روپے کے عوض جالندھر کے لئے تیار کر لیا۔ چند اور خاندانوں نے بھی اسے فرداً فرداً اتنی ہی رقم ادا کی اور پھر 20 لاریوں پر مشتمل ایک قافلہ جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ قافلے کی حفاظت ہندو ملٹری کے سپرد تھی اور فوجی جیپیں قافلے کے آگے پیچھے چل رہی تھیں، لیکن جونہی ریاست کی حدود ختم ہوئی قافلہ رُک گیا۔ پتہ چلا کہ آگے بلوائی کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس مقام پر فوجیوں اور بلوائیوں کے درمیان گفتگو ہوئی اور سکھوں نے کچھ کہے بغیر ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہندو ملٹری اور سکھ بلوائیوں کے درمیان مال کی تقسیم پر سمجھوتہ نہیں ہو سکا تھا۔ خدا نے ہماری مدد کی اور جالندھر چھاؤنی کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ اس کیمپ کی حفاظت پاک فوج کے جیالے سپاہی اور افسر کر رہے تھے، انہوں نے لاوارث عورتوں اور بچوں کو سب سے پہلے لاہور بھجوا دیا، اس قافلے میں ہم دونوں بھائی بہن بھی تھے۔

ہم چند روز تک والٹن کیمپ میں رہے اور پھر لاہور میں مقیم ہمارا چچا آیا اور ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ چچا نے بتایا کہ ہمارے والدین پاکستان پہنچ چکے ہیں۔ راستے میں بچھڑے ہوئے دو بھائی بہن بھی والدین کے پاس ہیں، یہ پتہ نہیں چل سکا، کہاں ہیں اور کس کی پناہ میں ہیں، آخر کار ان کا سراغ بھی مل گیا اور چچا انہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ میں نے ماں کو دیکھا کہ وہ بہت بیمار تھیں اور نقاہت سے بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے ہمارے بچھڑنے کے صدمے کو جسم و جان کا روگ بنا لیا تھا۔ بس یہی کہتی تھی کہ بچوں کو ایک نظر دیکھ لوں تو زندگی کے آزار سے جان چھڑا لوں گی اور ایسے ہی ہوا، ہم چاروں بھائی بہن

ان کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور دادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیشہ کی نیند سوگئی۔ اچھرہ کے قبرستان میں ماں کی قبر 1947ء کے خونیں فسادات کی یاددلاتی رہتی ہے۔

ہمارے بعد ماں باپ، بھائی اور دادی پر کیا گزری، یہ ایک الگ داستان ہے، کہتے ہیں کہ کپورتھلہ سے پاکستان آنے والی گاڑی کو بلوائی تین روز تک لوٹتے اور نوچتے رہے۔ انہوں نے سینکڑوں نوجوانوں کو قتل کیا اور متعدد عورتوں اور بچوں کو اغوا کر کے لے گئے، بس وہی زندہ بچے جو لاشوں کے نیچے چھپ گئے تھے۔ چوتھے روز فوج آ گئی اور بچے کھچے مہاجروں کو ٹرکوں میں سوار کر کے جالندھر لے گئے۔ ان بچے کھچے مسلمانوں میں میری والدہ، دادی اور چھوٹا بھائی بھی تھا۔ چھوٹا بھائی اس طرح ماں کے پاس پہنچ گیا تھا کہ وہ میرا ہاتھ چھڑا کر پیچھے کی طرف بھاگا اور خوش قسمتی سے دادی نے اسے دیکھ لیا اور انہوں نے شور مچایا تو کسی پڑوسی نے بچے کو ڈھونڈ کر ان تک پہنچا دیا۔ اس قافلے میں والد صاحب بھی شامل تھے، لیکن وہ یہ سوچ کر فوجی ٹرک سے نیچے اُتر گئے کہ ہم دونوں بہنوں اور بھائی کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ وہ ہندو بلوائیوں سے بچتے بچاتے کیمپ تک پہنچ گئے، لیکن ہمیں وہاں نہ پا کر جالندھر چلے گئے تھے، انہیں یہاں بھی نہ ملے تو آنسو بہاتے ہوئے لاہور آ گئے تھے۔

ریاست کپورتھلہ میں بچھڑی ہوئی میری چھوٹی بہن کی سرگزشت یہ ہے کہ وہ بھگدڑ میں کہیں سے کہیں جا پہنچیں۔ درختوں کے ایک ذخیرے میں بیٹھی رو رہی تھی کہ ایک سکھ کسان کا ادھر سے گزر ہوا، اس نے روتی بچی کو پچکار دلاسہ دیا اور اپنے گھر لے گیا۔ صبح ہوئی تو اپنی بیوی کو ساتھ لیا اور میری بہن کو اپنی بیٹی ظاہر کر کے کپورتھلہ لے آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے کیمپ کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا اور بچی کو ان کی سپرداری میں دے دیا۔ کیمپ میں ہمارے علاقے کا ایک خاندان بھی مقیم تھا، اس خاندان کی عورتوں نے میری بہن کو دیکھا اور اپنی تحویل میں لے لیا اور وہی خاندان اسے پاکستان لے کر آیا تھا۔ دُکھ آج تک خون کے آنسو رُلاتا ہے کہ ریاست پٹیالہ میں رہائش پذیر ہمارا چچا پاکستان نہ آ سکا۔ ہندو بلوائیوں نے میاں بیوی کو قتل کرنے کے بعد آگ میں جلا دیا تھا۔

کپورتھلہ شہر کے نواح میں قافلے کا قتل عام

ٹرین کے حادثے میں اگرچہ شہر کے بہت سے مسلمان مارے گئے، مگر شہریوں کی اکثریت ٹرین میں سوار نہ ہونے کی وجہ سے بچ گئی، لیکن ان کے حوصلے اور شہر کا دفاع اس سے ضرور متاثر ہوا۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ چوکنا اور ہوشیار ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی محفوظ طریقے سے جالندھر کیمپ تک پہنچنے کی ترکیبیں بھی سوچی جانے لگیں، کیونکہ شہر کے مسلمانوں کے لئے دن بدن خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

کپورتھلہ کے دیہات خصوصاً تحصیل سلطان پور کے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے ایک نیا جال تیار کیا گیا اور سلطان پور اور اردگرد کے دیہات میں اعلان کرا دیا گیا کہ پاکستانی آرمی کی حفاظت میں ایک قافلہ پاکستان جائے گا۔ لہٰذا تمام مسلمان ایک مقررہ تاریخ پر اور مقررہ مقام پر جمع ہو جائیں۔ چنانچہ تقریباً ایک لاکھ نفوس پر مشتمل ایک بہت بڑا قافلہ تیار کیا گیا۔ جب یہ قافلہ روانہ ہوا تو ملٹری کی چھ جیپیں اس کے ہمراہ تھیں، جنہیں دیکھ کر لوگوں میں تحفظ کا بے پناہ احساس پیدا ہو گیا۔ یہ قافلہ جہاں جہاں سے گزرا، وہاں کے مسلمان بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ مگر جونہی دوپہر کے قریب یہ قافلہ شہر کپورتھلہ کی شہر پناہ کے قریب پہنچا، اس پر ہر طرف سے ہلہ بول دیا گیا۔ دوپہر سے مغرب تک اس قافلے کا قتل عام جاری رہا۔ شہر پناہ کے قریب اس قتل عام کا مقصد شہر کے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنا اور انہیں شہر سے بھاگنے پر مجبور کرنا تھا۔

شام کو جب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا ہنگامہ ختم گیا اور سکھ مسلمانوں کے مال و اسباب سے لدے ہوئے گڈے لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو شہر کے چند نوجوان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر زخمیوں اور شہیدوں کی دیکھ بھال کے لئے اس سڑک پر پہنچے، جہاں دن بھر وحشت و بربریت رقص کرتی رہی تھی۔ وہاں ہزاروں لاشیں اور سینکڑوں زخمی پڑے تھے۔ یہ نوجوان رات بھر زخمیوں کو شہر پہنچاتے اور شہداء کو بڑے بڑے گڑھے کھود کر ان میں بے گور و کفن دفن کرتے رہے۔ جو زخمی شہر میں لائے گئے تھے، ان میں سے بھی

زیادہ تر بعدازاں مرتبہ شہادت کو پہنچے۔

یہاں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ اس نہتے قافلے کے ساتھ ملٹری کی جو جیپیں تھیں وہ واقعی ریاستی آرمی کی تھیں، مگر وہ دن بھر شہر کی طرف اپنی مشین گنوں کا رخ کر کے چاند ماری میں مصروف رہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ شہر کے مسلمان کہیں اس قافلے کی امداد کو نہ پہنچ جائیں۔ میں اپنے ماموں کے ساتھ اپنے مکان کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی کی اوٹ سے یہ قیامت خیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی جیپ پر موجود ملٹری والوں نے ہمیں کھڑکی میں کھڑے دیکھ لیا تھا کہ مشین گن کی ایک پوری باڑ ہماری کھڑکی پر پڑی اور کھڑکی کے شیشوں اور تختوں کے پرخچے اُڑ گئے، مگر ہمیں دیوار کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے کوئی گزند نہ پہنچا۔ پھر تو ہم وہاں سے ایسے بھاگے کہ دوبارہ اُدھر جانے کی جرأت نہ کر سکے۔

......☆......

تعارف

حضرت مولانا محمد یوسف مجاہد الحسینی

حضرت مولانا محمد یوسف مجاہد الحسینی، فاضل دارالعلوم ڈابھیل، بمبئی برصغیر پاک و ہند کی معروف مذہبی، دینی، علمی شخصیت، بزرگ صحافی، ادیب اور شاعر اور کتابِ سیرتؐ پر اوّلین صدارتی ایوارڈ یافتہ مصنف اور پاکستان کے معروف اخبارات روزنامہ "آزاد"، "نوائے پاکستان" ہفت روزہ "خدام الدین" اور ماہنامہ "صوت الاسلام" کے مدیر رہ چکے ہیں۔ بے شمار کتب کے مصنف اور پاکستان کے تقریباً تمام معروف اخبارات میں آپ کے رشحاتِ قلم شائع ہوتے رہتے ہیں۔ 92 سال کی عمر میں بھی ماشاء اللہ قابل رشک صحت کے مالک ہیں اور ہمہ وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔

تحریکِ آزادی کے وقت آپ آپ بطورِ استاد خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے سلطان پور کے ہندو سکھ آپ کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ ہجرت کے وقت ان پر جو گزری، اُس کی داستان انہوں نے میری خصوصی درخواست پر رقم کی ہے، جس کے لئے میں ان کا دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں۔

(مرتب)

ایک خونیں داستاں

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے

برصغیر پاک و ہند کے بعض اعلیٰ درجے کے مقامات

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے کرشمے مختلف انسانوں، آبادیوں، خطوں اور علاقوں میں جلوہ گر ہیں، انسان ہیں تو اس میں گورے بھی ہیں، کالے بھی، بلند قامت اور پستہ قد بھی، پہاڑ ہیں تو بلند و بالا اور فلک بوس بھی، سرسبز و شاداب بھی اور خشک پتھروں کے ڈھیر بھی، گل پوش وادیاں اور صحت افزا مقامات بھی اور بنجر و بے آب و گیاہ علاقے بھی، دریائی اور نہری علاقے بھی بارانی اور بیکار بھی، میٹھے پانی والے بھی اور کڑوے پانی والے بے آباد اور شور زدہ بھی۔

غرضیکہ برصغیر پاک و ہند میں بھی بعض علاقے فرزندانِ اسلام کی اکثریت کے اور بعض اقلیت کے بعض آبادیاں مسلم اور غیر مسلم کے تناسب سے مساوی بھی تھیں، پھر یہ براعظم ایشیا کا سب سے بڑا اور آباد و شاداب علاقہ تھا، اسے سرزمین ہند و سندھ، ہندوستان اور انڈیا بھی کہتے تھے، عقائد و نظریات اور مذاہب کے اعتبار سے یہاں پر بدھ مت، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی وغیرہ آباد تھے، ہندوستان میں قریباً ایک ہزار سال تک مسلمان حکمراں رہے تھے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس وسیع علاقے میں کبھی مسلم اور غیر مسلم فسادات برپا نہیں ہوئے تھے، مختلف ریاستوں کے حکمران اگر کسی دوسری ریاست کے خلاف برسرِ پیکار ہوتے تو مذہب یا فرقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ مادی مفادات کے حصول یا اپنی سلطنت اور حکمرانی کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے ہوئے تھے۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ شاہد ہے کہ مغلیہ مسلم سلطنت پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لئے برطانوی سامراج اور طاغوتی طاقت نے مسلمانوں پر بے حد ظلم ڈھائے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں ان سمندر پار انگلستان سے آئے ہوئے فرنگیوں نے جذبۂ انتقام کے تحت تحریک آزادی میں حصہ لینے والے ہندوستانیوں خصوصاً علماء کرام کو چن چن کر پھانسیوں پر لٹکا دیا تھا اور ہندوستانی باشندوں کو خوف زدہ کرنے کی خاطر ان بہادر مذہبی پیشواؤں کو سڑکوں کے کنارے کھڑے درختوں کی شاخوں کے ساتھ دار و رسن کے لرزہ خیز

اور ہولناک مظاہرے کئے تھے، ان عیسائی حکمرانوں نے تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے صرف پھانسیوں اور قید و بند کے ہتھکنڈے ہی استعمال نہیں کئے تھے، بلکہ ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنے اور باہم دگر لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے تھے، ان میں سب سے موثر حربہ ہندو مسلم فسادات کا تھا جسے انگریزوں نے حکومتی اسباب و ذرائع کے ساتھ پروان چڑھایا اور سارا ملک ان فسادات کے ہلاکت خیز شعلوں کے حوالے کر دیا گیا تھا، رفتہ رفتہ بہار اور نواکھلی کے بعد یہ آگ ہمہ گیر ہوگئی، ادھر مختلف مذاہب اور سیاسی نظریات کے لیڈر بھی گھناؤنے حالات پر قابو پانے میں بے بس نظر آتے تھے، چنانچہ فرنگی سامراج نے اپنی منافرت خیز پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت آکاس بیل کا ایسا ٹکڑا پھینکا کہ اس کی لپیٹ میں آکر ہندوستان کا سرسبز و شاداب ماحول میں آکاس بیل کی بے برگ و ثمر شاخوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، ایسے گھناؤنے حالات میں بالآخر ہندوستان ''مسلم اور غیر مسلم'' آبادیوں کی بنیاد پر تقسیم ہوگیا، نیز اقلیت اور اکثریت کا فیصلہ بھی اسی فرنگی سامراج کے مقرر کردہ کمیشن ریڈکلف کے بے رحم ہاتھوں میں دیا گیا تھا، جس نے اپنے مفادات کے تحفظ اور ہندو اکثریت کی خوشنودی ملحوظ رکھ کر ایسی بندر بانٹ کی کہ برصغیر کے مسلمان افسوس ناک تقسیم در تقسیم کا شکار ہو گئے، جبکہ انگریزوں (برطانوی سامراج) نے حکومت مسلمانوں سے چھین کر غاصبانہ قبضہ جمایا تھا، لیکن اس نے ہندوؤں کی بہت بڑی سلطنت یکجا قائم کر دی اور مسلمان تین ایسے مقامات میں تقسیم کر دیئے گئے جن کے مابین رابطے کا براہ راست قطعاً کوئی راستہ نہیں تھا، ان میں سے مسلم مملکت پاکستان کے دو حصے مشرقی اور مغربی پاکستان تھے جن کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے۔ مشرقی پاکستان کا علاقہ موجود بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان (پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان) چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ تیسرا مسلم اکثریت کا علاقہ یوپی پر مشتمل ہندوستان کے اندر گھرا ہوا ہے جس کی آبادی پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں علاقوں سے اس وقت سے لے کر آج تک سب سے زیادہ ہے، اسے پاکستان سے الگ کر دیا گیا اور وہاں کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

ریاست کپورتھلہ۔ مسلم اکثریت کا خطہ

ریڈ کلف کمشن نے ہندوستان کی تقسیم نہایت بے رحمانہ اور متعصبانہ بے انصافی کے ساتھ کی جس کا مقصد صرف مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا کرنا تھا، چنانچہ متحدہ پنجاب اور بنگال کے ٹکڑے کردیئے گئے۔ پنجاب کے اضلاع میں سے ضلع گورداسپور پہلے پاکستان میں شامل کیا گیا تھا، مگر بعد میں ہندوستان کا حصہ بنادینے کا فیصلہ کرلیا گیا، اس لئے تاکہ جموں اور سری نگر مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان کے بجائے بھارت کا حصہ بن جائے اور مسلمانوں کے لئے ایک دائمی پریشان کن جھگڑا کھڑا کردیا جائے، اس طرح مسلم اکثریت کا علاقہ کشمیر بھی ہندوؤں کی تحویل میں دینے کی اساس فراہم کردی گئی تھی اور اگر گورداسپور کا ضلع ابتدائی فیصلے کے مطابق پاکستان میں ہی شامل رہتا تو لازماً امرتسر کا ضلع بھی پاکستان کے حوالے کرنا پڑتا، جس کی سرحد اگر دریائے بیاس قرار دی جاتی تو مسلم اکثریت کی بنا پر پاکستان کا حصہ قرار دیئے جانے والے علاقے پوری ریاست کپورتھلہ جس میں پچھتر فیصد مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جالندھر سے آگے پھلور کی تحصیل کپورتھلہ میں شامل تھی، اسے لازماً مسلم اکثریت میں شامل کرنا پڑتا تو ضلع ہوشیار پور کے ساتھ ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر اور اس سے ملحقہ تحصیل زیرہ ضلع فیروزپور وغیرہ سارا علاقہ مسلم اکثریت کا تھا، اس بناء پر متحدہ پنجاب کی تقسیم اگر مجبوراً منظور کرنی ہی تھی تو دریائے ستلج کو حد فاصل قرار دینا ضروری تھا، بہرنوع۔ مشرقی پنجاب کا علاقہ اگر بنگال کے عوض قبول کرلیا جاتا تو علامہ اقبال کے مجوزہ پاکستانی نقشے کے مطابق مسلم اکثریت کے علاقے یوپی سے لے کر افغانستان اور ایران کی سرحد تک ایک عظیم مسلم مملکتِ پاکستان معرضِ وجود میں آجاتی اور دُنیائے اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، مگر وائے افسوس کہ غیر مسلم شاطر (ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں) کی سازشوں اور شاطرانہ چالوں کا تحریکِ قیامِ پاکستان کا بانی محمد علی جناحؒ اپنے بڑھاپے اور بیماری کے باوجود تن تنہا مقابلہ کرتا رہا، اگر ذاتی اقتدار کے حصول کے متمنی اور شوقین قائداعظمؒ کے رفقاء کا دوراندیشی اور اُمت مسلمہ کے مفادات کے تحفظ کی خاطر سرگرم عمل

ہوتے اور مخلصانہ جذبات کے ساتھ قائداعظمؒ کا ہاتھ بٹاتے تو یقیناً مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کی مشکلات کم ہوسکتی تھیں اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سرزمینِ ہند کا سرسبز شاداب کچھ تو علاقہ مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں آجاتا۔ مگر تعلیم و تہذیب فرنگ سے آراستہ یہ لیڈر اُمت مسلمہ کے وسیع تر مفاد اور مسلمانوں کے وجود کے تحفظ کی خاطر کیونکر سرگرم عمل ہوسکتے تھے، علامہ اقبالؒ نے انہی کی نشاندہی میں کہا ہے۔

ترا وجود سراپا تجلی اُفرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

غرضیکہ برطانوی شاطروں اور قمار بازوں کی مسلم دشمنی کا واضح ثبوت ہندوستان کی نامنصفانہ تقسیم ہے اور ہندو علاقے میں گھری ہوئی مسلم ریاستوں (حیدرآباد دکن، بھوپال، ملیرکوٹلہ کشمیر جوناگڑھ وغیرہ کے دوش بدوش ریاست کپورتھلہ کی مسلم اکثریت کے ساتھ جو ظلم و جبر ہوا، ناقابل بیان ہے جیسا کہ ابتدائی سطور میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر بعض علاقے ایسے بنائے ہیں جنہیں قدرتِ کاملہ کے حیرت انگیز کرشمے کہا جاتا ہے، انہی میں سے ریاست کپورتھلہ تھی جس کا محل وقوع دوآبہ یعنی دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیان کا حصہ ہے، اس کا سربراہِ حکومت اگرچہ سکھ تھا، لیکن پوری آبادی کے باشندے مسلم اکثریت سے تعلق رکھتے تھے، اس ریاست میں بئن سیاہ کے نام سے کلو اور چنبہ کے پہاڑوں سے ایک ندی جاری تھی، سردیوں میں اس کا پانی گرم ہوتا تھا جس کا سبب اس ندی کا گندھک ملے پہاڑی حصے سے گزرنا بتایا جاتا تھا، مشرقی پنجاب میں کپورتھلہ بہت ہی خوبصورت، خوشنما اور صاف ستھرا مثالی شہر تھا۔ کھلے بازار کی دکانیں یکساں ڈیزائن کی تعمیر شدہ تھیں، جلوخانے کے نام سے عجائب گھر، شالامار باغ، رانددھیر کالج اور بادشاہی مسجد قابل دید تھیں۔ مہاراجہ کپورتھلہ جگت جیت سنگھ چونکہ زیادہ تر وقت عرب علاقے خصوصاً تیونس، مراکش اور اندلس میں گزارتا تھا، اس لئے عربی زبان پر عبور کے علاوہ وہاں کی تعمیرات کا بہت گرویدہ تھا۔ چنانچہ کپورتھلہ ریلوے اسٹیشن کے باہر وسیع و عریض رقبے پر عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی تھی جس کا طرزِ تعمیر اندلس اور غرناطہ کی

مسجدوں کی تعمیرات کا آئینہ دار ہے، اس جامع مسجد کی خوشنما اومنفردانہ تعمیر کے آغاز پر 1926ء میں نواب بہاول پور سے اس کا سنگ بنیاد رکھوایا تھا اور تکمیل پر ہندوستان بھر کے مسلم ریاستوں کے نواب اور غیر مسلم ریاستوں کے حکمران شریک ہوئے تھے، کپورتھلہ شہر سے باہر تھوڑے ہی فاصلے پر بئیں سیاہ (ندی) پر چھوٹا سا ڈیم ''کانجلی'' کے نام سے بنوایا گیا تھا، جس سے نہر نکال کر اس پر پن چکیاں (گھراٹ) نصب کی گئی تھیں۔ان پن چکیوں کا آٹا لذیذ اور صحت آفرین ہوتا تھا۔راجہ کپورتھلہ کا محل بھی قابل دید تھا، راجہ صاحب داڑھی مونڈے سکھ تھے، بڑے دانشمند، جہاں دیدہ اور مرنجاں مرنج تھے، اس کے دور حکومت میں کبھی ہندو مسلم فسادات برپا نہیں ہوئے، سوائے ایک واقعے کے جو 1930ء میں سلطان پور لودھی کے محلّہ چھینیاں کی سڑک پر بڑ کے درخت کی بڑی شاخ کے نیچے سے گزرنے والے تعزیے کے جلوس پر گولی چلانے پر رونما ہوا تھا جس کا پس منظر یہ تھا کہ دسویں محرم کو شہر کے تعزیہ دار شیعہ اپنے محلے سے تعزیہ اُٹھا کر غلہ منڈی کی طرف لے جایا کرتے تھے، شروع میں وہ شاخ چھوٹی تھی جب وہ مضبوط تنے کی شکل اختیار کر گئی اور حسب معمول اس سال بھی شیعہ حضرات کا جلوس وہاں آیا تو بڑ کی وہ شاخ سڑک عبور کر چکی تھی، اہل جلوس نے وہ شاخ کاٹنے کو کہا، سکھوں اور ہندو اہل محلّہ نے کہا کہ یہ بڑ کا درخت ہمارے گورو کی یادگار ہے، اسے ہرگز کاٹا نہیں جاسکتا، آپ تعزیے کا اُوپر والا حصہ اُتار کر شاخ کے نیچے سے گزر جائیں اور بعد میں اُوپر رکھ لیں، مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے، پھر جلوس والوں سے کہا گیا کہ یہاں سے سڑک اکھاڑ کر نیچے کر لی جائے اور تعزیہ گزارنے کی راہ نکالی جاسکتی ہے، مگر تعزیہ دار نہ مانے دونوں فریق کی ضد اور ہٹ دھرمی ہلاکت خیز گولی چلنے پر منتج ہوئی، جس کے نتیجے میں سینکڑوں مسلمان جاں بحق ہو گئے تھے۔

اس واقعے کو پوری تفصیل کے ساتھ چودھری افضل حق (ممبر لیجسلیٹو کونسل انڈیا) نے اپنی کتاب ''تاریخ احرار'' میں دیگر مسائل کپورتھلہ کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

سلطان پور لودھی کی تاریخ حیثیت

ریاست کپورتھلہ (ضلع جالندھر) کی سب سے بڑی تحصیل سلطان پور لودھی تھی، کھجوروں کے جھنڈ اور ندی کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے سرسبز شاداب اور ہر قسم کی فصلوں، خصوصاً گندم، مکئی، باجرہ اور چنے وغیرہ اشیاء خوردنی کا حسین مرکز تھی، شہر کی غلہ منڈی پورے متحدہ پنجاب کی بڑی منڈیوں میں شمار ہوتی تھی، کپڑے کی چھپائی کی وجہ سے لوگ چھینٹاں والا شہر کے نام سے یاد کرتے تھے، اس شہر کو ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت میں آباد کیا گیا تھا، بعض حضرات کی رائے ہے کہ شہر لودھیوں کے دورِ حکومت میں سکندر لودھی نے تعمیر کرایا تھا، اس شہر میں مغلیہ دور کے طرزِ تعمیر کے مطابق چھوٹی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں، اس کا تذکرہ ''آئین اکبری'' میں بھی مفصل موجود ہے۔ 1739ء میں نادر شاہ افشار کے حملے کے دوران اس کی بہت تباہی ہوئی، شیر شاہ سوری کے عہد میں اس کی تعمیر نو ہوئی تھی۔ چنانچہ بئیں سیاہ پر شہر کے مغربی جانب ایک پختہ اینٹوں سے پل تعمیر کیا گیا تھا، جس کا ابتدائی شکستہ حصہ اب بھی موجود ہے (ممکن ہے ہماری ہجرت کے بعد اسے توڑ دیا گیا ہو) اسی پل کے آخری حصے کے ساتھ ہی ''حدیرہ'' نامی ایک عجیب وغریب کئی منزلہ عمارت ہے، جس میں تعمیری بھول بھلیاں تھیں، بچپن میں ہم بھی اسی عمارت میں کھیلنے جایا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر عمارت کی چھوٹی چھوٹی اندھیری کوٹھڑیوں میں چھپنا کھیلتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ یہ مسافروں کے لئے آرام گاہ تھی، نیز یہ شہر اس بڑی شاہراہ پر واقع تھا جو شیر شاہ سوری نے تعمیر کی تھی، دہلی اور پشاور کے درمیان یہ بڑے اہم تجارتی اور علوم اسلامیہ کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور مسلم سلاطین کے دور میں بارونق اور مثالی شہر تھا۔ اکبری دربار کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ملا عبداللہ سلطان پوری اسی سرزمین کے باشندہ تھے، جن کی وجہ سے سلطان پور لودھی دینی، علمی اور ادبی لحاظ سے مشہور تھا، اسی دور میں ضلع ہوشیار پور کے گاؤں شام چوراسی کا ایک ہندو دیوان بوہڑمل کاردار کھتری سرہند شریف میں مالیہ وصول کرنے پر مامور تھا، نرینہ اولاد نہ تھی، حسن اتفاق سے ایک مرتبہ

حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندی کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے محبت وشفقت سے فرمایا کہ اس بندے پر اللہ کا خاص کرم ہونے والا ہے۔ چنانچہ 29 رمضان 1028ھ 3 اگست 1619ء کو اللہ نے اس بوہڑمل کھتری کو لڑکا عطا کر دیا۔ جسے اس کے والد نے ایک مسلمان استاد سے تعلیم دلائی وہ باشعور ہو کر مسلمان ہو گیا، عبدالنبی نام رکھا گیا جو سلطان پور لودھی کے ملا عبداللہ کے مرید اور خلیفہ تھے، علاوہ ازیں اورنگ زیب اور دارالشکوہ نے اپنی ابتدائی تعلیم اس شہر کے اتالیق سے حاصل کی تھی، جن کی رہائشی سہولت کے لئے شہر کے بلند ٹیلے پر تاریخی قلعہ نما سرائے جہانگیر تعمیر کی گئی تھی، اس کے بڑے دروازے کے سامنے بہت بڑے رقبے پر شاہی عیدگاہ تھی، جس میں انجمن تعلیم القرآن کے زیر اہتمام مدرسہ اور سکول قائم تھا، راقم الحروف نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جہاں تک میری مشاہداتی معلومات کا تعلق ہے، اس میں مولانا محمد علی جالندھری (ناظم اعلیٰ مجلس ختمِ نبوت پاکستان) مولانا محمد احمد فاضل دیوبند، مولانا عبدالعزیز فرید سرائی فاضل دیوبند، مولانا قاری لطف اللہ رائے پوری فاضل جامعہ ڈابھیل، مولانا محمد اسماعیل فرید سرائی فاضل دیوبند اور راقم الحروف (فاضل دارالعلوم ڈابھیل) صدالمدرسین کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کے ناظم نشرواشاعت اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اوّلین ساتھی مستری محمد صدیق بھی مودودی صاحب سے علیحدگی اختیار کر کے اسی عیدگاہ کے ایک کمرے میں اپنی بیوی اور بیٹے فضل الرحمٰن کے ساتھ قیام پذیر ہوئے تھے، راقم الحروف کو اپنے طالب علمی کے اور بعد کے دور میں اسی جگہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، آغا شورش کاشمیری اور مفسر قرآن مولانا ابوصالح محمد مصلح حیدرآبادی کا خطاب سننے کا موقع ملا تھا، علمی و ادبی کئی شخصیات یہاں قیام فرما ہوئیں، جن میں حکیم شاہنواز بابو عبدالعلی اور فضل الدین انجم رومانی، اختر حسین مرزا، حضرت مولانا سید اشرف علی خلیفہ مجاز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے اسماء گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

تاریخی مساجد:

مسلمانوں کی سب سے بڑی مسجد عیدگاہ تھی، علاوہ ازیں پنڈوری کمبوواں، محلہ تیلیاں، محلہ لوہاراں، محلہ چوڑیگراں کی مساجد کے علاوہ مین بازار میں بڑے پیر صاحب کی مسجد، ہائی سکول کی مسجد، مسجد نصیر احمد شاہ، مسجد ریلوے روڈ نزد مکان پیر سید ضیاء الدین شاہ، مسجد معماراں، مسجد موری محلہ اور دیگر مختلف محلوں میں کئی عظیم الشان مسجدیں تھیں، جن میں دینی مدارس قائم تھے، ان میں جامع مسجد چوڑیگراں میں عیدگاہ کے بعد بڑا مدرسہ قائم تھا، علاوہ ازیں شہر کے مختلف محلوں میں بھی عالی شان مسجدیں موجود تھیں، جن سے شہر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ عبادت گاہوں کا وجود ہی لوگوں کے مذہبی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

بہرنوع عبادت گاہوں کا تذکرہ ضمناً آگیا ہے، اصل مسئلہ یہ تھا کہ ریاست کپورتھلہ خصوصاً سلطان پور لودھی شہر اور اردگرد کے دیہات میں مسلمانوں ہی کی اکثریت تھی اور یہ تذکرہ بھی معلومات افزا ہوگا کہ تحصیل سلطان پور میں شہر کے علاوہ کسی بھی دیہات میں نہ تو ہندوؤں کا کوئی مندر تھا اور نہ ہی سکھوں کا کوئی بڑا گوردوارہ تھا، البتہ ضلع جالندھر کی حدود میں سکھوں کے دیہات اور بعض جگہ چھوٹے چھوٹے ''گوردوارہ نما'' مکانات کے صحن میں جھنڈے نصب کر کے عبادگاہیں بنائی گئی تھیں، چنانچہ کسی جگہ بھی ''مسلم اور غیر مسلم'' کا تنازعہ اور مذہبی فساد برپا نہ ہوتا تھا۔

ریاست کپورتھلہ میں مسلم اکثریت کی وجہ سے سکھ مہاراجہ نے اپنا وزیراعظم مسلمان مقرر کر رکھا تھا، سلطان پور شہر کی سیاسی قیادت بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، بلدیہ کے آخری چیئرمین چودھری فضل محمد کمبوہ تھے جن کے برادر اکبر چودھری فتح محمد کمبوہ انجمن تعلیم القرآن کے صدر اور مجلس احرار اسلام کے رہنما تھے، شہر کے علاوہ اس تحصیل میں تلونڈی چودھریاں مسلم زمینداروں کا گڑھ تھا، وہاں کے رانا محمد انور علی خاں والی بال کے اچھے کھلاڑی تھے، قیام پاکستان کے بعد یہ لوگ فیصل آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ انور علی خاں ایم این اے بھی منتخب ہوئے اور برادری کے دیگر افراد میں چودھری محمد ظفر علی خاں،

حاجی عبدالرؤف خاں، چودھری ظفر علی خاں کے ماموں سکندر علی خاں مہاراجہ کپورتھلہ کے ذاتی دوست تھے، چودھری سجاد حیدر ولد چودھری ظفر علی خاں ان دنوں تحریکِ انصاف کے مرکزی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں، تلونڈری چودھریاں اور بیگووال دو قصبے ایسے تھے جن کے باشندے ریاست کپورتھلہ میں گہرا سیاسی اثر رکھتے تھے، ان کے علاوہ تحصیل سلطان پور کے چودھری نعمت علی نمبردار بھاگو آرائیں، صوبیدار عنایت محمد خان موٹھانوالوی، میاں محمد افضل رائے پوری امیر جماعت اسلامی، چودھری عبدالعزیز اور کرنل عزیز احمد آزاد ہندفوج یہ دونوں حضرت بیگووال سے تعلق رکھتے تھے، مسلم لیگ کے قطب الدین چشتی، خاکسار کے فضل محمد اور ذاتی حیثیت سے مرزا سیادش بیگ سلطان پور کی نامور شخصیات تھیں۔

خون کا پہلا قطرہ:

ہندوستان چھوڑ دو! لے رہیں گے آزادی، بن کے رہے گا پاکستان اور اس نوعیت کے دوسرے نعرے جوں جوں زور پکڑ رہے تھے، آزادی کی منزل جوں جوں قریب تر ہو رہی تھی، اسی دوران مختلف مقامات سے بے گناہ اور مظلوم انسانوں کی دلدوز چیخوں، فریادوں اور ان کے کراہنے اور سسکیاں لینے کی آوازیں بھی مختلف ذرائع سے سنائی دے رہی تھیں، ہندوستانی اپنے ہی ہم وطن ہندوستانیوں کی گردنیں گاجر مولی کی طرح بے دریغ کاٹ رہے تھے، مختلف شہروں اور مقامات میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بلا امتیاز مذہب ملت خاک اور خون میں تڑپایا جا رہا تھا۔ عورتوں نوجوان لڑکیوں کی عصمتیں تار تار ہو رہی تھیں، معصوم بچوں کو برچھے کی نوک میں پرو کر اچھالا جا رہا تھا۔

غرضیکہ ہندوستان کا خرمن امن ہندو مسلم فسادات کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمیں کیوں قتل کیا جا رہا ہے؟ ہر جگہ خون کی ہولی کیوں کھیلی جا رہی ہے؟ انسانی خون ندی نالوں کی مانند کیوں بہایا جا رہا ہے؟ بس قیامت کا منظر دکھائی دیتا تھا، ایسے نازک اور گھمبیر حالات کی سنگینی کے پیش نظر دیگر مقامات کی طرح ریاست کپورتھلہ میں بھی امن کمیٹیاں قائم ہونے لگیں، لوگوں کو امن وسلامتی کا واسطہ دے کر انسانی جذبہ ترحم

اُجاگر کیا جانے لگا، سلطان پور میں بھی ایسی امن کمیٹیاں قائم ہو گئی تھیں، راقم الحروف بھی اس کا ممبر تھا، فسادات کی آگ کے شعلے ابھی ریاست کپورتھلہ کی فضا میں داخل نہیں ہوئے تھے، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں مستری محمد صدیق نے ترک شہر کر کے کپورتھلہ روڈ پر آدھی کھوئی کے مقام پر ''دائرہ امن وسلامتی'' کے نام سے اپنا الگ تھلگ مرکز قائم کر کے وہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔ مستری محمد صدیق کی اہلیہ محترمہ اور ایک چھوٹا لڑکا ان کے ساتھ تھا، اس درویش اور خرقہ پوش کی کٹیا، پوری ریاست میں منفرد تھی، مستری صاحب فرمایا کرتے تھے کہ موجودہ معاشرہ انسانی حدود سے نکل کر حیوانیت کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف مقامات پر ایسے مراکز قائم کئے جائیں، ضروریات زندگی کی چیزیں خود تیار کی جائیں، اس معاشرے سے ہم صرف نمک لیں گے، باقی تمام امور میں خود کفیل ہوں گے۔ مستری صاحب نے اس دائرہ امن وسلامتی کی دیواروں پر راقم الحروف سے خوشخط تحریر لکھوائی تھی۔ ''میں ان تمام طاغوتی طاقتوں (ہندوستان، برطانیہ، روس، امریکہ وغیرہ) کا باغی ہوں جنہوں نے خالق کائنات اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں، میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی احکم الحاکمین مانتا ہوں اور اس سے مدد کا طلب گار ہوں''۔

مستری محمد صدیق کا یہ اعلان درحقیقت ''کفر یا طاغوت'' کا آئینہ دار تھا، ان دنوں میں مستری صاحب اپنے اس مشن کی ہر ایک کو خصوصی طور پر نہایت مشفقانہ اور موثر انداز میں دعوت دیا کرتے تھے، ان کی یہ مساعی ریاست کپورتھلہ میں قیام امن وسلامتی کی ایک اچھی کوشش تھی، ان کے دوش بدوش جمعیت علماء ہند، مجلس احرار، خاکسار مسلم لیگ اور آزاد ہند فوج سے متعلق افراد بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق لوگوں کو پرامن رہنے اور فرنگی سامراج کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی خطرناک پالیسی سے باخبر رکھنے اور اپنا دامن فسادات کے شعلوں سے بچانے کے سلسلے میں کوششیں کیا کرتے تھے۔ لیکن فسادی لوگ حکومت کی شہ پر اپنی بری حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے دائرہ ''امن وسلامتی'' کے بانی اور محرک مستری محمد صدیق کی زندگی کا ''چراغ گل'' کر کے

اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کا پروگرام بنایا اور 22 مئی 1947ء کو بعد دوپہر سلطان پور کے ایک ہندو رئیس امرناتھ بھنڈاری کے لڑکے ''پرکاش چند'' امرناتھ برہمن کے پوتے ہری ڈیو دوسیوک سنگھی درندوں نے اس درویش خدا مست مستری محمد صدیق کے ''دائرے'' پر آکر ان سے پانی مانگا۔ غالباً ''آتش انتقام'' کی جلن سے ان کے سینے بھڑک اُٹھے ہوں گے، جسے وہ ٹھنڈا کرنے کی نادانستہ کوشش کررہے تھے، مستری صاحب نے اپنے پیار بھرے لہجے اور شفقت آمیز انداز میں انہیں تسلی دی کہ بھائی، بھی لاتا ہوں، مستری صاحب نے اپنے معمول کے مطابق مٹی کے پیالے میں ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ جسے انہوں نے پی لیا۔

مستری صاحب نے پھر پوچھا۔ ''بھائی اور چاہیے'' انہوں نے ''ہاں'' کہا۔

مستری صاحب ابھی پلٹے ہی تھے کہ ان میں سے ایک خونخوار بھیڑیے نے مستری صاحب پر ریوالور سے فائر کردیئے، ایک گولی ان کے شانے پر اور دوسری ان کے ہاتھ پر اس وقت لگی جب وہ انہیں ہاتھ کے اشارے سے یہ کہتے ہوئے روکنے لگے تھے۔

''بھائی یہ کیا کررہے ہو؟''

ضعیف العمر درویش اور امن وسلامتی کے داعی مستری محمد صدیق کو خاک اور خون میں لت پت کرکے کپورتھلہ کی جانب راہِ فرار اختیار کرگئے، اس وقت مستری صاحب کے پاس ان کی بوڑھی رفیقہ حیات اور ان کے چھوٹے لڑکے فضل الرحمٰن کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا، پھر آبادی سے دُور جنگل میں ان کی آواز فریاد کون سن سکتا تھا، اس وقت اسی سمیع وبصیر ذات باری تعالیٰ کی تائید غیبی سے مدد پہنچی کہ ایک شخص ٹرک سوار کپورتھلہ کو جارہا تھا، اس نے ''دائرہ امن وسلامتی'' کے قریب دیکھا کہ ایک بوڑھا بزرگ خون میں لت پت زمین پر پڑا ہے، ایک بڑھیا ایک لڑکا اور چند بطخیں آہ وفغاں کی بھٹیاں سلگا رہے ہیں، اس نے فوراً مستری صاحب اور ان کے بیوی بچے کو ٹرک میں سوار کرکے کپورتھلہ ہسپتال میں پہنچادیا، وہاں سے یہ افسوس ناک خبر پورے ملک میں برقی رو کی مانند پھیل گئی تھی۔ سنتے ہی لوگ ہسپتال پہنچ گئے۔ وہ ایک مرنجاں مرنج مرد درویش اور اس پاپی مُعاشرے سے کنارہ

کش ہو کر شہر سے دُور سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک کٹیا میں زندگی کے دن پورے کرنے والے پر قاتلانہ حملے پر یقین کرنے پر آمادہ نہ تھے، وہ متجسانہ تعجب کے ساتھ حقائق معلوم کرنا چاہتے تھے کہ متحدہ پنجاب میں ایسی فساد انگیز صورت نمودار نہیں ہوئی تھی، ایسے پرامن ماحول اور ''دائرہ امن وسلامتی'' کے کٹیا نشین بوڑھے عالم دین کو کس نے خون آلود کیا اور سرزمین ریاست کپورتھلہ پر کس نے خون کا پہلا قطرہ گرانے کی ناپاک کوشش کی ہے؟

ریاست کپورتھلہ میں چونکہ سلطان پور کی مسلم اکثریت دیگر شہروں کی بہ نسبت دینی، علمی اور سیاسی اعتبار سے زیادہ باشعور تھی اور مستری صاحب سلطان پور لودھی کے باشندہ تھے، اس لئے مستری صاحب پر حملے کا سب سے زیادہ تاثر یہاں کے باشندوں نے لیا تھا، یہاں کی ممتاز شخصیات نے مشاورت کے بعد اس قاتلانہ حملے کے مجرموں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کیا، مگر جب مستری صاحب سے، ہسپتال میں اس کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں فرمایا۔ ''بھائی! جب میں نے صرف احکم الحاکمین کی عدالت کو تسلیم کرتے ہوئے ان طاغوتی طاقتوں کی نفی کی ہے تو مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کا معاملہ بھی اسی اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا۔ دُنیاوی کچہریوں کو میں عدالت ہی نہیں مانتا تو مقدمہ بازی کیوں؟''

بہرنوع مستری صاحب پر قاتلانہ حملے کے خلاف سلطان پور کی جامع مسجد عید گاہ کے وسیع میدان میں بروز جمعہ اتنا بڑا اجتماع ہوا تھا کہ اس سرزمین نے شاید ہی ایسا مجمع دیکھا ہو۔ اس اجتماع میں تمام مقررین نے لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کرتے ہوئے امن و سکون اور باہم گرمحبت کے ساتھ رہنے اور نازک صورت حال کے پیش نظر ہر ممکن احتیاط اختیار کرنے پر زور دیا اور فساد برپا کرنے والے شر پسند امن دشمنوں کی چالوں اور سازشوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی، انہوں نے کہا کہ مستری محمد صدیق پر قاتلانہ حملہ کر کے ریاست کا امن وسکون برباد کرنے والے غیر مسلموں کو ہم انسانی قدروں کے حوالے سے باہمی اشتراک عمل اور قیام امن کی دعوت دیتے ہیں، تا کہ گنگا کا اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا پانی خون آلود نہ ہو جائے، لیکن صد افسوس کہ فسادی عناصر پرامن باتوں کا کوئی

اثر نہ پڑا اور گنگا اس رو بہتی رہی اور رفتہ رفتہ اس میں بے گناہ انسانی خون پانی پر غالب ہو گیا اور فسادات کی آگ امرتسر اور فیروز پور کے شہروں اور دیہاتوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے جالندھر اور ریاست کپورتھلہ کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

اِردگرد کے اضلاع کے مسلمان باشندے فسادات سے جان بچا کر جالندھر اور ریاست کپورتھلہ کا اس لئے بھی رُخ کر رہے تھے کہ یہ مسلمانوں کی اکثریت کا خطہ ہے، اس میں ابھی تک ہندو مسلم فسادات کے وہ لرزہ خیز واقعات رونما نہیں ہوئے ہیں جو امرتسر وغیرہ اضلاع میں خصوصاً ہندو اور سکھوں نے مشترکہ طور پر مسلمانوں پر وحشیانہ قتل و غارت کی صورت میں کئے تھے، ان اضلاع کے مسلمان ہجرت کر کے ریاست کپورتھلہ میں گوشۂ امان ڈھونڈنے آ رہے تھے، چنانچہ ریاست کے شہر اور دیہات ایک پنجرے کی شکل اختیار کر گئے تھے، غرضیکہ رفتہ رفتہ لٹے پٹے اور غیر مسلموں کے وحشیانہ قتل و غارت سے ڈرے اور زخمی مسلمان امن و آشتی کی تلاش میں سہمے ہوئے تھے، امن کمیٹیوں کے ارکان فسادی عناصر کے برے ارادوں اور ان کی وحشیانہ سرگرمیوں سے لوگوں کو باخبر کرتے ہوئے اگرچہ پرامن رہنے اور اپنے روایتی طریق زندگی کے مطابق باہمی محبت و پیار کے ساتھ زندگی کے دن پورے کرنے کی اپلیں کر رہے تھے، اس تگ و دو اور کوششوں میں دو ماہ گزر گئے تھے، جو جولائی کے بعد اگست کا سورج طلوع ہوا تو پشاور اور راولپنڈی کے اضلاع سے غیر مسلم پناہ گیروں کی بھی ریاست کپورتھلہ میں آمد شروع ہو گئی۔ انہوں نے آتے ہی اپنے اُوپر ڈھائے گئے فرضی مظالم کی جھوٹی داستانیں سنا کر اور جعلی تصاویر دکھلا کر مسلم اور غیر مسلم تصادم اور فسادات کا مذموم ماحول پیدا کر دیا تھا، علاقے کے مسلمان اپنی جگہ مطمئن تھے کہ مسلم اکثریت کی بناء پر ریاست کپورتھلہ تو بہر حال پاکستان میں شامل ہو گی اور مسلم لیگی لیڈر بھی پورے اعتماد کے ساتھ یقین دلا کر لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کپورتھلہ جالندھر، ہوشیار پور اور ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ وغیرہ علاقے تو کسی صورت میں بھی پاکستان کے نقشے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ مزید براں یہ کہ مرکزی قیادت نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے رضاکارانہ تنظیم قائم کر کے پورے مشرقی پنجاب کے بڑے

شہروں کے بڑے لیگی رہنماؤں کو اسلحہ بھی تقسیم کر دیا گیا ہے، لہٰذا گھبراہٹ اور پریشانی کی کوئی بات نہیں، لیکن ہندو اخبارات رزنامہ "ملاپ"، "پرتاپ" اور "دیر بھارت" میں شائع ہونے والی خبروں میں پشاور، راولپنڈی اور لاہور کو فساد زدہ شہر قرار دے کر ہندو مسلم فساد کا ماحول تیار کیا جا رہا تھا، کوئی دن ایسا نہ تھا جب مسلمانوں کی طرف سے غیر مسلموں پر حملے کی خبریں بڑھا چڑھا کر شائع نہ کی جاتی ہوں۔ اس طرح کشیدگی روز بروز بڑھ رہی تھی اور مسلمان سخت پریشانی میں مبتلا تھے، ایسے گھمبیر حالات میں جب 15 اگست 1947ء کو سلطان پور لودھی کے تاریخی مقام جہانگیر کی سرائے میں بھارت کا ترنگا جھنڈا لہرانے کی دعوت دی گئی تو مقامی رہنماؤں کی آنکھیں کھل گئیں کہ ہم تو اب بھارتی باشندے بنا دیئے گئے ہیں اور ریاست کپورتھلہ کی مسلم اکثریت کی وجہ سے پاکستان میں شمولیت کا اب کوئی چانس باقی نہیں رہا ہے۔

ادھر سکھوں کے آئرن (لوہے) کے کارخانے دھڑا دھڑ تلواریں بم اور برچھے کلہاڑیاں بنا کر اسلحہ کے ڈھیر لگا رہے تھے، لیکن مسلمان اپنی روایتی شرافت میں گم سم تھے، علاوہ ازیں پاکستانی علاقے سے ہندوؤں اور سکھوں سے بھری ریل گاڑیاں سلطان پور اور ریاست کے دیگر اسٹیشنوں پر کھڑی کر کے انہیں مختلف مقامات پر آباد کیا جا رہا تھا، ان کی فساد انگیز باتوں سے اس علاقے میں بھی ہندو مسلم فساد کے شعلے بلند ہونے لگے تھے، انہی دنوں ایک افواہ پھیل گئی کہ کپورتھلہ سے شہر جالندھر کو جانے والی ایک بس کے تمام پناہ گیر قتل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ مسلمان تھے جو دیہاتی حلقے سے اُٹھ کر جان بچانے کی خاطر شہروں کا رُخ کر رہے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی لرزہ خیز خبروں سے اشتعال پھیلنا ایک فطری امر تھا۔ ایسی فساد انگیز افواہوں اور خبروں سے ریاست کا خرمن امن بھی آتش گیر ہونے لگا تھا، مندروں اور گوردواروں میں مسلمانوں کے قتل عام اور انہیں علاقے سے نکال باہر کرنے کی خوفناک سازشیں تیار ہونے لگی تھیں، جو ہندو سکھ قبل ازیں باہم دگر محبت اور رواداری کے ساتھ صدیوں سے اکٹھے رہ رہے تھے، یکا یک ان کی آنکھیں بدل گئیں۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دے رہے تھے، پاکستانی علاقے سے آ کر آباد ہونے والے غیر

مسلم ہر محلے میں مکانات پر نمبر لگا کر اپنی رہائش گاہیں ظاہر کر رہے تھے اور مسلم مسکینوں کو قتل کی دھمکیاں دے رہے تھے، جس کے باعث شہر کی فضا سخت کشیدہ ہوگئی تھی، اسی دوران یہ خبریں بھی آگئیں کہ ریاست کپورتھلہ کے سپاہی دریائے بیاس کے پار ضلع امرتسر کی حدود میں جا کر سکھ اکثریت کے دیہات میں مسلمانوں کو قتل اور ان کی عورتوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اِکا دُکا مسلمان نظر آجائے تو فسادی اسے پکڑ کر لوٹ لیتے یا قتل کر دیتے تھے، ایسی ہوشربا خبروں سے مسلم آبادی خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔ راجہ کپورتھلہ کو بھی ایسی خبریں ضرور ملتی ہوں گی، اسی لئے ان کے نام کے ساتھ سرکاری ڈھنڈورچی دف بجا کر جگہ جگہ اعلان کیا کرتے تھے کہ:

> "مہاراجہ جگت جیت سنگھ بہادر ایک صلح کل، امن پسند اور بلا رو رعایت مذہب سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے والی شخصیت ہیں، وہ ریاست کو پر امن رکھنا چاہتے ہیں، خاص طور پر مسلمانوں کو پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کی تو اکثریت ہے۔ ریاست کا ماحول خراب کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی"۔

اس طرح کے اعلانات اور تسلی بخش باتوں کے باوجود ماحول کی کشیدگی میں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑا تھا، اسی اثناء میں یہ خبر بھی عام ہوگئی کہ راجہ صاحب ریاست چھوڑ کر کسی بیرونِ ملک چلے گئے ہیں اور نظامِ حکومت اپنے لڑکے ٹکا صاحب (پرمجیت سنگھ) کے حوالے کر گئے ہیں، اس خبر سے مسلمانوں میں مایوسی بھی پھیلی اور تشویش بھی لاحق ہوئی، کیونکہ مسلمان لیڈر راجہ صاحب کو واقعی امن پسند اور غیر جانبدار حکمران خیال کرتے تھے، ان کی اعتدال پسند اور متوازن شخصیت کے اکثر معترف تھے، لیکن ریاست کے کشیدہ حالات خاص طور پر مستری محمد صدیق پر قاتلانہ حملے اور پاکستانی علاقے سے ترکِ سکونت کر کے ریاستی علاقے میں ہندو سکھ پناہ گیروں کی روزمرہ آمد اور ان کی اشتعال انگیز سرگرمیوں سے مسلمان سخت مضطرب اور کبیدہ خاطر تھے، ادھر مستری محمد صدیق بھی اللہ کی

عطا کردہ شفاء کے مطابق ہسپتال سے سلطان پور منتقل ہو گئے تھے او جمعہ کے روز عید گاہ میں عظیم الشان اجتماع میں شرکت بھی کی اور مجمع سے خطاب بھی کیا، فرزندانِ اسلام کا یہ اجتماع اگرچہ سلطان پور کی جامع مسجد عید گاہ میں تھا، لیکن اس میں شرکت کرنے والے مسلمان جالندھر اور کپورتھلہ کے اردگرد تمام قصبات اور دیہات کے مسلمان تھے، اس تاریخی اجتماع میں مستری محمد صدیق نے لوگوں کو پرامن رہنے اور صبر وتحمل سے کام لینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ شرپسندوں اور امن دشمنوں نے صرف مجھ پر ہی قاتلانہ حملہ نہیں کیا تھا، بلکہ یہ ریاست کپورتھلہ کی مسلم آبادی کے صاف وشفاف دامن کو خون آلود کرنے اور ریاست کی مسلم اکثریت کو علاقہ چھوڑ کر پاکستان کو چلے جانے کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے باخبر اور ہوشیار رہنا چاہئے، مستری صاحب نے تمام ریاستی باشندوں سے امن وسلامتی کے نام پر اپیل کرتے ہوئے کہا کہ آزادی ملنے کے بعد مجھ پر قاتلانہ حملہ کر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے والے غیر مسلم فسادیوں کو پھر بھی دعوت اتحاد دیتا ہوں۔ آؤ! ہم سب مل کر اس امن وسلامتی کی فضا کو برقرار رکھیں جو اس ریاست کا ایک مثالی اور امتیازی نشان ہے"۔

"ستم بر کی ستمرانی کا آغاز"

14-15 اگست 1947ء کو سرزمینِ ہند پر دو آزاد مملکتوں کے جھنڈے لہرانے کے بعد آزادی ملتے ہی اس سرزمین پر بے گناہ انسانوں کے خون سے نئے ندی نالے جاری ہو چکے تھے۔ اس کرۂ ارض پر قتل وغارت کا بازار گرم ہو چکا تھا، مظلوم انسانوں کی چیخ پکار دلدوز آہوں، سسکیوں اور فریادوں سے فضا مکدر ہو چکی تھی۔ فسادات کی آگ رفتہ رفتہ ریاست کپورتھلہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، ان فتنہ بازوں کی نظریں تحصیل سلطان پور کے خوش حال مسلمانوں پر مرکوز تھیں کہ اچانک یہ لرزہ خیز خبر ملی کہ کپورتھلہ شہر اور اردگرد کے مسلمانوں سے بھری ریل گاڑی جالندھر کے راستے پاکستان کو روانہ کی گئی تھی جسے کپورتھلہ اور جالندھر کے درمیان ریلوے سٹیشن گھوجیوالہ پر کھڑی کر کے تمام مسلمانوں کو

شہید کر دیا گیا ہے، چند زخمی مسلمان جنہیں حملہ آور موت کے حوالے کر چکے تھے، وہ زخمی حالت میں جالندھر شہر کی مضافاتی بستی بابا خیل پہنچ گئے تھے، انہوں نے صورتحال سے آگاہ کیا تو اس پورے علاقے میں کہرام مچ گیا تھا، ہر شخص پریشانی اور جان بچانے کی فکر میں تھا، اس دوران سلطان پور کے قریب واقع پرانے قصبے ڈلہ کو مسلمانوں سے خالی کرا کے انہیں سلطان پور اور فیروز پور کی جانب دھکیل دیا تھا۔ سلطان پور میں آئے ہوئے کیمبل پور اور راولپنڈی کے ہندو سکھ پناہ گزین اور روزانہ لوگوں کو مشتعل کرنے کے لئے فاضی مظالم بیان کر کے فسادات کی آگ بھڑکانے میں شب و روز ایک کر رہے تھے کہ لاری اڈے کے قریب واقع محلہ "مہاجتاں" میں آباد محنت کش غریب مسلمانوں کے مکانات نذر آتش کر کے سلطان پور میں بھی ہمہ گیر فساد کے شعلے بھڑکا دیئے گئے، لوگ بدحواسی کے عالم میں گوشہ امن تلاش کرنے لگے، کوئی دیہاتی علاقے کو بھاگ گیا، کوئی مسلم اکثریت کے محلوں میں پناہ گزین ہو گیا، سارا شہر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ کوئی ہندو دکاندار مسلمانوں کو کھانے پینے کی چیز دینے کو تیار نہ تھا، ادھر ہندو سکھ فسادی بندوقیں، تلواریں اور برچھے لہراتے گلی کوچوں میں بپھرے پھر رہے تھے، ان دنوں عیدگاہ کے قریب بستی کبواں اور میری رہائش گاہ سے قریب محلہ لوہاراں، محلہ راجپوتاں (حکیم سید شاہنواز، حکیم سید محمد محسن اور حکیم سید انور علی شاہ) کے محلہ حکیماں وغیرہ میں اردگرد کے محلوں سے آ کر مسلمان یکجا ہو گئے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ان مسلمانوں کو اجتماعی صورت میں ختم کرنے کے لئے رات کے وقت ہمارے محلے پر حملہ کر دیا، میری رہائش گاہ کے سامنے خانقاہ شیخو شاہ کے بڑے دروازے پر بم کا ہولناک دھماکہ ہوا۔ اللہ کی قدرت کہ خانقاہ کی دیوار کو نقصان پہنچا اور مسلمانوں کا اس وقت کوئی جانی نقصان نہ ہوا تھا۔ بم دھماکے پر فرزندانِ اسلام نے اجتماعی صورت میں نعرۂ تکبیر بلند کر کے جب حملہ آوروں کا تعاقب کیا تو وہ دم دبا کر بھاگ گئے تھے، ساری رات جاگ کر گزاری گئی، صبح کو جامع مسجد چوڑیگراں میں مسلم رہنماؤں کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں فیصلہ ہوا تھا کہ مسلم اکثریت کے محلوں میں سے کوئی بھی مسلمان انفرادی صورت میں شہر چھوڑ کر دیہاتی حلقے کی جانب نہیں جائے گا اور اگر ترک سکونت اختیار کرنا پڑی تو پورا شہر

اجتماعی صورت میں خالی کیا جائے گا، تاکہ افراتفری اور کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا جاسکے۔ صبح 10-09 بجے یہ فیصلہ مسجد میں ہوا تھا، مگر نماز ظہر کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ محلہ کمبواں جس میں چودھری فتح محمد اور چودھری فضل محمد (صدر بلدیہ) اور دوسرے سرکردہ حضرات کی رہائش گاہیں واقع ہیں، ایک تو ان رہنماؤں سے ملاقات کر کے تازہ صورت حال معلوم کی جائے اور آئندہ لائحہ عمل کی بابت مشاورت ہو جائے، چنانچہ اس ارادے سے اکیلا ہی نکل پڑا۔ جب محلہ لوہاں اور قصابوں کے بازار سے ہوتا ہوا چودھری صاحبان کی رہائش گاہوں کے قریب گیا تو ایک سناٹا طاری تھا، کسی انسان کی تو کجا کوئی چڑیا بھی پرواز کرتے نظر نہیں آرہی تھیں۔

میری حماقت کی انتہا کہ بازار میں جا کر اپنا ''حسین کتب خانہ'' کھول کر بیٹھ گیا، چودھری فضل محمد کمبوہ، مولانا محمد اشرف فاضل ڈابھیل، منشی اللہ دتا، چودھری فتح محمد، چودھری خوشی محمد اور میرے ہم جماعت مولوی محمد شفیع اور دیگر حضرات کی بیٹھک اور رہائش گاہیں قریب ہی واقع تھیں، میرا خیال تھا کہ یہ لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں میں دبکے بیٹھے ہوں گے، اسی لئے باہر نظر نہیں آرہے ہیں۔ ابھی چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک سکھ لڑکا تلوار اور برچھا لئے میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا آؤ۔ سردار جی، وہ سنتے ہی سرائے جہانگیر (تحصیل ہیڈ کوارٹر) کی جانب تیزی سے چلا گیا۔ میں نے بھی نازک صورت حال دیکھ کر جلدی سے کتب خانہ بند کیا اور گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ بازار میں اس وقت میں اکیلا ہی تھا، لیکن سرائے کے قریب محلہ کمبواں سے لوگوں کے چیخ و پکار کے ساتھ افراتفری کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک مسلمان نے گھبراہٹ کی حالت میں بھاگتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ تمام مسلمان لیڈر سمیت شہر خالی کر کے دیہاتوں کی جانب چلے گئے ہیں۔ اب میں نے بھی پریشانی کے عالم میں اللہ سے دُعا کرتے ہوئے تیز قدموں کے ساتھ گھر کی راہ لی۔ سنسان گلیوں میں اکیلا ہی آگے پیچھے نگاہ ڈالتے ہوئے جس حالت میں جا رہا تھا، وہ منظر آج بھی سامنے آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ کا شکر کہ اس وقت اسلام دشمنوں میں سے کوئی فسادی ادھر نہیں آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بحفاظت گھر پہنچا دیا، لیکن مسلم اکثریت

کے محلہ پنڈوری کمبواں کے باشندوں کا ترک سکونت کر جانا سخت پریشان کن تھا، نیز یہ معلوم کر کے مزید افسوس ہوا کہ شہر کے اکثر رہنما جن میں چودھری فتح محمد کمبوہ، چودھری فضل محمد کمبوہ اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف جنہوں نے جامع مسجد چوڑیگراں میں لوگوں کو انفرادی طور پر شہر چھوڑنے کے منع کیا تھا، وہ سب گوردوارہ بیر صاحب کے نزدیک سے بیئیں سیاہ عبور کر کے تکونڈی چودھریاں کی جانب روانہ ہو گئے ہیں، اس سے مایوسی پھیلنا فطری امر تھا، اس رات کو ہمارے محلّہ پر پھر حملہ ہو گیا۔ لوہاراں کے بہادر نوجوانوں نے دستی بموں کی بوچھاڑ کر کے فسادی بھگا دیئے تھے، اب حالات انتہائی ناگفتی ہو گئے تھے۔ سارا شہر خوفناک دھماکوں سے لرز رہا تھا۔ دُور محلوں سے چیخوں اور ہائے مر گئے کی فریادیں سنائی دے رہی تھیں، اسی اثناء میں مولوی مستری محمد یعقوب اپنے فرزند محمد یوسف کے ہمراہ تشریف لائے، ان کی رہائش گاہ چونکہ گوردوارہ ہٹ صاحب کے سامنے شہر کے آخری کونے پر واقع تھی، وہ آٹا پیسنے کی چکی کے مالک اور کافی مالدار تھے، رات وہ اوران کے رشتہ دار میرے ہاں ٹھہرے، آدھی رات کو پہلے زوردار دھماکہ ہوا پھر مندروں کے قریب واقع بھنڈاریوں کی کوٹھیوں سے لاؤڈ سپیکر پر آواز سنائی کہ ”میں تمہارے کسی ذمہ دار سے ملنا چاہتا ہوں“ ہم سب حیران تھے کہ یہ کون ہے؟ اس وقت محلّہ لوہاراں میں مقیم رفیع احمد ریٹائرڈ تھانیدار نے بآواز بلند پوچھا کہ ”آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“ آواز آئی۔ ”میں کپتان اندر سنگھ بول رہا ہوں اور عبدالحمید سے ملنا چاہتا ہوں، پھر زوردار آواز آئی کہ میں روشنی کا فائر کرتا ہوں۔ گھبرائیے نہیں روشنی کی سیدھ میں عبدالحمید میرے پاس آجائے۔ ہم آپ کو پرامن صورت میں کپورتھلہ پہنچانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ مطمئن رہیے، اس وقت مسلمانوں کے دو کیمپ ہیں، ایک تکونڈی چودھریاں ہیں اور دوسرا بھلانہ کیمپ۔ حکومت شہر میں خون خرابہ دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ مسلمانوں کو نہایت امن وسکون کے ساتھ پہنچانا چاہتی ہے“۔

اس آواز کے ساتھ ہی اندھیری شب میں روشنی پھیل گئی۔ پھر عبدالحمید کا نام پکارا گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک نوجوان مستری غلام محمد کالڑ کا عبدالحمید یہاں موجود ہے، اسے آواز

پہنچانے کو کہا گیا، اس نے کہا کہ یہ کپتان اندر سنگھ ہیں، میرے واقف ہیں، عبدالحمید نے وہاں جانے کا ارادہ کرلیا تھا کہ کپتان نے پھر کہا کہ "شہر میں ملٹری کا پہرہ ہے، عبدالحمید ملاقات کے بعد تمہارے پاس بحفاظت آجائے گا"۔

بہرنوع ڈرتے کانپتے ہوئے عبدالحمید اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ کپتان کے پاس پہنچ گیا، کپتان نے اطلاع دی کہ "وہ یہاں پہنچ گیا ہے اور خود تصدیق کرتا ہے" چنانچہ عبدالحمید نے لاؤڈ سپیکر پر بتایا کہ "میں پہنچ گیا ہوں، بات ہوگئی ہے اور کل ہمیں اپنے اپنے محلے چھوڑ کر عیدگاہ میں یکجا کردیا جائے گا اور پھر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا"۔

ہلاکت خیز سازش

ساری رات گولیوں کی تڑاخ پٹاخ، بم دھماکوں اور چیخ وپکار کی لرزہ خیز آوازوں میں گزری، صبح کو کپتان اندر سنگھ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محلہ لوہاراں کے حفاظتی دروازے پر آکر دھمکی آمیز لہجے میں دروازہ کھولنے کو کہا، اہل محلہ نے جب ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کپتان کی بات ماننے سے انکار کیا تو اس نے نرم لہجے میں یقین دلایا کہ "میں حکومت کے فیصلے کے مطابق آپ کو پرامن طور پر آپ کے دوسرے بھائیوں سے ملانے کے لئے آیا ہوں، لوگ مطمئن رہیں، آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا" چنانچہ اہل محلہ نے دروازہ کھول دیا، پھر سب کو عیدگاہ میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ اب اس کے لہجے میں تلخی آگئی تھی، اس نے اہل محلہ کو دھمکی دی کہ "وہ اپنا اسلحہ فوراً جمع کرادیں ورنہ مسلح شخص کو گولی ماردی جائے گی"۔ لوگوں نے جب غیر مسلح ہونے کا یقین دلا دیا تو اس نے کہا کہ "اچھا اب پانچ ہزار روپے کا انتظام کردو تا کہ گاڑیوں میں تیل وغیرہ ڈلوا کر سفر شروع کیا جاسکے"، یہ کہہ کر کپتان تو چلا گیا لیکن وہاں پر مسلح پہرے دار کھڑے کردیئے گئے تھے، انہوں نے رقم جمع کرانے کا تقاضا کیا، لوگوں نے حسب استطاعت رقم بابو بدرالدین کے پاس جمع کرادی، حتیٰ کہ جن کے پاس کچھ بھی نہ تھا، ان کی عورتوں نے اپنے زیور اتار کردے دیئے تا کہ ہمارے جان وآبرو کو نقصان نہ پہنچ سکے، کپتان اندر سنگھ نے مطلوبہ رقم وصول کرکے کہا کہ

حکومت نے مزید چھ ہزار روپے ادا کرنے کو کہا ہے، اس پر بابو بدرالدین اور مولوی محمد یعقوب نے کہا کہ مطلوبہ رقم کے ساتھ عورتوں نے باقی ماندہ زیور بھی اتار کر دے دیئے ہیں، وہ رقم پہلے ہی زیادہ ہے، اس پر کپتان نے پھر دھمکی دی کہ جان کی خیر چاہتے ہو تو رقم اور اسلحہ وغیرہ سب فوراً جمع کروادو! لوگوں نے وہ رقم بھی جمع کرادی، تو کپتان نے مسلمانوں کو اپنے تمام محلے چھوڑ کر عیدگاہ میں اکٹھے ہونے کا حکم دیا۔ نمازِ ظہر کے بعد لوگ بصد حسرت ویاس گھر بار چھوڑ کر قافلے کی صورت میں عیدگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ہم جب جہانگیر کی قلعہ نما سرائے کے سامنے بورڈنگ ہاؤس کی نکڑ پر پہنچے تو وہاں پر مدن لال مجسٹریٹ اور سپاہیوں نے ہر شخص سے لاٹھی وغیرہ سے ہاتھ خالی کرائے، کسی ضعیف العمر بوڑھے مرد عورت کو سہارے کے لئے چھوٹا ڈنڈا بھی ہاتھ میں رکھنے کی اجازت نہ تھی۔

وہاں پر دوسرا حکم یہ نافذ ہوا کہ عورتیں تو بورڈنگ ہاؤس میں رہیں گی اور مرد سامنے واقع عیدگاہ میں ہی ٹھہریں گے اور صبح کو جلد ہی کپورتھلہ روڈ کے ذریعے بھلانہ کیمپ تک پہنچادیا جائے گا، اس پر لوگوں کو تشویش ہوئی کہ نامعلوم عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ لیکن حالات کی سنگینی کے پیش نظر وہاں عورتیں بورڈنگ ہاؤس میں اور تمام مرد عیدگاہ کے وسیع احاطے میں جمع ہو گئے، موت وحیات کی کشمکش میں لوگوں کو کھانے پینے کی ہوش نہ تھی، یہاں جب رات کی تاریکی میں ننھے منھے معصوم بچوں کو دودھ کی خاطر بلکتے سنا تو ہر شخص اشکبار ہو گیا، مگر سب بھوکے پیاسے کیا کر سکتے تھے؟ ہمارا حال تو یہ تھا۔

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل جاتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

مردوں اور عورتوں کی تلاشی...... شہر بدری کے آخری لمحات

بہرنوع شہر کے ان بے بس مسلمانوں نے اپنے آبائی مسکن میں یہ رات جس کرب واضطراب کی حالت میں گزاری وہ ناقابل بیان ہے، اللہ کے حضور ساری رات رو رو کر آہ وزاری اور فریاد میں گزری۔ یا اللہ! یہ معصوم بچے، یہ عفت مآب عورتیں اور یہ

ہزاروں فرزندانِ اسلام اپنی رہائش گاہوں سے بے دخل کر کے انہیں الگ الگ رکھا گیا ہے، نامعلوم ان کافر دروندوں کا کیا منصوبہ ہے۔ انہوں نے اگر چہ بحفاظت کپورتھلہ کے نزدیک مسلم کیمپ میں پہنچانے کا جھانسہ دیا ہے، مگر حالات کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔

اِک کھیل بعنوان دغا کھیل رہی ہے
یارب تیرے بندوں سے قضا کھیل رہی ہے

بورڈنگ ہاؤس سے بھوک پیاس سے نڈھال بچوں اور عورتوں کی چیخ پکار سن کر انتظامیہ سے کھانے پینے کی اشیاء کا تقاضا کیا گیا تو انہوں نے سخت لہجے میں ڈانٹ پلا دی۔
''ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

جب ہمارا اصرار بڑھ گیا تو انہوں نے اپنے گھر جا کر کھانا تیار کرنے کی اجازت دے دی، اس پر شہر کے نامور تاجر ملک مولا بخش نے پیشکش کی تو چند سپاہی ان کے ساتھ بھیج دیئے گئے، ملک مولا بخش نے اپنے لڑکے ملک محمد شریف کے معیت میں کھانا تیار کرالیا تو انتظامیہ کی نیت میں فتور آ گیا، وہ پکا پکایا کھانا اپنے عملے کو کھلانا چاہتے تھے، اس پر حکیم نواب الدین آبلی والے، مولوی محمد یعقوب اور راقم الحروف نے جب ان سے بچوں، عورتوں اور مریضوں کی نازک صورت حال پر رحم کھانے کی التجا کی تو کھانا لا کر بورڈنگ ہاؤس اور عیدگاہ کے ساکنین میں تقسیم کر دیا گیا اور اللہ کا شکر ادا کیا، خوف اور دہشت کی ہیبت ناک فضا میں یہ رات بسر ہوئی، دیگر نمازوں کے بعد فجر بھی عیدگاہ میں ادا کی گئی تھی۔

صبح طلوع ہونے پر عام تاثر یہ تھا کہ اب ہمیں شہر بدر کر کے مسلم کیمپ پہنچانے میں تاخیر نہ ہوگی، مگر وہاں تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ ''ما در چہ خیالیم فلک در چہ خیال'' والا معاملہ تھا، کپتان اندر سنگھ اور مجسٹریٹ مدن گوپال کی سرگرمیاں مشکوک نظر آنے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کو آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے ہدایات دے رہے تھے۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ ملٹری اور پولیس کی بھاری نفری نے بورڈنگ ہاؤس اور عیدگاہ کو گھیرے میں لے لیا اور عیدگاہ کے ''دروازے (بالمقابل) سرائے جہانگیر'' پر مشین گن بردار سپاہی مقرر

کردیئے تھے، اب ہم مکمل طور پر ان کی حراست میں آ گئے تھے، ان کا خیال ہو گا کہ یہ لوگ بستی کبوآں اور دیگر محلوں کے باشندوں کی طرح گوردوارہ پیر صاحب کے راستے بئیں عبور کر کے تلونڈی چودھریاں کی طرف نہ چلے جائیں، درحقیقت وہ ہم سب کو شکنجے میں کس کر لوٹ مار کا خوفناک منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ 11 ستمبر 1947ء کو مجسٹریٹ مدن گوپال نے تمام مردوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ ان کے پاس جو بھی زیور، روپے پیسے کوئی ہتھیار لاٹھی چھڑی وغیرہ موجود ہے وہ فوراً ہمارے پاس جمع کرادیں، صرف پانچ روپے برائے اخراجات رکھ سکتے ہو، اب کرفیو نافذ کردیا گیا ہے، اگر کسی نے خلاف ورزی کی تو اسے گولی سے اڑادیا جائے گا۔ فرعون مزاج مجسٹریٹ مدن گوپال اور کپتان اندر سنگھ کو بہت اطمینان دلایا گیا کہ تین مرتبہ تلاشی کے بعد اب ہمارے پاس کیا بچا ہے؟ لیکن انہوں نے سنی ان سنی کردی، انہوں نے جب عورتوں کی تلاشی کے لئے سپاہیوں کو حکم دیا تو ہم سب سراپا احتجاج بن گئے کہ بورڈنگ ہاؤس میں اگر کسی بھی سپاہی نے عورتوں کو تلاشی کی خاطر ہاتھ لگایا تو ہم جان تو قربان کردیں گے مگر عفت مآب اور پردہ دار عورتوں کی بے حرمتی ہرگز برداشت نہی کریں گے، اس پر وہ سہم گئے اور مطلب برآری کی خاطر انہوں نے اپنے لوگوں کی معرفت عورتوں سے سامان اکٹھا کرنے کو کہا۔ چنانچہ حکیم نواب الدین، سیاوش بیگ اور مولوی محمد یعقوب کے مشورے سے چند مسلم رضا کاروں کی وساطت سے عورتوں کے زیور، کانوں کے کانٹے انگوٹھیاں، حتیٰ کہ سلائی مشین وغیرہ سب کچھ ان کے حوالے کردیا گیا، بعدازیں مجسٹریٹ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ عیدگاہ میں داخل ہو گیا اور آتے ہی بجلی کی مانند کڑکتے ہوئے کہا کہ تمہارے پاس جو کچھ روپے پیسے موجود ہیں وہ جمع کرادو ورنہ گولی سے اُڑادیا جائے گا، پھر اپنے سپاہیوں کی جانب متوجہ ہو کر اس گرجدار آواز میں کہا کہ اپنی بندوقیں تیار رکھو! جب میں اشارا کروں تو فوراً فائر کھول کر ان کی بوٹیاں اُڑادی جائیں۔

اس دھمکی کے بعد لوگوں نے زندگی بھر کی جمع کردہ پونجی جمع کرادی تھی اور عیدگاہ میں روپوں اور زیورات کا ڈھیر لگ گیا تھا، لوگ خون کے آنسو رو رہے تھے کہ وہ مسافرت میں تہی دست کیا کریں گے؟ کھانے پینے کی اشیاء کہاں سے لیں گے؟ غرضیکہ شام نمازِ عصر

تک تلاشی کا جگر پاش مرحلہ جاری رہا، اسی اثناء میں عیدگاہ کے شمال کی جانب واقع امام باڑے کی دیوار پھلانگ کر مسلح سکھوں کا ایک جتھا عیدگاہ میں گھس گیا، سب لوگ سراسیمہ ہوگئے، مجسٹریٹ کو مطلع کیا گیا تو اس نے سب کو اشارے سے باہر نکال دیا تھا، بعدازیں کپتان اندر سنگھ اپنے مسلح سپاہیوں کو لے کر عیدگاہ میں آ گیا اور مختلف مقامات پر ان کی ڈیوٹی لگا کر چلا گیا، سپاہیوں نے بھی مسلمانوں سے رقوم ہتھیانے کے لئے ہر ایک سے یہ کہہ کر جب خالی کرالی کہ قافلے کے ساتھ تو ہم نے جانا ہے اس لئے رقوم ہمیں دی جائیں، اسی دوران عیدگاہ کے دروازے کے باہر ایک بس آ کر رُک گئی، جس کا ڈرائیور اور مسلح محافظ سکھ تھے۔ بس کے اردگرد جمع شہر کے سرکردہ ہندوؤں کے ساتھ امر سنگھ نامی سیکرٹری میونسپل کمیٹی سلطان پور بھی ہمیں تسلی دے رہے تھے کہ اب قافلے کی روانگی کا وقت ہے، تم میں سے لیڈر صاحبان اور معزز حضرات تو اسی روپے کرایہ دے کر بس میں سوار ہو جائیں، باقی لوگ پیدل سفر کریں گے، اس پر مرزا سیاوش بیگ جو ایک ایسا بہادر نوجوان تھا کہ اس کی دہشت اور بہادری سے ہندو آبادی ہمہ وقت ڈرتی اور خوف زدہ رہتی تھی، ہندو چال بازوں نے اسے مکمل یقین دلایا تھا کہ وہ کسی قسم کی فکر نہ کریں، انہیں بحفاظت منزل مقصود تک پہنچا دیا جائے گا۔ مرزا سیاہ پوش بیگ ان کے جھانسے میں آ گئے تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ بڑے لیڈر حضرات تو اس بس میں بیٹھ جائیں اور باقی پیدل روانہ ہو جائیں گے۔

میں نے حکیم نواب الدین اور ملک محمد شریف سے تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہزاروں مردوں اور عورتوں کا مجمع چھوڑ کر بس میں سوار ہونا نہ تو قرین عقلمندی ہے اور نہ شیوۂ وفا شعاری، کیونکہ اس بس کا ڈرائیور اور اس کا ساتھی ایک مسلح سپاہی سکھ ہیں، نامعلوم اس میں اور کون کون سوار ہو جائیں گے، ہمیں تو اپنے ہزاروں بھائیوں کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔ اگر وہ زندہ بچیں گے تو ہم بھی اور اگر وہ مر جائیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ علاوہ ازیں بس کے اندر تو قیدی ہو جائیں گے، باہر ہر شخص جان بچانے کی آزادی کے ساتھ دوڑ دھوپ کرسکتا ہے۔ حکیم صاحب نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے بس

میں سوار نہ ہونے کا فیصلہ کیا، اتنے میں ایک دوست سکھ سپاہی مجمع ہٹاتے ہوئے میرے پاس آیا اور ''آبدیدہ'' صورت میں بس میں سوار نہ ہونے کا اشارہ کیا، اسی اثناء میں مرزا سیاوش بیگ، مولوی محمد یعقوب ان کا بیٹا محمد یوسف، سید عزیز الحسن شاہ اور دیگر چند نمایاں حضرات بس میں سار ہونے پر آمادہ ہو گئے، مرزا سیاوش بیگ نے مجھے پھر آکر کہا کہ آپ بھی سوار ہو جائیں، میں نے انکار کرتے ہوئے ہزاروں کے مجمع کی طرف اشارہ کیا، میں تو ان کے ساتھ رہوں گا، اس پر مرزا سیاوش نے میری جانب تحقیر آمیز لہجے میں ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ''او چھڑ اوئے صوفیا بزدل! مرزا صاحب ہندوؤں کی بظاہر'' ''خیر خواہی در پردہ تباہی'' سے بے خبر تھے۔

میں نے کہا بزدل وہ! جو ہزاروں کو بے آسرا چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر رہا ہے، ابھی میں نے بات مکمل نہ کی تھی کہ جماعت اسلامی کا نوجوان احمد حسن گھڑی ساز بس کی چھت پر چڑھ کر مسلح سکھ کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا، اسے دیکھ کر حیرت ہوئی، قضا و قدر کو ن کون ٹال سکتا ہے؟ دیکھتے دیکھتے فرزندانِ اسلام سے بھری لاری کپور تھلہ کی جانب روانہ ہو گئی۔ بعدازاں ہمیں بھی روانگی کا حکم دیا گیا، افراتفری کے عالم میں قافلے کی روانگی ہوئی تو کاررواں کے آگے چلنے کو مجھے اور حکیم نواب الدین سے کہا گیا، ہم عیدگاہ کے مشرقی دروازے کی جانب سے روانہ ہونے لگے تو سامنے دورویہ مکانوں کی چھتوں پر بے شمار ہندو عورتیں اور بچے ہمیں دیکھنے کو جمع تھے، انہیں دیکھ کر ہم فکرمند اور خوفزدہ بھی ہوئے، خدانخواستہ یہ لوگ ہم پر بم پھینک کر تباہی نہ مچادیں۔ تاہم بجز واکراہ اپنے آبائی شہر سلطان پور کے در و دیوار پر حسرت کی نگاہیں ڈالتے اور آخری دیدار کرتے ہوئے اشکبار حالت میں روانگی ہوئی تو یہ فکر دامن گیر تھی کہ رات آنے کو ہے، ایسے وقت باہر جنگل میں کیسے بسر ہوگی، دراصل یہ خونخوار انسان نما ہندو سکھ درندے ہیں، اس وقت شہر سے اس لئے باہر لے جا رہے تھے تاکہ قتل عام کی صورت میں لاشیں اندرونِ شہر نہ پڑی رہیں اور تعفن کے باعث لاشوں کو ٹھکانے لگانا مشکل نہ ہو جائے۔

تاریخی شہر سے روانگی کا رقت انگیز منظر

بہرنوح ہم ترک وطن پر مجبور تھے، جب شہر کی حدود سے باہر نکلے تو برلب سڑک پیپل کے درخت کے پتے یوں ہلتے دکھائی دیئے جیسے وہ تالیاں بجا بجا کر ہمیں کافروں کے خونریز منصوبے سے آگاہ اور خبردار کررہے ہوں، میں نے پیچھے مڑ کر اپنے شہر پر آخری نگاہ ڈالی تو مسجدوں کے بلند مینار جامد کھڑے آواز دیتے نظر آئے۔ او حاجیو! نمازیو! کہاں جارہے ہو؟ تمہارے آباؤ اجداد نے تو کتنی محنت ومشقت اور بھاری اخراجات سے ہمیں تعمیر کیا تھا۔ یہ مسجدیں یہ دینی درسگاہیں، یہ تاریخ اور قرآن و حدیث کے کتب خانے، یہ لائبریریاں، یہ بزرگوں اور اللہ کے ولیوں کی قبریں کس کے سپرد کر کے جارہے ہو؟ اب ان مسجدوں میں اللہ اور اس کے رسول ؐ کا نام کون بلند کرے گا؟ اے فرزندانِ اسلام تم لودھی خاندان کے آباد کردہ اس تاریخی شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے جارہے ہو، جو دینی تعلیم کا مرکز تھا جس میں مشہور معلم بادشاہوں اورنگ زیب عالمگیر، داراشکوہ اور دیگر حکمرانوں، علماء و اولیاء نے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی اور اسے اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ بنایا تھا۔ شہر کے آخر میں برلب سڑک واقع بابو عبدالعلی کی کوٹھی کے سامنے والی خوبصورت مسجد کے پاس سے گزرنے لگے تو یوں محسوس ہوا جیسے وہاں سے گریہ وزاری کی یہ صدا بلند ہو رہی ہو۔ ''اے مسلمانو! تم تو باوضو اور پاکیزہ لباس کے ساتھ پانچ وقت یہاں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے تھے، اب تم ہمیں ناپاک اور نجاست بھرے انسان نما درندوں کے حوالے کر کے جارہے ہو، قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج اُچھالنے والو! آج تم بے بس قیدی کی طرح سہمے ہوئے اپنا وطن چھوڑ کے کہاں جارہے ہو؟'' شہر سے باہر نکل کر ریلوے لائن کی طرف نگاہ اُٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ لائن کے پار ڈوبتے سورج کی کرنوں سے تلواروں اور برچھوں کی نوکیں چمک رہی ہیں، یہ خطرناک صورتِ حال سب نے دیکھی، اتنے میں ہم ریلوے پل کے تالاب پر پہنچ گئے، میں نے نمازِ مغرب کے لئے وضو کر کے دعائیہ کلمات کہے تھے کہ ٹھاہ، گولی چلنے کی آواز آئی، یکا یک ہزاروں مسلح درندوں نے قتلِ عام شروع کر دیا، پھر گردنیں کٹنے لگیں، نیزوں

کی نوک سے نہتے مردوں عورتوں کے پیٹ پھاڑے جا رہے تھے، انسانی جسموں کے ٹکڑے بکھرے اور لاشے تڑپ رہے تھے۔

ننھے منھے معصوم بچوں کو نیزوں میں پرو کر اچھالا جا رہا تھا۔ تلواروں کے وار یوں لگ رہے تھے کہ دھان چاول کی فصل چھڑی جا رہی ہو، ہر طرف قیامت صغریٰ برپا تھی۔ چیخوں اور ہائے مر گئے کی فریادوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، لوگ جان بچانے کی خاطر آگے پیچھے جدھر راہ ملتی بھاگ رہے تھے، نماز مغرب کے لئے وضو کی خاطر میں چونکہ تالاب کے پاس رہ گیا تھا، میرے ساتھ دیگر افراد کنبہ بچھڑ گئے تھے، مجھے ان کا کچھ پتہ نہ تھا، کچھ بھائی نہ دے رہا تھا، موت کے ہیولے اُٹھ رہے تھے جو لوگ کپور تھلہ روڈ کی جانب دوڑ رہے تھے، مجھے بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ رفتہ رفتہ تاریکی چھا رہی تھی۔ جب ڈھونڈی پھاٹک کے قریب پہنچا تو بائیں جانب واقع گاؤں کے قریب چھپڑی (چھوٹے جوہڑ) میں ایک بے بس شخص کے سر پر لگا تار تلوار ماری جا رہی تھی اور ایک عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی، ابھی چند قدم آگے کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سڑک کے کنارے مرزا سیاوش بیگ کی لاش پڑی تھی، اسے دیکھتے ہی یقین ہو گیا کہ سلطان پور سے چلنے والی بس میں سوار تمام شہید کر دیئے گئے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر سکھوں کا ایک جتھا ہم پر حملہ آور ہو گیا۔ غالباً وہ سلطان پور کے قریب حملے والی جگہ پر جا رہے تھے، شروع میں تو ہم ریلوے لائن پر بچھائے گئے پتھروں سے ان کا مقابلہ کرتے رہے، مگر جب ہم میں سے چند کمزور دل مسلمانوں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی تو وہ سب ہم پر ٹوٹ پڑے اور گھیرے میں لے کر سڑک کے کنارے شیشم کے بڑے گھنے درخت کے نیچے لے گئے۔ اب اندھیرا چھا گیا تھا، ادھر موت کا سایہ بھی تھا، تقریباً تین چار سو نہتے اور بے بس مسلمان ان مسلح سکھوں کے رحم و کرم پر تھے، وہ ہمیں یکجا بٹھا کر ارد گرد تلواریں اور برچھے لہرائے کھڑے تھے کہ اچانک ایک حملہ آور نے بآواز بلند کہا۔ کیوں بھئی تیار ہو؟

دفعتہً میرے ساتھ والے شخص کے سر پر اس نے تلوار کا وار کرنے کو ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ میں بے ساختہ "ٹھہریں اؤ" کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور تلوار والا بازو پرے ہٹاتے

ہوئے کہا" سردار جی بات سنو!" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔"تو کون ہے؟"
میں نے نام بتایا تو اس نے تلوار نیچے کی جانب کرتے ہوئے کہا۔" مہاراج! ہم آپ کو کچھ
نہیں کہیں گے، آپ کی تقریریں سنی ہیں، آپ تو ہمارے گروجی کی بہت تعریفیں کرتے رہے
ہو"۔ ساتھ ہی اس نے حملہ آوروں سے کہا۔ٹھہر جاؤ! اور میرے پاس آ جاؤ! انہیں سمجھایا کہ
یہ تو وہ مولوی صاحب ہیں گیانی کرتار سنگھ ڈھلوں نے جن سے اپنے گاؤں میں بھی تقریر
کرائی تھی، انہوں نے گروجی کے "شبد" سنائے تھے۔ کچھ حملہ آور تو سنتے ہی سلطان پور کی
طرف بھاگ گئے، وہ شہیدوں اور زخمیوں کا مال اکٹھا کرنا چاہتے ہوں گے۔ صرف آٹھ دس
مسلح سکھ ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے، جن کی کھسر پھسر سے یہ خدشہ تھا کہیں مجھے
چھوڑ کر انہیں شہید نہ کر دیں!

میں نے کہا کہ" سردار جی۔ آپ نے مجھے نہ مارنے کا یقین دلایا ہے۔ یہ جتنے
لوگ بیٹھے ہیں یہ میں ہی ہوں۔ اگر ان کو ختم کر دیا گیا تو میری زندگی کس کام کی۔ ہمیں مار کر
پاپ نہ کماؤ! واہ گرو کو یاد کرو!" سردار جی نے اپنے پاس کھڑے ساتھی سے کان میں کوئی
بات کی، پھر کہا۔" اچھا جو کچھ تمہارے پاس رقم ہے وہ ہمیں دے دو! تمہاری جان بچ جائے
گی" میں نے سردار جی سے کہا۔" ہماری جیبیں تو افسروں نے خالی کر دی ہیں، شاید ہی کسی
کے پاس کچھ ہو" اسی دوران میں نے سردار جی سے نام پوچھا تو اس نے گردیال سنگھ بتایا۔
میں نے ملک محمد شریف کو آواز دی، کیونکہ وہ بھی میرے ساتھ قافلے کے اگلے حصے میں
تھا، اس نے میرے قریب ہو کر لوگوں سے کچھ وصول کر کے انہیں دینے کی حامی بھر لی،
چنانچہ رومال میں کچھ پیسے اکٹھے کر کے ہم نے سردار جی کے حوالے کئے ہی تھے کہ سلطان
پوری کی جانب سے ایک لاری کی روشنی دکھائی دی، اسے دیکھتے ہی میری زبان پر جملہ
آ گیا کہ "ملٹری آ گئی" وہ سنتے ہی اپنے گاؤں کی جانب بھاگ گئے۔ اب میری پریشانی
کہ سردار گوردیال سنگھ تو میرا واقف نکل آیا ہے، کوئی اور سکھ حملہ آور ہو گئے تو کیا ہو گا؟
جلد بازی میں سردار جی کے ساتھ میں بھی ان کے گاؤں کی جانب چلا گیا۔ رات کی
تاریکی میں تیز دوڑ کر گوردیال سنگھ تو اوجھل ہو گیا۔ دوسرے حملہ آور سکھ تیزی کے ساتھ

میرے پاس سے گزر رہے تھے، چہرے پر داڑھی، سر پہ رومال جیسے پگڑی اور گردن میں لٹکی حمائل شریف کو سکھ نشانی ''کرپان'' خیال کر کے اندھیرے میں مجھے بھی سکھ ہی سمجھ رہے تھے، گاؤں کے باہر فصل میں بیٹھا دیکھ کر ایک مسلح سکھ بھی میرے پاس آ کر پوچھنے لگا۔ کیوں بھئی مسلے (مسلمان) کدھر ہیں، میں نے شہر کی جانب اشارہ ہی کیا تھا کہ وہ دوڑ گیا۔ اتنے میں ڈھونڈتا ہوا گردیال سنگھ میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھے ''پونے'' میں رکھی تیرہ روٹیاں دیں، ایک پر اچار کی پھانکیں تھیں، ساتھ ہی اس نے کہا۔ ''مہاراج کب کے بھوکے ہوگے!

''ان چھک لو'' (یعنی کھانا کھالو) نانہ کرنا۔ رات کے وقت مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حملہ آور کوئی کسی کو جانتا پہچانتا نہیں ہے!'' میں نے روٹی کا لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالا۔ مگر وہ حلق میں نیچے کیسے جاتا۔ میں نے سردار جی سے کہا کہ ''جل (پانی)'' اس نے کہا آیئے وہ گاؤں کے باہر کنوئیں پر مجھے لے گیا اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ رہٹ چلانے لگا۔ میں نے پہلے ان سے جل چھکنے (پانی پینے) کو کہا۔ ان کے بعد میں نے پیا پھر سردار جی کے ہمراہ اس جگہ پہنچا، جہاں درخت کے نیچے مسلمان جمع تھے، ہم ریلوے لائن کی اوٹ میں دیکھ رہے تھے، بڑی گاڑی کھڑی تھی اور کبھی کبھی وقفے کے ساتھ فائرنگ کی آواز آ رہی تھی، لیکن کسی کی چیخ پکار سنائی نہ دے رہی تھی کہ اچانک گاڑی میں حرکت آئی اور وہ کپورتھلہ کی جانب روانہ ہوگئی۔ بعدازاں میں نے سردار جی کا شکریہ ادا کر کے انہیں واپس گاؤں جانے کو کہا اور خود اپنے ساتھیوں کی جانب گیا۔ رات کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں مجھے دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ وہ ڈر گئے ہیں، میں نے اپنا نام بتایا تو انہیں سکون ملا۔ پھر میں نے ملک شریف سے پوچھا کہ یہ بڑی گاڑی کیا تھا؟ اس نے بتایا کہ ''برما فونڈری متصل غلہ منڈی سلطان پور والوں کا ٹرک تھا، وہ بدمعاش زخمیوں اور لاشوں کے پاس سے پڑا سامان اکٹھا کر رہے تھے اور خوف زدہ کرنے کو پستول سے ہوائی فائر کر رہے تھے، جاتے وقت ایک لڑکی کو بھی ٹرک پر زبردستی بٹھا کر لے گئے ہیں، جو کچھ فاصلے پر جانے کے بعد ٹرک سے چھلانگ کر لنگڑاتی ہوئی ہم سے آملی تھی۔

میں نے قافلے کی روانگی کا اشارہ کرتے ہی عورتوں اور لڑکیوں سے کہا کہ وہ اپنے دوپٹے پگڑی کی صورت میں سروں پر باندھ لیں تا کہ سب مرد دکھائی دیں۔ چنانچہ ہم کپورتھلہ روڈ پر روانہ ہوگئے۔ میں نے کھجور کی ایک لمبی شاخ سڑک کے کنارے پڑی اُٹھائی اور پتے توڑ کر اسے "لمبی برچھی نما" بنا کر کندھے پر رکھ لیا۔ اندھیری رات میں وہ ہمارا اسلحہ تھا، ابھی تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ وہ دو تین سکھوں نے ہمیں روک کر تلاشی دینے کو کہا۔

میں نے ان سے کہا کہ ہم سے سب کچھ چھین لیا گیا ہے؟ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا، لیکن ان کی حرکات دیکھ کر خطرہ محسوس کرتے ہوئے میں نے انہیں کچھ رقم دلانے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ انہیں بھی کچھ دے کر جان بخشی کرائی گئی تھی۔

بہرنوع، اللہ کا نام لیتے اور آیات کریمہ کا ورد کرتے ہوئے ہم مستری محمد صدیق کے قائم کردہ دائرۂ امن وسلامتی کے پاس سے گزرنے لگے تو درختوں کے جھنڈ اور خوفناک تاریک رات کی وجہ سے ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں، تھوڑے ہی فاصلے پر گئے ہوں گے کہ ہمیں اذان سنائی دی، پہلے تو ہم نے سمجھا کہ کسی گاؤں میں ابھی مسلمان بیٹھے ہوں گے، یہ نماز فجر کی اذان ہے مگر اس میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے الفاظ نہیں تھے جس سے اندازہ ہوا کہ وہ حملے سے بچے ہوئے مسلمانوں کو اپنے ہاں آ جانے کی دعوت دے رہے ہیں، کچھ وقفے کے بعد پھر اذان دی گئی جس پر یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی خاطر اذان دی گئی ہے، چنانچہ ہم نے کپورتھلہ روڈ چھوڑ کر فصلوں کی پگڈنڈیوں کی راہ لی۔

موضع کڑاہل میں زخمیوں کا اجتماع

جس طرح ہم نے اذان سن کر اس گاؤں کا رُخ کیا تھا، اسی طرح حملہ آوروں سے بچے کھچے اور زخمی مرد، عورتیں کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے ہماری جانب آ گئے، ان میں سے کچھ زخموں سے نڈھال اور کراہ رہے تھے، انہیں تسلی دے کر اپنے ہم قدم کیا کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے ہم اس گاؤں میں پہنچ گئے، جہاں سے اذان سنائی دی

تھی، اردگرد سے کافی تعداد میں مسلمان آرہے تھے، مسلم آبادی کا یہ گاؤں موضع کڑا اہل تھا، رات کے آخری حصے میں گاؤں سے باہر خالی جگہ پر لوگ اکٹھے ہورہے تھے، ڈر کے مارے روشنی اس لئے نہ کررہے تھے تاکہ حملہ آور ہندو سکھ درندے ادھر کا رُخ نہ کرلیں، کرفیو کا ہولناک سماں تھا، تھکے ماندے اور زخموں سے چور وہیں زمین پر لیٹ گئے، شب تاریک کی نبضیں ٹوٹ چکی تھیں، صبح صادق کے ٹھنڈے جھونکوں سے فضا میں خنکی تیر رہی تھی، ہم ہندو سکھ درندوں کے وحشت ناک اولرزہ خیز حملوں سے نڈھال پڑے تھے کہ ایک بار پھر کلمات اذان فضا میں گونجے، اللہ اکبر۔ اللہ بڑا ہے جس نے تلواروں اور برچھوں کی موسلا دھار برسات میں بھی کچھ لوگوں کا دامن خونی چھینٹوں سے بچائے رکھا اور اپنے دیگر مسلمان بھائیوں سے آملایا ہے، ہم نے قریب ہی واقع مسجد میں نماز فجر ادا کی، دن کی ذرا روشنی پھیلی تو گاؤں کے باہر میدان میں خون میں لت پت کئی مرد اور عورتیں زخموں سے نڈھال اور کراہ رہی تھیں، کئی ایسے بھی تھے جن کی گردنیں آدھی کٹ چکی تھیں۔ کسی کے بازو نہ تھے، کئی معصوم بچے زخموں سے خون آلود ہچکیاں لے رہے تھے، بہت سے لوگ بئیں سیاہ (ندی) کے کنارے واقع درختوں اور کھیتوں میں چھپتے چھپائے گاؤں میں پہنچ رہے تھے، سر جھکائے کئی عورتیں اور لڑکیاں بھی خون رنگ لباس میں سہمی ہوئی آرہی تھیں، کئی برہنہ سر، برہنہ پا تھیں، ہر شخص اپنے عزیز واقارب کی تلاش میں تھا کہ ایک گروہ میں مجھے اپنے چند عزیز رشتہ دار مل گئے، ان سے معلوم ہوا کہ حملے کے وقت بچ کر بہت سے افراد واپس سلطان پور پیر ضیاء الدین شاہ صاحب کے ہاں پہنچ گئے ہیں، ان کا گھر بھی چھوٹا سا کیمپ بن گیا ہے، بہت سی عفت مآب عورتیں اور لڑکیاں ہندو سکھ پکڑ کر لے گئے ہیں، کئی نوجوان لڑکیوں نے ریلوے پل کے تالاب میں کود کر جان قربان کردی ہے، کئی ندی میں ڈوب گئے ہیں، منڈی کا میدان جہاں پر قافلے پر حملہ ہوا تھا، وہ فرزندانِ اسلام کی لاشوں سے بھر گیا ہے، کئی ابھی زخموں سے چور کراہ رہے ہیں، کئی زخمی ابھی ندی کنارے سے اپنے رشتہ داروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں، سلطان پور کپورتھلہ روڈ ہندو سکھ حملہ آوروں سے بھر گئی ہے، ایک قیامت کا منظر ہے، ابھی ہم آنے والے زخمیوں کو دیکھ کر انہیں ابتدائی طبی امداد دینے کے انتظامات

میں فکر مند تھے کہ چند افراد کے ساتھ میرے اہل محلہ اور سلطان پور سے بس میں سوار ہو کر جانے والے سید عزیز الحسن شاہ اور سید نوازش علی وغیرہ کو زندہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے، انہوں نے روتے ہوئے بتایا کہ بس میں سوار مرزا سیاوش بیگ، مولوی محمد یعقوب، ان کے بیٹے محمد یوسف اور احمد حسن گھڑی ساز وغیرہ سب کو شہید کرنے کے بعد ہمیں یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ یہ سیدزادے ہیں۔ یا وہ عینی شاہد کے طور پر زندہ رکھنا چاہتے تھے کہ مسلم رہنماؤں کا کیا حشر ہوا ہے، ان حضرات نے شہر کی نامور معزز شخصیات کے نام بھی بتائے جو اس حملے میں شہید کر دیئے گئے تھے، انہوں نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے درندوں کے نام بھی بتائے تھے جنہوں نے شیخ عبدالرحمٰن پاپوش مرچنٹ اور ان کے بھائی شیخ فضل محمد کو شہید کیا تھا، نیز انہوں نے بتایا کہ میاں نظام الدین کے لڑکے ماسٹر غلام نبی کو اس وقت شہید کر دیا گیا، جبکہ وہ حملے میں زخمی والدہ کو ہسپتال لے جانا چاہتے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے لرزہ خیز واقعات بھی بیان کئے جو نا قابل تحریر ہیں۔

ٹکا راجہ کی موجودگی میں پل کانجلی پر مسلمانوں کا قتل عام

سلطان پور میں حملے سے باقی ماندہ زخمیوں اور زندہ لاشوں کا یہ قافلہ اب بھلانہ کیمپ کی جانب تیاری میں مصروف تھا، موضع کڑاہل میں ہمدرد انسانیت اور نہایت مخلص ماسٹر محمد موسیٰ کا گھر چھوٹا کیمپ بن گیا تھا۔ سینکڑوں پناہ گزینوں اور زخمیوں کی خوراک وغیرہ کا انتظام ماسٹر صاحب کے اہل خانہ اور اہل دیہہ نے اس جان فشانی اور جذبہ خدمت کے تحت کیا تھا کہ آج بھی اس کی یاد تازہ ہونے پر ان کے لئے قلبی دعاؤں کا ہدیہ پیش کرتے ہوئے الفاظ کی کمی اور بے مائیگی کا احساس دامنگیر ہے خود راقم الحروف کو روانگی کے وقت ماسٹر محمد موسیٰ صاحب نے راستے کے لئے ایک کھیس اور چادر عطا کی تھی، تاکہ دوران سفر استعمال کی جاسکے، قافلے کی روانگی کے وقت یہ خطرہ بھی درپیش تھا کہ کپورتھلہ کے راستے میں سکھوں کا گاؤں "کھیڑے" واقع ہے، وہاں سے مسلمانوں کا یہ کارواں کیسے بحفاظت گزر سکے گا، چنانچہ اس گاؤں کے چند صلح جو اور اعتدال پسند سکھ رہنماؤں کو بلا کر ان سے بات کرتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا گیا تو انہوں نے یقین دلایا کہ ہمارے گاؤں

میں چونکہ آزاد ہند فوج سے متعلق چند با اثر لوگ موجود ہیں، ہم ان کے تعاون سے اس قافلے کو کپورتھلہ تک پہنچانے کا انتظام کئے دیتے ہیں۔ اس قافلے کی روانگی سے قبل کھیڑے کے سکھوں نے کپورتھلہ روڈ پر مسلح دستے کا انتظام کر کے ہمیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا، سڑک کے دونوں کناروں پر آزاد ہند فوج کے سپاہی مستعد کھڑے تھے، اس وقت سلطان پور کپورتھلہ روڈ صرف قافلے کے لئے مخصوص ہو گئی تھی۔ یہ انتظام صرف کپورتھلہ تک ہی تھا۔ موضع کڑا اہل سے ریٹائرڈ صوبیدار عنایت اللہ خان موٹھانوالہ کے باشندوں پر مشتمل اپنا قافلہ لے کر شریک سفر ہو چکے تھے۔ ہمارے لئے ان کا وجود غنیمت تھا کہ ایک تجربہ کار بزرگ رفیق سفر ہے۔ وہ رانا عبدالرحیم خان ایڈووکیٹ سابق صدر بار ایسوسی ایشن لاہور کے والد ماجد تھے) انہوں نے بتایا کہ دیوان اجودھیا داس سے میری ملاقات ہو چکی ہے اور یقین دلایا ہے کہ اب فساد نہیں ہوگا۔ چنانچہ قافلہ روانہ ہو گیا اور کپورتھلہ شہر سے باہر محلہ مہتاب گڑھ کے کچے راستے سے اس لئے گزارا گیا تا کہ لاشیں باہر جنگل میں ہی ٹھکانے لگائی جا سکیں اور شہر تعفن سے محفوظ رہے، یہ قافلہ جب سبحان پور روڈ پر واقع پل کانجلی پر پہنچا جہاں بئیں سیاہ (ندی) پر چھوٹا سا ڈیم بنا کر کپورتھلہ کی جانب نہر گھراٹ نکالی گئی تھی اور پن چکیاں نصب تھیں، وہاں پر گھنے درختوں اور کھیتوں میں چھپائے نئے مسلح سکھوں نے یک لخت قاتلانہ حملہ کر کے سڑک پر لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے، ایک تلوار بردار سکھ نے مجھ پر حملہ کیا تو میں نہر میں چھلانگ لگا کر غوطہ زن ہو گیا، ظاہر ہے کہ موت سر پر سوار دیکھ کر کچھ دیر تک پانی کے اندر ہی رہا، جب سر باہر نکلا تو نہر میں عورتیں اور بچے جان بچانے کی خاطر ڈبکیاں لے رہے تھے، جو میرے ساتھ آئے انہیں نہر کنارے چھوڑا۔ نہر کنارے درختوں کی اوٹ سے دیکھا تو سڑک پر قتل عام کا سلسلہ جاری تھا، میں جب پل کانجلی کی جانب دوڑ کر گیا تو پل کے پار راجہ کپورتھلہ کا لڑکا ٹکا صاحب (پرجیت سنگھ) اور کپتان جے سنگھ کھڑے قتل عام کی نگرانی کر رہے تھے، نہر کے پل کی دوسری جانب سے موضع کڑا اہل کے ماسٹر محمد موسیٰ صاحب (جن کے گھر میں ہم ٹھہرے تھے) زخمی حالت میں ہماری جانب آئے، ان کا ہاتھ خون سے لبریز تھا۔ دور سے ہی انہیں سلام کہہ کر جب کانجلی کے بڑے پل سے دوڑتے ہوئے گزرا تو سڑک پر بہت سی لاشوں میں اللہ رکھا فوجی کی لاش بھی نظر آئی،

پل کے پار کھجور کی جھاڑی میں وہ لڑکا نزع کی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا، جسے سلطان پور میں اس کی "ماں" اپنے اکلوتے لخت جگر کا بار بار منہ چوم کر زندگی کی دعائیں دے رہی تھیں، میں نے اسے جیب میں رکھے گلاس سے پانی پلانے کی کوشش کی، مگر وہ آخری ہچکی لے چکا تھا، اسے وہیں چھوڑ کر سڑک پر روانہ ہونے لگا تو قتل عام اور چیخ فریاد کا نا قابل برداشت منظر دیکھ کر میں نے کماد کے کھیت میں چھوٹی نالی کی راہ لی، وہاں اکیلا خوفزدہ رواں دواں تھا اور کیفیت یہ تھی۔

مسافر ہوں منزل سے نا آشنا ہوں
نہ جانے کہاں سے کہاں جارہا ہوں

یہ خطرہ دامن گیر تھا کہ کھیت کے اندر گھات میں بیٹھے اگر کسی مسلح ہندو سکھ نے مجھے اکلا پالیا تو وہ میری تکہ بوٹی کر دیں گے، مگر اللہ بڑا ہے وہی حامی و ناصر ہے، اس کلمہ کلام پڑھتا ہوا کھیت کے اندر دور تک چلا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کماد کا یہ کھیت کہاں تک ہے اور آگے کیا ہے؟ البتہ سڑک کی جانب چیخ پکار ہائے مر گئے کی المناک فریادیں سن کر یقین تھا کہ راستہ ادھر کو ہے۔ کھیت سے باہر نکلا تو آگے پانی کا بڑا جوہڑ تھا اور دائیں بائیں سکھ قتل عام کر رہے تھے، میں جوہڑ کے درمیان تیر کنارے پہنچا آگے سڑک پر کپورتھلہ کی جانب قتل عام کا لرزہ خیز منظر تھا، لیکن سبحان پور کی جانب کچھ حصہ خالی تھا، کیونکہ وہاں جرنیلی سڑک قریب تھی اور فوجی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں، ابھی تھوڑے فاصلے پر گیا تھا کہ تیز رفتار فوجی جیپ نے حملہ آور سکھوں پر فائرنگ شروع کر دی اور میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ڈرو مت، جرنیلی سڑک کے سامنے ہے، ہانپتے کانپتے جب سبحان پورے ریلوے پھاٹک کے قریب گیا تو وہ ڈیرہ سیداں متصل سلطان پور کے فرشتہ سیرت اور حسن و جمال کے پیکر مولانا سید مظفر حسین شاہ شہید کی لاش دیکھ کر بہت پریشان ہوا، ان کے ساتھ اور بہت سے مسلمانوں کی لاشیں بھی پڑی تھیں، وہاں سے جب جرنیلی سڑک پر گیا تو جالندھر کی جانب سے پیدل اور گڈوں پر قافلے پاکستان کی جانب رواں دواں تھے۔

جالندھر کی جانب جانے والے ایک فوجی کی جیپ کو روک کر میں نے ان سے

پل کانجلی پر قتل عام اور لڑکیوں کے جبراً اغوا کا بتایا کہ ابھی وہ عورتیں اور لڑکیاں سڑک کے کنارے کماد کے کھیتوں میں ہوں گی تو سنتے ہی اس نے دوسری فوجی گاڑیوں کا رخ ادھر کر کے تیز رفتاری کے ساتھ کھیتوں سے حملہ آوروں پر فائر کھول دیئے تھے۔ ابھی میں حمیرہ شوگر ملز کے قریب فوجیوں کے کیمپ پہنچا ہی تھا کہ کپورتھلہ روڈ سے بہت سی عورتوں اور لڑکیوں کو جیپوں میں سوار کرا کے وہاں لے آئے۔ ایک فوجی نے مجھے بتایا کہ کھیتوں میں سے اکثر مسلم خواتین ہم نے چھڑا لی ہیں۔ مزید ارد گرد کے کھیتوں اور دیہاتوں کا ہم نے محاصرہ کر لیا ہے، ان کی فرض شناسی اور مستعدی پر دعائیں دے کر میں ایک فوجی جیپ کے ذریعہ بھلانہ کیمپ میں پہنچ گیا۔ وہاں تلونڈی چودھریاں کے دیہاتی قافلے میں شریک میرے پھوپھا پھوپھی سمیت تمام افراد کنبہ سے ملاقات کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔ جبکہ وہ سب میری بابت پریشان تھے، کیونکہ سلطان پور شہر میں ہونے والے حملے کے بعد سب کی شہادت مشہور ہو گئی تھی، (یاد رہے کہ میرے والدین کی وفات کے بعد دو سال کی عمر میں میری پرورش میری پھوپھی صاحبہ مرحومہ نے کی تھی، وہی میرے ماں باپ تھے وہاں پر رشتہ داروں کے علاوہ اور بہت سے متعارف لوگ مل گئے تھے۔ (الحمد للّٰہ علیٰ احسانہ)

بھلانہ کیمپ کی حالت زار

ریاست کپورتھلہ کی حدود سے نکل کر اب ہم جرنیلی سڑک (جالندھر، امرتسر لاہور روڈ) پر واقع بھلانہ کیمپ میں تھے، یہاں آتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، جو تین روز تک جاری رہی، اس دوران سب سے کربناک صورت یہ تھی کہ جو مصیبت زدہ بھائی سلطان پور اور پل کانجلی کے لرزہ خیز حملوں میں شدید زخمی ہو گئے تھے، ان کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے، ابتدائی طبی امداد کے فقدان کی وجہ سے کئی زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے تھے، یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سلطان پور اور پل کانجلی وغیرہ مقامات پر زخمی شدہ بعض ایسے باہمت حوصلہ مند اور صابر و شاکر حضرات بھی تھے جن کے زخموں پر مکھیاں شہد کی مکھیوں کی مانند جمع تھیں، کیڑے پڑ جانے کے باعث بدبو پھیل چکی تھی، کئی ایسے زخمی بھی تھے جن کی گردنیں آدھی پچھلی جانب سے کٹ چکی تھیں اور

شاہ رگ کا حصہ باقی تھا، اسے کپڑے سے باندھ کر سہارا دیا گیا تھا، زخمیوں کی حالت نا قابل بیان تھی، اس کے باوجود وہ لوگ نہایت صبر واستقامت کے ساتھ یہ دُکھ صرف اس لئے برداشت کر رہے تھے کہ اسلامی مملکت پاکستان میں اللہ کے دین کی حفاظت ہوگی اور اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور سنت طیبہ پر عمل ہوگا، ہر طرف اسلام کی پاکیزہ معاشرت کا دور دورہ ہوگا، اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کے وسیع تر مفادات کی خاطر وہ لوگ اپنے دُکھ درد کی ٹیسیں محسوس نہیں کر رہے تھے۔

بہر نوع بارش تھمنے پر انہیں کیمپ میں واقع ڈسپنسری میں داخل کرا کے علاج معالجے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بھلانہ کیمپ اب ریاست کپورتھلہ، جالندھر، لدھیانہ اور ہوشیار پور کے اضلاع سے آنے والے قافلوں کا مرکز بن گیا تھا، بھلانہ کیمپ سے قافلوں کی روانگی کا حکم ملا۔تو اکثر پیدل اور کچھ دیہاتی حلقے سے آنے والے گڈوں پر سوار تھے، یہ کارواں رفتہ رفتہ دریائے بیاس عبور کر کے ضلع امرتسر کی حدود میں داخل ہوگیا تھا، دریائے بیاس کے پل سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ دریا کا پانی سرخ تھا، بے گناہ انسانوں مظلوم فرزندانِ اسلام کے خون ناحق سے دریا اور نہریں خونی رنگ ہو چکی تھیں، دریائے بیاس میں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی بے شمار لاشیں اس طرح تیرتی دکھائی دے رہی تھیں، جیسے لکڑی کے شہتیر اور تختے۔

نہ پوچھ ابلیس کی سازش سے انسانوں پہ کیا گزری؟

یہ قافلہ امرتسر کے باہر نہر کے کنارے سڑک پر تین دن رہا، بارش کے سبب لوگ سخت پریشان رہے، امرتسر سے گزرنے والے قافلوں پر حملے کر کے انہیں ہندو سکھ درندے شہید کر دیتے تھے، ان پر بم پھینک دیتے تھے، مسلمان ملٹری حالات کا جائزہ لے کر قافلے پاکستان روانہ کرتی تھی۔ اسی دوران ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ کئی اس میں شہید ہو گئے تھے جو بچ گئے ہیں پاکستان میں پہنچ گئے۔ (الحمدللہ)

......☆......

اب سلطان پور کے اِسی قافلے میں شامل محترمہ زبیدہ خانم ایڈووکیٹ کی داستانِ خونچکاں، ان کی اپنی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

ہجرت کی داستانِ الم

تحریر: محترمہ زبیدہ خانم ایڈووکیٹ، بنت ڈاکٹر غلام محمد خاں مرحوم شہید

''ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق موضع فتووال تحصیل سلطان پور لودھی ریاست کپورتھلہ سے تھا، لیکن ہمارے بزرگ تقریباً ایک صدی پیشتر ریاست پٹیالہ میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ہم سب بہن بھائی ریاست پٹیالہ ہی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ 14 اگست 1947ء کو جب قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا تو اس وقت ہم لوگ اپنے گاؤں میں تھے، کیونکہ گندم کی کٹائی کے موقعہ پر ہم سب گھر والے اکثر گاؤں ہی میں ہوتے تھے''۔

''میری بڑی بہن کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ اگر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو دیہات میں زیادہ خون خرابہ ہوگا اور شہر اور قصبے محفوظ رہیں گے، کیونکہ وہاں شہریوں کی حفاظت کے لئے پولیس اور فوج موجود ہوگی''۔

''نصف اگست تک ہمارے دیہاتوں میں بالکل امن و امان تھا۔ رات کو کبھی کبھار دریا پار آگ کے شعلے نظر آتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دریا پار ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے ہیں۔ گاؤں کی پُر امن فضا کے باوجود ہمیں اپنے گاؤں والا گھر چھوڑ کر قریبی قصبہ سلطان پور میں ایک کرائے کے مکان میں رہائش اختیار کرنی پڑی، کیونکہ میری آپا کی ضد تھی کہ وہ گاؤں میں نہیں رہیں گی۔ ابھی ہمیں قصبہ میں منتقل ہوئے تیسرا دن تھا کہ پورا قصبہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ قصبہ کی سڑکوں پر جگہ جگہ فوجی ٹرک نظر آتے تھے۔ پورے علاقے میں کرفیو نافذ ہو گیا اور اندھا دھند فائرنگ کی آوازیں ساری رات

گونجتی رہیں۔ اس وقت تک ہم لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ فوج امن بحال کرنے کے لئے طلب کی گئی ہے یا کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے"۔

"آدھی رات کو میرے بھائی کا ایک دوست اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہ جانے کس طرح ہم تک پہنچا اور اس نے بتایا کہ "آدھا شہر خالی ہو چکا ہے۔ لوگ قافلوں کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لئے کھیتوں میں سے ہو کر شہر سے نکل رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی اپنا قافلہ تیار کر لیا ہے اور میں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں"۔

"ہم سب اس قافلہ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے، لیکن پھر آپا ہی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے بچے چھوٹے ہیں اور میں انہیں لے کر پیدل نہیں جا سکتی، ہاں اگر سواری کا کوئی انتظام ہو تو پھر بہتر ہے، لیکن نہ سواری کا انتظام ممکن تھا اور نہ ہی ہمارا جانا۔ جاتے جاتے وہ شخص یہ کہہ گیا کہ اگر آپ لوگ آج رات نہ نکل سکے تو کبھی اس آگ سے باہر نہ نکل سکیں گے"۔

"جس محلہ میں ہم جا کر رہے تھے، وہ پورا ویران ہو چکا تھا، ایک انسان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ تمام لوگ راتوں رات جا چکے تھے۔ میرے بھائی نے اگلی دوپہر کو باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ پولیس یا فوج کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ اس وقت کا فائدہ اُٹھا کر ہم سب صرف نقدی اور زیور لے کر قریب کے ایک محلہ میں جو لوہاراں کا محلہ مشہور تھا، وہاں منتقل ہو گئے۔ یہ محلہ مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ تھی، محلہ کے لوگوں میں مرنے یا مارنے کا جذبہ موجود تھا۔ محلہ کے دو راستے تھے اور دونوں پر لوہے کے مضبوط گیٹ لگے ہوئے تھے۔ جس گھر نے ہمیں پناہ دی وہاں ہماری ہی طرح اور بھی بہت سے خاندانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اس گھر کا سربراہ اور بم بنانے کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا، اس لئے وہ بیوی اور پانچ بچوں کو چھوڑ کر راتوں رات فرار ہو چکا تھا۔ محلہ کے تمام لوگ سیدھے سادھے ان پڑھ لوگ تھے۔ میرے بھائی جو 24 سالہ جوان تھے اور نہایت اچھی صحت اور قد قامت والے تھے، انہوں نے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے بتایا کہ ہم سب کے لئے وہاں سے فرار ہونا تو ممکن ہی نہیں تھا، اس لئے ہمیں آخری سانس تک

کافروں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اگر کوئی بچ نکلا تو خیر ورنہ شہادت سے بڑھ کر اور کون سی سعادت ہوسکتی ہے۔ ہم تینوں بہن بھائیوں نے اپنے جوش ولولہ اور حدت ایمان سے وہاں کے لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میرے بھائی نے جوان لڑکوں کو اکٹھا کرکے چار گروپ بنائے اور محلہ کے چاروں سمت چھتوں پر مورچے بنا کر سب کو بٹھادیا۔ میں نے اور آپا نے عورتوں سے کہا کہ ہر گھر کے چولہے پر بڑے بڑے پتیلوں میں پانی اُبلنے کے لئے رکھ دو اور اس میں اگر ہوسکے تو مرچیں بھی ڈال دو۔

تمام رات ہندوؤں کے گھر والوں کی چھتوں پر سے ہم لوگوں پر فائرنگ ہوتی رہی اور جواب میں ہماری طرف سے بھی گولی کا جواب گولی سے ملتا رہا۔ میں اور آپا تمام رات چھت پر ہی رہیں تاکہ مردوں کو جس چیز کی بھی ضرورت پڑے مہیا کرسکیں۔ ساری رات گولیاں ہمارے سروں پر سے گزرتی رہیں اور کئی بار ہم لوگ بال بال بچے، لیکن جذبہ ایمان نے وہ طاقت ہمت اور حوصلہ بخشا تھا کہ موت کا کوئی خوف نہ تھا۔ کلمہ طیبہ کا ورد جاری تھا تاکہ کسی کو گولی لگ جائے تو مرتے وقت کلمہ زبان پر ہو"۔

"تمام جوان لڑکیاں اور لڑکے چھتوں پر تھے، جبکہ بڑے بوڑھے اور بچے نیچے تھے۔ رات کے تین بجے سکھوں نے محلّہ پر بھرپور حملہ کیا، لیکن ہمارے جانبازوں نے اتنے بم اور گولیاں برسائیں کہ وہ بھاگ گئے، لیکن ان کے بھاگنے سے یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ دوبارہ اور زیادہ طاقت سے حملہ کریں گے۔ آدھا دن گزر گیا، لیکن کوئی دشمن نظر نہ آیا"۔

"دوپہر کو تقریباً ایک بجے سکھوں، ہندوؤں نے پھر حملہ کیا، کئی حملہ آور ہمارے جوانوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ہمارے لڑکوں کو بھی کارتوسوں کے کچھ چھرے لگے۔ میرے بھائی کے داہنے ہاتھ پر بھی معمولی زخم آئے، لیکن دشمن ایسے بدحواس ہوکر بھاگے کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں تک چھوڑ گئے۔ جب دشمنوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اس محلّہ کے اندر رہتے ہوئے وہ ہم لوگوں پر قابو نہیں پاسکتے تو انہوں نے مکروفریب کا سہارا لیا۔ انہوں نے سکھ فوج کو بلالیا۔ شام کے چار پانچ بجے کے قریب ایک سکھ فوجی دستہ آیا جنہوں نے کہا کہ سرکاری طور پر مسلمانوں کو پاکستان بھیجنے کے لئے کیمپ قائم کردیا گیا ہے

اور فوج ہمیں بحفاظت کیمپ تک پہنچادے گی۔ پاکستان کا نام سنتے ہی لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور بغیر کسی شک وشبہ کے لوگوں نے محلّہ کے آہنی دروازے کھول دیئے۔ اس وقت کوئی ہندو یا سکھ نظر نہیں آیا اور تمام لوگ بحفاظت کیمپ تک پہنچ گئے۔

''شہر میں داخل ہوتے ہی عیدگاہ کی مسجد تھی او یہاں کے بالکل سامنے لڑکوں کا سکول تھا۔ تمام مردوں کو عیدگاہ کے احاطہ میں نظر بند کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو سکول کی عمارت میں بند کر دیا گیا''۔

پچھلی رات بھی ہم لوگوں نے کچھ نہیں کھایا تھا، سارا دن کھانے کو کچھ نہیں ملا اور نہ ہی رات کو کیمپ میں کسی نے کچھ کھانے کو دیا۔ لوگ آتے ہوئے گھروں سے بھنے ہوئے چنے، پنجیری وغیرہ جو انہوں نے پاکستان تک سفر کے لئے پہلے سے ہی تیار کر رکھی تھی، وہ ساتھ لے آئے تھے۔ لیکن ہم لوگ تو وہاں بھی غریب الوطن تھے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر اجنبی لوگوں سے پناہ لی تھی، کسی کو بھی جانتے پہچانتے نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے ایک خاندان سے تھوڑے سے چنے لے کر بچوں کو دیئے اور پانی پلا کر سلا دیا۔ رات بھر ہم لوگ خدا کو یاد کرتے رہے۔ اگلا دن نکلا تو مردوں نے اپنے بیوی بچوں سے ملنے کی کوشش کی، لیکن کسی کو اجازت نہ ملی۔ سارا دن کھانے کو پھر کچھ نہ ملا، پانی پی پی کر گزارہ کرتے رہے۔ اس روز سکھ فوج نے ایک نئی چال چلی۔ سب عورتوں سے کہا کہ جس کے پاس جتنا زیور ہے، وہ جمع کرا دے، ورنہ راستہ میں خطرہ رہے گا۔ پاکستان جاتے ہی سب چیزیں واپس مل جائیں گی، کیونکہ یہ چیزیں سرکاری طور پر وہاں پہنچادی جائیں گی۔ سادہ لوح دیہاتیوں نے فوراً اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی لا کر ان کے قدموں میں ڈال دی اور رسیدیں حاصل کر لیں۔ ہمیں تو معلوم ہی تھا کہ یہ محض ایک چال ہے، اس لئے ہم نے کوئی چیز انہیں نہیں دی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ زیورات کس طرح چھپائے جائیں، تاکہ وہاں سے نکلتے ہوئے باہر لے جاسکیں۔ کافی تلاش کے بعد ہمیں ایک مٹی کا برتن مل گیا، جس میں اچار بھرا ہوا تھا اور اس کا کوئی وارث نظر نہ آیا۔ ہم نے یہ موضع غنیمت جانا اور آدھا اچار نکال کر اس میں زیورات

ڈال دیئے اور باقی کا آدھا اچار زیورات کو چھپانے کے لئے اُوپر ڈال دیا اور اس برتن کو ایک کپڑے میں باندھ لیا۔

شام کے قریب فوج نے یہ خوشخبری سنائی کہ ہمارا قافلہ پاکستان کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مردوں کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مل کر چلیں۔ ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ وہ سب سے پہلے اس قید خانے سے باہر نکلے، لیکن میرے والد اور بھائی رش نکل جانے کا انتظار کرتے رہے۔ اس لئے ہم تمام گھر والے قافلہ کے آخری حصہ میں تھے۔

لوگوں کا یہ جم غفیر جب شہر کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو تمام ہندو اپنے گھروں کے باہر اور چھتوں پر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک بازار میں سے ہم گزرے تو میرے والد کا ایک دوست بھیڑ چیرتا ہوا اباجی سے ملنے آیا۔ جب وہ اباجی سے بغلگیر ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم سمجھے کہ دوست سے بچھڑنے کے غم میں ڈاکٹر لال چند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اسے یہ معلوم ہے کہ وہاں سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہمارا انجام کیا ہونے والا تھا۔

جس وقت آرمی والوں نے ہمیں کیمپ سے نکالا تو سکول کے گیٹ پر چاولوں کی ایک دیگ میں سے بھوکے مہاجرین کو چاول تقسیم کر رہے تھے۔ تین دن کے بھوکے لوگ ان چاولوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو کچل رہے تھے۔ میرے بھائی نے بھی تقریباً دو مٹھی چاول اپنے رومال میں لے لئے۔ مجھے ان کی یہ بات ناگوار گزری اور میں نے ان سے کہا کہ آپ کو یہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر میرے بھائی نے جو جواب دیا وہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ میرے بھائی نے کہا کہ "مجھے اس وقت اس قدر بھوک لگی ہے کہ میں درختوں کے پتے بھی کھا سکتا ہوں"۔ چالیس سال گزرنے کے بعد آج بھی جب کھانے میں ان کی پسند کی کوئی چیز بنتی ہے تو ان کی وہی بھوک اور بے بسی یاد آ جاتی ہے اور نوالہ حلق میں پھنس جاتا ہے۔

شہر کی سڑکوں سے ہوتے ہوئے جب ہمارا قافلہ شہر سے باہر نکلا تو ہر سمت سے

سکھوں کے غول تلواروں اور بھالوں سے مسلح کھیتوں میں سے نکل کر ہمارے آگے آگے بھاگے جارہے تھے۔ قافلہ کا اگلا حصہ تو صحیح وسالم گزر گیا، لیکن درمیانی حصہ جب سڑک پر آیا تو آرمی والوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ یہ فائرنگ ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت حملہ آوروں کو اشارہ تھا۔ یہ اشارہ ملتے ہی قافلہ والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میدان حشر کا سماں تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ حملہ ہوتے ہی میرے والد، بھائی اور بھابی تو ہم سے بچھڑ گئے۔ ہر سمت تلواریں چمک رہی تھیں۔ نہتے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ وپکار سے پوری فضا گونج رہی تھی۔ اس ظلم وستم اور بربریت کی تاب نہ لاتے ہوئے سورج نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں، اب اندھیرا چھانے لگا تھا لیکن قتل وغارت گری میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ میں نے مٹی کا وہ برتن جس میں ہم نے اچار کے نیچے زیورات چھپائے ہوئے تھے۔ وہ پکڑا ہوا تھا اور اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنے گھر والوں کو تلاش کر رہی تھی۔ کپورتھلہ کو جانے والی سڑک کافی اُونچی تھی اور دونوں طرف کھیت کافی نشیب میں تھے۔ اچانک مجھے اپنی بڑی بہن اور ان کے دونوں بچے نظر آئے۔ آپا نے مجھے اشارہ کیا کہ برتن پھینک دو اور آ کر چھپ جاؤ۔ آپا اور بچے سڑک کے بالکل نیچے ڈھلان کے ساتھ چمٹے بیٹھے تھے۔ میں نے بھی فوراً زیورات پھینک دیئے اور ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اب اندھیرا بڑھتا جارہا تھا، اسی اندھیرا کا فائدہ اُٹھا کر ہم نے کھڑے ہو کر دیکھا تو سڑک پر کوئی نہ تھا۔ تمام وحشی کھیتوں کی طرف چلے گئے تھے اور چھپے ہوئے لوگوں کو نکال نکال کر بے دریغ قتل کر رہے تھے۔ میں نے اور آپا نے دونوں بچوں کو اُٹھا کر سڑک پار کی اور سڑک کی دوسری جانب درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ جس کے درمیان میں پانی کا جوہڑ تھا، ہم نے چھپنے کے لئے یہی جگہ مناسب سمجھی۔ ہم دونوں بہنیں جوہڑ کے اندر کنارے کے ساتھ بالکل سیدھی لیٹ گئیں، پانی گہرا نہیں تھا۔ اس لئے ہم نے دونوں بچوں کو اپنے اُوپر لٹایا۔ ایک بچہ آپا کے سینے سے لپٹا ہوا تھا اور ایک میرے ساتھ۔ آپا کی بیٹی 4 سال کی تھی اور بیٹا دو سال کا، یہ گیارہ ستمبر کی رات تھی۔ موسم بدل رہا تھا، تقریباً آدھی رات کے وقت پانی میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے ہمارے جسم ٹھٹھر گئے اور دانت بجنے لگے۔ دونوں

بچوں کو شدت سے پیاس لگی تھی۔ ہم نے چلو بھر بھر کر جوہڑ کا پانی انہیں پلا دیا۔ پیاس بجھنے کے بعد اس قیامت کی رات میں بھی معصوم بچے سو گئے۔ رات بھر مائیں اپنے بچوں کی لاشوں پر بیٹھی بین کرتی رہیں۔ معصوم دوشیزاؤں کی عصمتیں لٹتی رہیں اور ان کی چیخ و پکار سے زمین تو زمین آسمان بھی لرزتا رہا۔ لٹتی ہوئی عورتیں اپنے عزتوں کے رکھوالوں کو بے بسی سے پکارتی رہیں، لیکن ان کے محافظ تو جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ ان کی مدد کون کرتا۔ ظلم و بربریت کی کوئی ایسی مثال نہ تھی، جو اس رات پوری نہ ہوئی ہو۔ حملہ آوروں میں سے ہی ٹولیاں بنا کر لوگ سڑک پر پڑا ہوا سامان اکٹھا کر رہے تھے اور بین کرتی ہوئی ماؤں کی نقلیں اُتاری جا رہی تھیں۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، ایک نیا خوف طاری ہو رہا تھا کہ دن کی روشنی میں کہاں پناہ لیں گے۔ یہ تمام راستے ہمارے لئے بالکل اجنبی تھے، ویسے بھی وحشی درندوں سے کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ جب بچے پانی کی خنکی کو برداشت نہ کر سکے تو ہمیں مجبوراً پانی سے نکل کر جوہڑ کے کنارے پر آنا پڑا۔ کسی مظلوم کا ایک کمبل گرا پڑا تھا، وہ اتفاقاً اندھیرے ہی میں آپا کے ہاتھ آ گیا۔ آپا وہی کمبل لپیٹ کر بچوں کو چھپا کر لیٹ گئیں۔

میری آپا دراز قد اور خوبصورت تھیں۔ عمر تقریباً تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ساری رات ان پر ایک ہی خوف مسلط تھا کہ آبرو پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ زندگی کی تو ہمیں رتی برابر پروا نہ تھی۔ تمام رات آپا مجھے تاکید کرتی رہیں کہ دیکھ کسی قیمت پر بھی کافروں کے ہاتھ نہیں آنا۔ کسی طرح بھی اپنی جان دے دینا لیکن عصمت بچا لینا۔ ابھی پو پھٹی تھی کہ تازہ دم دشمنوں کے جتھے پھر بچے کھچے مسلمانوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانے کے لئے آ گئے۔ اسی اثناء میں ہماری والدہ بھی ہم سے آ ملی تھیں، لیکن ابا جی، بھائی اور بھابی کا کوئی پتہ نہ تھا۔

رات کی تاریکی میں آپا نے جوہڑ کی مٹی لے کر اپنے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر مل لی تھی اور مجھے بھی مٹی ملوا دی تھی، تاکہ جلد کی سفید رنگت کسی کو نظر نہ آئے۔ ہم درختوں کے جھنڈ میں ایک ہی جگہ سب مل کر بیٹھے ہوئے تھے کہ سکھوں نے آ کر میری آپا کو اُٹھنے کے لئے کہا۔ آپا نے اپنے گرد کمبل لپیٹا ہوا تھا، چہرہ اور سر اسی میں چھپایا ہوا تھا۔ وحشیوں نے تین چار بار اپنا حکم دہرایا اور جب کوئی تعمیل نہ ہوئی تو غصہ سے بے قابو ہو کر کمبل کھینچ کر آپا کو

دھکے سے زمین پر گرادیا۔ ایک سکھ درندے نے اپنا پاؤں آپا کے سینے پر رکھ کر وار کرنا شروع کر دیے۔ میں اماں اور دونوں بچے بالکل پاس بیٹھے تھے، لیکن غم اور خوف کی شدت سے نظر بالکل جواب دے گئی۔ صرف ایک آواز آتی رہی جیسے کلہاڑی سے کوئی ہڈی کاٹی جائے تو آتی ہے۔ تین چار منٹ کی بربریت کے بعد وہ درندے آپا کو خاک اور خون میں لتھڑا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ ہماری طرف انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ ان کے جانے کے کافی دیر بعد جب کچھ حواس درست ہوئے تو میں نے اُٹھ کر آپا کا جسم اپنی گود میں رکھا تو وہ خون میں لپت پت تھا، آپا کی شہ رگ کی جگہ ایک سوراخ تھا جس سے اندازہ لگایا کہ شاید درندوں نے نیزہ کی نوک کی متواتر ضربوں سے یہ سوراخ کیا ہوگا۔ آپا کی سانس ابھی چل رہی تھی، لیکن سانس میں خرخراہٹ تھی۔ میں جوہڑ سے پانی لینے گئی کہ آپا کے منہ میں ڈالوں، لیکن دن کی روشنی میں پتہ چلا کہ جس جوہڑ میں میں نے ساری رات گزارا اور بچوں کو وہاں سے پانی بھی پلایا۔ وہ جوہڑ بے گناہوں کی لاشوں سے بھرا پڑا تھا اور پانی کا رنگ بالکل خون جیسا تھا۔ ابھی ہم آپا کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ سکھوں کا ایک اور جتھہ آگیا اور انہوں نے ہمیں زبردستی وہاں سے نکال کر سڑک پر چلنے کے لئے مجبور کیا اور یہ کہہ کر کہ آگے تم لوگوں کے لئے کیمپ قائم کیا گیا ہے اور جو کوئی بچ گیا ہے وہ وہاں پہنچ جائے۔

سڑک کے کنارے مجھے وہی مٹی کا برتن پڑا نظر آیا جسمیں ہمارے سارے زیورات محفوظ تھے۔ دل چاہا کہ اٹھالوں، لیکن والدہ نے منع کر دیا کہ جب اتنی جانیں لٹ گئیں تو اس سونے کی کیا اہمیت ہے۔ ابھی سڑک پر تھوڑی دُور ہی چلے تھے کہ وہاں شیطانوں کے ایک گروہ کے پاس کوئی بیس کے قریب عورتیں کھڑی نظر آئیں۔ یہ بے بس عورتیں بھی رات کے اندھیرے میں درندوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں، لیکن اجالا ہوتے ہی ان وحشیوں کے قابو آگئی تھیں۔ وہ خوفناک اور مکروہ شکلیں آج تک آنکھوں کے سامنے ہیں، ان کی آنکھوں میں جو شیطانیت چمک رہی تھی۔ والدہ نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بچوں کو لے کر بھاگ جاؤں۔ ابھی تک میں کافی پیچھے تھی اور کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑی تھی۔ میں فوراً دونوں بچوں کو لے کر بیٹھ گئی اور سڑک کی ڈھلان کی طرف سے پھسل کر ہم تینوں سڑک سے

نیچے اُتر گئے۔ تھوڑی دیر تک ہم لوگ لیٹ کر آگے کھسکتے رہے۔ جب دیکھا کہ کوئی آس پاس نہیں تو اُٹھ کر خود جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے چلنا شروع کر دیا۔ کافی دور جانے کے بعد عورتوں اور بچوں کی ایک ٹولی ہم سے آن ملی۔ اب ہمارے ساتھ 12 بچے اور 7 عورتیں تھیں، اکثر بچے بالکل لاوارث ہو گئے تھے۔ کئی کے گھر والے یا تو بچھڑ گئے تھے یا سامنے شہید ہو چکے تھے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہمیں ایک چھوٹی چھپڑی کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ایک نوجوان لڑکا نظر آیا۔ رات سے لے کر اب تک یہ پہلا زندہ مرد نظر آیا تھا۔ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ دشمنوں سے بچنے کے لئے ہم لوگ اتنی خاموشی سے چل رہے تھے کہ اشاروں میں بات کرتے تھے۔ اس نوجوان کو دیکھ کر ہم نے اشارے سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا، لیکن ہماری بات کے جواب میں اس نے جس بے بسی سے اپنی قمیص اٹھا کر اپنی حالت دکھائی وہ منظر آج تک نہیں بھلا سکی۔ اس لڑکے کی تمام انتڑیاں ڈھیر کی صورت میں اس کے گھٹنوں پر پڑی تھیں اور اس نے قمیص سے چھپائی ہوئی تھیں، وہ بیس بائیس سال کا نہایت خوبرو جوان لڑکا تھا، لیکن چند گھنٹوں کا مہمان تھا اور ہم اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر آگے چل پڑے۔

ابھی تھوڑی ہی دُور چلے تھے کہ اُوپر سڑک کی جانب سے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ خوف و دہشت کی وجہ سے ہمارے اُٹھتے ہوئے قدم خود بخود رُک گئے، کیونکہ چلنے سے راستہ میں گرے ہوئے سوکھے پتوں کی جو آواز نکلتی تھی وہ ہماری نشاندہی کے لئے کافی تھی۔ میں نے فوراً قریب کی گھنی جھاڑیوں میں بچوں کو چھپا دیا اور انہیں تاکید کی کہ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے وہ باہر نہ نکلیں۔ میرے بھانجا بھانجی بہت چھوٹے تھے، اپنا برا بھلا سمجھنے کے قابل نہ تھے، اس لئے ان کی نگرانی ان سے بڑے بچوں کے حوالے کی جو ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارے ساتھ لوہاروں والے محلہ کی وہ عورت بھی تھی جس کے گھر میں ہم نے کرفیو کے دوران پناہ لی تھی اور اس کے تین بچے بھی ساتھ تھے۔ اس عورت کا شوہر بم بنانے کے جرم میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس لئے وہ بیوی بچوں کو گھر میں چھوڑ کر پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اور اب اس کی بیوی اس حالت میں ہمارے ساتھ تھی کہ وہ بالکل برہنہ تھی اور

اپنے آپ کو کسی حد تک چھپانے کے لئے اس نے سر پر پڑا ہوا کوئی دوپٹہ اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔

ہم سب لڑکیاں اور عورتیں بچوں سے الگ ایک جگہ دم سادھ کر بیٹھ گئے کہ سڑک پر چلنے والے دشمن ذرا دُور نکل جائیں تو پھر سب آگے چلنا شروع کر دیں۔ کافروں کا پسندیدہ خونی کھیل یہ تھا کہ وہ ماں باپ کے سامنے بچوں کو قتل کر کے لطف اندوز ہوتے تھے یا پھر بچوں کے سامنے ان کی ماؤں کو شہید کرتے تھے اور پھر بچوں کو۔

سب گھر والوں کے بچھڑنے کے بعد یہ دونوں بچے میرے لئے سرمایہ حیات تھے اور ان کو بچانے کے لئے میں ہر لحہ اپنی زندگی داؤ پر لگنے کے لئے تیار تھی۔ یہ بچے میری اس بہن کی نشانی بن کر رہ گئے تھے، جو مجھے اپنی والدہ سے زیادہ عزیز تھی، کیونکہ وہ مجھ سے تقریباً تیرہ چودہ سال بڑی تھیں اور سارا بچپن انہی کی گود میں گزرا تھا۔

ہماری اتنی احتیاط کے باوجود دشمنوں کو ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا اور وہ سڑک چھوڑ کر نیچے اتر آئے، اب کسی طرف بھاگنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ہماری ٹولی میں جو عورتیں تھیں ان میں دو ماؤں کے پانچ بچے ساتھ تھے۔ پانچ بچے بالکل لاوارث تھے۔ دو عورتیں ایسی تھیں جو اپنے سب بچوں کو پاکستان کی راہ میں قربان کر چکی تھیں۔ میرے علاوہ دو لڑکیاں اور تھیں۔ دشمنوں نے آگے بڑھ کر حکم دیا کہ تینوں لڑکیاں الگ ہو جائیں۔ میرے کانوں میں آپا کے الفاظ گونجنے لگے کہ "جان قربان کر دینا لیکن عزت بچا لینا"۔ میں نے ان درندوں کو اشتعال دلانے کے لئے خوب گالیاں دیں تا کہ وہ مجھے میری بہن کی طرح شہید کر دیں، لیکن وہ لوگ مشتعل نہیں ہوئے نہ ہی انہوں نے مجھے کچھ کہا، مگر وہ خونخوار آنکھوں سے برابر دیکھتے رہے۔ یہ سات یا آٹھ آدمی تھے، بلکہ جوان لڑکے تھے اور ان کے حلیے سے لگتا تھا کہ وہ نہایت نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ صرف لنگوٹیاں پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں لوہے کی موٹی سلاخوں کے بنے ہوئے نیزے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے رویے سے لگتا تھا کہ وہ اپنے مالکان کے حکم پر لڑکیاں اکٹھی کر کے کہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اب ایک ہی اُمید باقی رہ گئی تھی کہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ایک پہاڑی

ندی جسے ''وائیں'' کہتے تھے، راستہ میں پڑتی تھی، میں نے فوراً دل میں فیصلہ کرلیا کہ جب ''وائیں'' کے پاس پہنچیں گے تو میں ندی میں کود جاؤں گی۔ کافی دُور چلنے کے بعد آخر وائیں آگئی جیسے ہی میں نے قدم تیز کیے وہ لوگ شاید بھانپ گئے کہ میرا ارادہ کیا تھا۔ انہیں شاید اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ مسلمان لڑکیاں عزت کے مقابلہ میں جان زیادہ آسانی سے دے سکتی ہیں۔ اس لئے انہوں نے حلقہ بنا کر ہم تینوں لڑکیوں کو درمیان میں لے لیا، یہ خدا کا کرم تھا کہ اب تک کسی کافر نے مجھے انگلی تک نہیں لگائی تھی، یہی وجہ تھی کہ جب دشمنوں نے ہمیں ساتھ چلنے کو کہا تو میں خود بخود چل پڑی تھی تا کہ کسی کافر کو مجھے زبردستی کھینچنے کی نوبت نہ آئے۔

اب بے بسی کا یہ عالم تھا کہ چاروں طرف بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔ اس لئے بے بسی کے عالم میں نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں اور دل کی گہرائیوں سے ایک فریاد نکلی کہ ''اے اللہ کہاں ہیں تیرے فرشتے جنہیں تو مسلمانوں کی مدد کے لئے اتارتا ہے''۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس دور میں معجزے عمل میں نہیں آتے، لیکن میری اس فریاد پر جو معجزہ اس وقت میرے خدا نے دکھایا، وہ میرے ایمان کو ایسی لافانی قوت بخش گیا کہ اس دن کے بعد کبھی کسی مشکل میں میرے قدم نہیں ڈگمگائے اور میں نے ہمیشہ اپنا ہر کام اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔

اچانک سڑک پر پولیس کی دو جیپیں ظاہر ہوئیں اور پل بھر میں ہمارے پاس آکر رُک گئیں۔ سکھ غنڈے پولیس کو دیکھتے ہی فرار ہو گئے اور کہیں کھیتوں میں جا چھپے۔ ان جیپوں میں سے ایک میں پولیس کے سپاہی تھے اور دوسری میں پولیس آفیسرز۔ ایک آفیسر نے جیپ سے اُتر کر پوچھا کہ یہ لوگ آپ کو کہاں لے جا رہے تھے اور آپ کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی، دل تو چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو خوب سناؤں کہ اب انہیں ہمارے حال کی فکر ہوئی ہے، لیکن پھر سوچا کہ خدا نے انہیں ہماری مدد کے لئے فرشتے بنا کر بھیجا ہے، اس لئے اب ان سے بگاڑنی کفران نعمت ہوگا۔ میں اپنے ساتھ کی دونوں لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی، کیونکہ ہم لوگ تو شہری زندگی کے عادی تھے۔ سال میں ایک بار اس علاقہ میں

محض تفریحاً جاتے تھے، اسی لئے میرا لباس بول چال سب کچھ دیہاتی لڑکیوں سے بالکل جدا تھا۔ پولیس والوں کو یہ تجسس پیدا ہوا کہ یہ لڑکی اس علاقے میں کہاں سے آ گئی۔ میں اس وقت پٹیالہ شہر میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور ویسے بھی میرا تعلق تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا، اسی لئے میری بول چال بھی ان لوگوں سے بالکل مختلف تھی۔ جب میں نے ان لوگوں کو اپنے گاؤں کا بتایا تو ایک ایس آئی فوراً بول اُٹھا کہ ''بیٹی تم ڈاکٹر غلام محمد خاں کی بیٹی ہو؟'' وہ شخص میرے والد اور بہنوئی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری بہن کے بچے مجھ سے بچھڑ گئے ہیں اور میں انہیں تلاش کئے بغیر کہیں نہیں جا سکتی۔ لیکن ان آفیسرز نے مجھے کہا کہ اگر ان لوگوں کے پاس وقت ہوتا تو وہ ضرور میرے ساتھ مل کر بچوں کو تلاش کر لیتے، لیکن انہوں نے بتایا کہ ہمیں وزیراعظم کپورتھلہ کی طرف سے فوراً کپورتھلہ پہنچنے کا حکم ملا ہے اور وہ رُک نہیں سکتے۔ انہوں نے میری تسلی کے لئے یہ بھی یقین دلایا کہ اب عورتوں اور بچوں کو مار مار کر یہ لوگ تھک چکے ہیں، اس لئے بچے صحیح سلامت ہی ہوں گے۔ دل پر پتھر رکھ کر ان کی بات مان لی اور ہم لوگ جیپ میں بیٹھ کر کپورتھلہ کی جانب روانہ ہوئے۔

کپورتھلہ میں انہوں نے مجھے وزیراعلیٰ سے ملوایا اور انہیں بتایا کہ دیکھئے اتنے اچھے اچھے خاندانوں کی لڑکیاں کس طرح دربدر پھر رہی ہیں۔ وزیراعلیٰ نے بہت ہمدردی کا اظہار کیا اور باقی اہل خانہ کے متعلق پوچھا۔ میں نے بتایا کہ سوائے بڑی بہن کے جنہیں میری آنکھوں کے سامنے شہید کیا گیا ہے، میں نے حملہ کے بعد گھر کے اور کسی فرد کو نہیں دیکھا۔ اس نفسانفسی کے عالم میں کس کو کس کا ہوش تھا۔ وزیراعلیٰ نے یہ بھی بتایا کہ کپورتھلہ شہر میں بھی فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی ہے اور تقریباً سارا شہر مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے۔ صرف مسلمانوں کے چند محلے رہ گئے ہیں، جو کل جالندھر کے مہاجر کیمپ میں چلے جائیں گے۔ وزیراعلیٰ نے ایک پولیس آفیسر کو ہدایت دی کہ وہ مجھے رات کے وقت سول ہسپتال میں لے جائیں اور وہاں جو زخمی آئے ہیں وہ سب مجھے دکھائیں۔ شاید ان زخمیوں میں میرے عزیزوں میں کوئی ہو۔

مغرب کے کافی بعد میں اسی پولیس آفیسر کے ساتھ چار سپاہیوں کی حفاظت میں ہسپتال گئی۔ وہاں سول ہسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر عیسائی تھی، اس لیڈی ڈاکٹر کو کہیں سے اطلاع ملی کہ کچھ سکھ غنڈے ہسپتال پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، اس لئے وہ بہت ڈری اور گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار حکام کو فون کر کے ہسپتال کی حفاظت کے لئے کہہ رہی تھی۔ رات کے تقریباً 12 بجے وہ ڈاکٹر مجھے ساتھ لے کر وارڈ میں گئی۔ وہاں وارڈ زخمیوں سے بھرا پڑا تھا اور ان کی آہ و فغاں سے شور برپا تھا۔ سارے زخمی ہسپتال کے برآمدہ میں فرش پر پڑے کراہ رہے تھے، مجھے وہاں کئی مانوس چہرے نظر آئے، لیکن ان سب میں میرا اپنا کوئی نہ تھا۔ کچھ عورتوں کو میں نے پہچان لیا، کیونکہ وہ بھی ہمارے ساتھ لوہاروں کے محلّہ میں پناہ گزیں تھیں۔ میں نے ڈاکٹر سے ان کی مناسب دیکھ بھال کے لئے منت کی سارے زخمی دیکھنے کے بعد دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جو اُمید لے کر ہسپتال آئی تھی کہ شاید میرا کوئی اپنا مل جائے وہ بھی ٹوٹ گئی، لیکن اس کے ساتھ ایک نئی اُمید بندھ گئی کہ شاید ابا جی، اماں جی، بھائی اور بھابی صحیح سلامت آگے نکل گئے ہوں اور مجھے جالندھر کیمپ میں مل جائیں۔ ساری رات نہایت بے چینی سے لیڈی ڈاکٹر کے بنگلہ پر گزاری، اگلا سارا دن بھی وہیں اندر بند ہو کر گزارا کیونکہ لیڈی ڈاکٹر بہت خوفزدہ تھی اور چاہتی تھی کہ کسی سکھ بلوائی کو ہماری موجودگی کا علم نہ ہونا چاہئے۔ شام چار بجے کے قریب وزیر اعلیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق پولیس کو بھیجا تا کہ ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دیں۔

کپورتھلہ شہر میں ابھی مسلمانوں کے جو محلے باقی رہ گئے تھے وہ بھی اس روز ہجرت کرنے والے تھے۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو سب مسلمان اپنے سامان سمیت بسوں میں بیٹھ رہے تھے۔ بسیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور اس کانوائے میں تقریباً 24 یا 25 کے قریب بسیں تھیں۔ انسپکٹر پولیس نے وہاں اپنے ایک جاننے والے کو تلاش کیا اور ہم تینوں لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیا۔ گھنٹہ بھر تاخیر کے بعد یہ کانوائے جالندھر کی جانب روانہ ہوا۔ امید و خوف کے ملے جلے جذبات ہر چہرے سے عیاں تھے۔ سب لوگ آیات قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ جس شخص کی تحویل میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے، وہ ایک بھاری بھرکم

بزرگ (یہ بزرگ مصنف کے والد میاں محمد علی) تھے اور ان کا رویہ ہمارے ساتھ سارے راستہ نہایت مشفقانہ رہا۔ ان کا سارا کنبہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ شام ڈھل رہی تھی، بلکہ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ جب یہ کارواں جالندھر کے مہاجر کیمپ میں پہنچ گیا۔ راستہ ہی میں پتہ چل گیا تھا کہ اس کانوائے کی تین بسیں پیچھے رہ گئی تھیں، لیکن ان بسوں کے انتظار میں رکنا موت کو دعوت دینا تھا، کیونکہ جس ذہنی اذیت اور خوف و ہراس کی فضا میں ہم سب نے یہ سفر طے کیا اس کا احساس صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو کبھی موت کے سائے میں سفر کر چکے ہوں۔ کافی انتظار کے بعد پیچھے رہنے والی تینوں بسیں بھی آ پہنچیں، لیکن اس حال میں جو لوگ بس میں موجود تھے۔ وہ خون میں لت پت تھے۔ مجھ میں تو اب مزید کچھ دیکھنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ اس لئے میں نے صرف ان بسوں پر پہلی نظر ہی ڈالی، اس کے بعد یہ نہیں دیکھا کہ کتنے لوگ شہید ہوئے اور کتنے بچ کر آئے۔ ان آخری بسوں پر راستہ میں سکھ درندوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ہر حملہ اور قتل و غارت کے پیچھے ہندوؤں کا حکم چلتا تھا، لیکن اس حکم کو بجالانے والے سکھ درندے تھے، جو آج نہایت عزت و احترام سے ہمارے ملک میں مہمانوں کی حیثیت سے لائے جاتے ہیں اور ان کی ہر ممکن خاطر مدارات کی جاتی ہیں۔ ارباب اقتدار کو کیا معلوم کہ اس وقت ان دلوں پر کیا گزرتی ہے جب وہ اپنے باپوں، بھائیوں، بہنوں اور بچوں کے قاتلوں کی عزت افزائی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

جالندھر کیمپ کی حالت ناگفتہ بہ تھی، کیمپ میں بھی لوگ محفوظ نہیں تھے، کیمپ کے اردگرد اگرچہ بلوچ رجمنٹ کا پہرہ تھا، لیکن کیمپ میں مقیم مہاجروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ گنتی کے چند فوجی سپاہی ان کی پوری طرح حفاظت نہ کر سکتے تھے، اس کے علاوہ فوجیوں کی بار بار تاکید کے باوجود لوگ کیمپ کی حدود سے باہر نکل جاتے تھے، کبھی خوراک کی تلاش میں اور کبھی کسی اور کام سے اور ایسے لوگ پھر واپس نہ آپاتے تھے۔

گاؤں کی سادہ لوح عورتیں اکثر رفع حاجت کے لئے کیمپ کی حدود سے باہر نکل جاتی تھیں اور انہیں سکھ درندے اُٹھا کر لے جاتے تھے۔

جالندھر کیمپ میں مجھے میرے بھائی کا ایک دوست مل گیا۔ اس نے بتایا کہ ”یحییٰ

خاں کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی اور وہ اسی سے سکھوں کا مقابلہ کر رہا تھا اور سب مسلمانوں کو کہہ رہا تھا کہ بھاگو نہیں، رُک کر مقابلہ کرو بہادروں کی موت مرد انہی کے ہتھیار چھین کر ان سے لڑو" لیکن کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور بھاگ کر اپنی جانیں بچالیں۔ اسی شخص نے یہ بھی بتایا کہ میرا بھائی اکیلا نہیں تھا، بلکہ اس کے ساتھ ایک خوبصورت سی لڑکی تھی، جس کا ہاتھ اس نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ ان باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ میرے بھائی نے آخری سانس تک اپنی بیوی کی حفاظت کی ہوگی اور یقیناً جام شہادت نوش کیا ہوگا۔ میرا بھائی ہم چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا، جو 24 سال کا دراز قد اور مضبوط جسم کا نوجوان تھا اور اس کی شادی ہوئے ابھی صرف 11 ماہ ہوئے تھے۔

کیمپ میں میری واقفیت ایک خاتون سے ہوئی جو بہت سنجیدہ اور سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ میرا اپنا یہی حال تھا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس عورت کی چھوٹی بہن کو سکھ نما درندے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ لاکھ تلاش کے باوجود اس لڑکی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا، حالانکہ مغویہ کے شوہر بلوچ رجمنٹ میں کیپٹن تھے۔ کیپٹن صاحب جب اپنی اس عزیزہ سے ملنے آئے اور کیمپ کی حالت کا جائزہ لیا تو ہم لوگوں کو اپنی رجمنٹ میں لے گئے۔ کیمپ میں آنے کے بعد میں نے کچھ نہیں کھایا تھا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اس بھری دنیا میں ایک کمسن لڑکی بے یارو مددگار، لیکن خدائے برتر نے پھر ایک وسیلہ بنادیا۔ ایک دن اور رات ہم لوگ رجمنٹ میں رہے۔ بلوچ سپاہی جب میس سے کھانا لے کر آئے اور نہایت خلوص سے کھانے کی دعوت دی تو میں ضبط نہ کرسکی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی، فوجی سپاہیوں میں ایک لڑکا جس کا نام حق نواز تھا حد درجہ پُر خلوص تھا۔ اس نے کھانا کھانے کے لئے میری بہت منت سماجت کی اور کہنے لگا کہ یہ ایک بھائی کی التجا ہے کہ آپ کھانا ضرور کھائیں۔ ورنہ اگر آپ یہاں سے بھوکی چلی گئیں تو ہم اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ان سب جوانوں کی محنت اور خلوص نے مجھے مجبور کردیا اور بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے کھانا کھالیا۔ رات کو کیپٹن صاحب نے خوشخبری سنائی کہ کل ہمارا ٹرک کسی کام سے لاہور جارہا ہے، اسی میں آپ سب بھی لاہور

چلی جائیں گی۔ تمام رات خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کی وجہ سے سخت بے چینی میں گزری۔ خوشی اسی بات کی تھی کہ کل میں وہ منزل پالوں گی، جس کی آرزو میں مسلمانانِ ہند نے 2 صدیاں گزار دیں اور غم اس بات کا تھا جن اپنوں کے ساتھ میں نے یہ خوشی بانٹنی تھی، ان میں سے کوئی بھی یہ خوشی دیکھنے کے لئے موجود نہیں تھا۔ میرے والد صاحب بھی جمعہ کی نماز پڑھ کر آتے تھے تو ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ ''یہاں نماز پڑھنے کا لطف نہیں آتا۔ نماز کا مزہ تو تب آئے گا جب میں پاکستان جا کر نماز پڑھوں گا''۔

اگلے روز شام کو ہم لاہور کے لئے روانہ ہوئے آگے پیچھے دو فوجی ٹرک تھے۔ ہمارے ٹرک میں تین فوجی جوان ایک کپتان تھے اور سب کے پاس رائفلیں اور ایک مشین گن تھی۔ کیپٹن کے پاس ریوالور بھی تھا، لیکن تمام راستہ دشمن کے حملہ کا خوف لگا رہا۔ راستہ کے دونوں طرف اب تک کئی جگہ شہیدوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ اس تمام سفر میں امید و بیم کی جو کیفیت تھی وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ تمام راستے آیات قرآنی کا ورد کرتے رہے، میں نے تمام راستہ باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ ساتھ والیوں کی زبانی راستہ کی حالت کا اندازہ ہوتا رہا۔ مجھ میں اب اور خونی مناظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ جب ٹرک میں سے کسی نے نعرہ بلند کیا ''پاکستان زندہ باد'' تو ایسا لگا کہ جیسے مردہ جسموں میں نئی روح ڈال دی گئی ہو۔ جس سرزمین کو دیکھنے کی آرزو میں لاکھوں جانیں قربان ہوگئیں۔ آخر ہم نے وہ منزل مراد پا ہی لی۔ ضبط و صبر کے تمام بند ٹوٹ گئے اور آنکھوں نے اتنے موتی برسائے کہ دامن بھر گیا۔ یہی نذرانہ عقیدت تھا جو سب لٹے ہوئے مسلمانوں نے اس پاک سرزمین اور اپنے خوابوں کی تعبیر کو پیش کیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ ٹرک سے اتر کر اس زمین کے ہر ذرے کو چوم لوں، لیکن، ہمارا ٹرک رکا ہی نہیں کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی اور ہم نے ابھی کسی ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ ہم پانچ خواتین تھیں، تین لڑکیاں اور ایک کیپٹن صاحب کی سالی اور ایک ان کی کوئی اور عزیزہ اس لئے وہ ہم سب کو اپنے گھر ہی لے گئے۔ ان کی فیملی کپور تھلہ ہاؤس کے فلیٹس میں رہائش پذیر تھی۔ ان کے گھر والوں نے بہت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ اگلے روز سے میں نے اپنی بھانجی اور بھانجے اور باقی گھر والوں کی تلاش شروع کر دی، جس میں

تمام اہل خانہ نے میرے ساتھ پورا تعاون کیا۔

ان لوگوں نے میرا گھر سے اکیلے نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے فون کے ذریعہ سارا دن مختلف مہاجر کیمپوں سے میرے گھر والوں کے نام بتا کر معلومات حاصل کرتے رہے۔ میرے پاس دو سو روپے تھے اور یہ پیسے ہم نے گھر سے چلتے ہوئے سو سو کے نوٹ فولڈ کر کے کپڑوں میں باندھ کر بالوں میں گوندھ لئے تھے۔ ایک ہفتہ کی تلاش کے بعد جب کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو ایک روز میں اپنے میزبانوں کی مخالفت کے باوجود گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور اپنی بہن کے ایک سسرالی رشتہ دار جن کا پتہ مجھے معلوم تھا، وہاں پہنچ گئی۔ وہاں جا کر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا، کیونکہ میری والدہ اور بہن کے دونوں بچے وہاں موجود تھے، لیکن میری ماں کے ہواس ٹھکانے نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ کتنی دیر میں اپنی ماں کے گلے سے لپٹی زار و قطار روتی رہی اور انہیں بتاتی رہی کہ میں کون ہوں، چند گھنٹوں کے بعد میری ماں کے ہواس درست ہو گئے اوانہوں نے مجھے پہچان لیا۔

......☆......

محترمہ عمدہ بیگم زوجہ ڈاکٹر غلام محمد خاں شہید کا بیان

سلطان پور لودھی کپور تھلہ روڈ پر قتل عام کے دوران مجھے درندوں نے روک لیا تھا، وہ اور بھی بہت سی عورتوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر لاتے تھے۔ بلوائیوں نے سب عورتوں کے کپڑے اتروا کران کو بالکل برہنہ کر دیا۔ میں آیت الکرسی کا ورد کرتی رہی، یہ اللہ کی رحمت تھی کہ کسی درندے کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ پھر انہوں نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ تلوار کی نوک سے پیٹ سے لے کر ناف تک چیرتے چلے جاتے تھے۔ میں نے تڑپتی ہوئی لاشوں کے درمیان خود کو گرا دیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے لاشیں میرے اُوپر آ گریں۔ انسانی جسموں سے نکلتا ہوا گرم گرم خون جسم پر بہہ رہا تھا۔ اس طرح میں خون میں لت پت کتنی دیر دم سادھے وہیں پڑی رہی۔ جب درندے یہ خونی کھیل کھیل کر لوٹ گئے اور کافی دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں نے بڑی مشکل سے رینگ کر خود کو لاشوں کے نیچے سے نکالا اور تھوڑی دیر ستانے کے بعد آگے بچوں کی تلاش میں چل پڑی۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد سڑک کے کنارے پر اور لاشوں کے درمیان مجھے اپنا اکلوتا نوجوان بیٹا نظر آیا۔ جو سڑک کے کنارے دھوپ میں مردہ پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر چھاؤں میں کرنا چاہا، لیکن اتنے جوان اور کڑیل جسم کو ہلانا بس سے باہر تھا۔ ابھی میں شہید بیٹے کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ ظالموں کا ایک اور ٹولہ آ پہنچا اور انہوں نے زبردستی وہاں سے اُٹھا دیا اور کہا کہ دو میل کے آگے گاؤں میں ایک کیمپ ہے وہاں چلی جاؤ۔ میں بادل نخواستہ اُٹھ کران کے بتائے ہوئے راستہ پر چل پڑی اور کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے کیمپ تک پہنچ گئی۔ موضع مٹھا کیمپ میں گم شدگان کی فہرستیں تیار کی جا رہی تھیں۔ کسی نیک بندے نے مشورہ دیا کہ ''آپ بھی اپنے گمشدہ بچوں کا نام لکھوا دیں''۔ لائن میں کھڑی نام لکھوانے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک بچہ پیچھے سے آ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ دیکھا تو میری نواسی تھی، جس نے اپنے چھوٹے بھائی کی انگلی

پکڑی ہوئی تھی۔

اس گاؤں سے تیسرے روز پھر ایک بہت بڑا قافلہ جالندھر کیمپ کے لئے روانہ ہوا۔ گاؤں کے لوگوں نے بیل گاڑی میں گھروں کا پورا سامان لادا ہوا تھا اور لاٹھیاں اور نیزے وغیرہ بھی ان کے پاس تھے، کئی لوگوں کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ جب قافلہ روانہ ہوا تو پوری طرح چاک و چوبند تھا اور یقین تھا کہ ہندو سکھ اس قافلہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے، لیکن دریائے بیاس کے نزدیک قافلہ پر سکھ فوج اور بلوائیوں نے زبردست حملہ کر دیا۔ میں نے بچوں کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپ کر جان بچائی۔ رات بھر پہلے کی طرح لوٹ مار کا بازار گرم رہا اور عصمتیں لٹتی رہیں۔ میں نے سڑک سے دُور کھیتوں میں چھپ کر جان بچائی۔ اگلے روز دن چڑھا تو بچوں کو پناہ گاہ میں چھوڑ کر باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ تھوڑی دُور ایک کنواں نظر آیا جو درختوں کے گھنے جھنڈ میں تھا۔ بچوں کو لے کر وہاں چلی گئی، بچوں کا بھوک اور پیاس سے برا حال تھا۔ کھانے کو تو کیا ملتا البتہ کنوئیں کی ٹینڈوں میں جو تھوڑا بہت پانی موجود تھا، وہ کسی نہ کسی طرح لا کر بچوں کو پلا دیا۔ دوپہر کے وقت سکھوں کے پانچ چھ لڑکے جو ابھی بارہ یا تیرہ سال کی عمروں کے تھے ہاں آ گئے اور بچوں کو دیکھ کر شکار کی طرح ان پر جھپٹے۔ دونوں بچے دہشت زدہ ہو کر چیخیں مار کر مجھ سے لپٹ گئے۔ انہی میں سے ایک لڑکا جو ذرا بڑا تھا وہ آگے بڑھا اور سب لڑکوں کو ڈانٹنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ تو رب کی ماری ہوئی ہے، اسے مار کر کیا کرو گے...... یہ کہہ کر اس نے مجھے تسلی دی کہ "ماں جی" آرام سے بیٹھی رہو کوئی کچھ نہیں کہے گا"۔ اس بچے کو ہمدرد پا کر میں نے اس سے کہا کہ بچے بہت بھوکے ہیں اور ان کو پانی پلانے کے لئے میرے پاس کوئی برتن بھی نہیں ہے۔ وہ لڑکے لوٹ کا جو سامان ساتھ لائے تھے۔ اس میں سے ایک گلاس مجھے دیا اور ساتھ ہی رہٹ کر چلا کر پانی بھی بھر دیا۔ انہی لڑکوں کے پاس پنجیری کا ایک ڈبہ تھا جو کوئی بدنصیب مسلمان اپنی زادِ راہ کے لئے ساتھ لے جا رہا ہوگا، اس ڈبے میں سے اس نے تھوڑی پنجیری میری جھولی میں ڈال دی۔ بچوں نے پنجیری کھائی اور جی بھر کر

پانی پیا تو جسموں میں کچھ جان آئی۔ اسی سکھ لڑکے نے کہا کہ "اماں ہم تو چھوڑ چلے ہیں، لیکن تم لوگ زیادہ دیر اس جگہ نہیں چھپ سکو گے، کوئی نہ کوئی آکر تم تینوں کو قتل کر دے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم لوگ آگے نکل جاؤ"۔ سورج چھپنے کے قریب تھا کہ ایک دس بارہ سالہ لڑکا چرواہا جو دن بھر چرنے کے بعد اپنے مویشیوں کو گاؤں کی طرف لے جا رہا تھا۔ مجھے اور بچوں کو دیکھ کر رُک گیا اور اس نے کہا کہ "ماں یہ لوگ تمہیں مار دیں گے، تم رات کو یہاں سے نکل جاؤ"۔ میں نے کہا کہ "بیٹا مجھے تو کوئی راستہ ہی نہیں معلوم، میں کیسے آگے جاؤں"۔ یہ بات سن کر اس فرشتہ نما بچے نے بتایا کہ "یہاں سے تھوڑی دُور آگے موضع گڈانہ میں مسلمانوں کا بہت بڑا قافلہ پاکستان جانے کے لئے رُکا ہوا ہے۔ تم لوگ آدھی رات کے وقت ہی یہاں سے نکل جاؤ، لیکن نہ تو سڑک پر چڑھنا اور نہ ہی ریلوے لائن کے ساتھ چلنا، بلکہ کھیتوں میں سے ہو کر چلنا تو تھوڑی دُور چلنے کے بعد تمہیں قافلہ کی لالٹین نظر آ جائے گی"۔ اس بچے نے یہ بھی بتایا کہ "ہندو سکھ رات بارہ بجے تک قتل و غارت کرتے ہیں۔ پھر شراب پی کر نشہ میں بدمست ہو جاتے ہیں اور صبح کافی دن چڑھے تک نہیں اُٹھتے"۔ اس بچہ کی ہدایات کے مطابق میں نے ستاروں سے اندازہ لگایا کہ اب تقریباً آدھی رات ہو گئی ہو گی۔ دونوں بچوں کو نیند سے اُٹھایا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑی۔ کھیتوں میں ٹخنے ٹخنے پانی کھڑا تھا۔ شاید بارشوں کا پانی تھا یا ویسے ہی پانی دیا ہوا تھا۔ نازوں کے پلے بچے چار قدم چلے تو گر گئے او پانی اور کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ میرا نواسہ ایک تو ویسے ہی بہت چھوٹا تھا۔ دوسرے وہ ابھی بمشکل ٹائی فائیڈ سے صحت یاب ہوا تھا، اس لئے بہت کمزور تھا۔ بچہ چلنے کے قابل نہ تھا، اسے اپنی کمر پر لاد کر کس کر دوپٹہ سے باندھ لیا اور بچی سے کہا کہ تم پیچھے سے میری قمیص کا دامن پکڑ لو، پہلے راستہ پر میں قدم رکھوں گی، میرے بعد تم قدم رکھنا۔ اسی طرح گرتے پڑتے ننگے پاؤں کانٹوں سے چھلنی نہ جانے کب تک چلتے رہے، جب ان کی ہمت نے بالکل جواب دے دیا تو مایوسی میں پھر اپنے اللہ سے فریاد کی کہ یا اللہ مجھے ہمت عطا فرما کہ میں بچوں سمیت اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔ اچانک ایک سمت سے رات کی

خاموشی کو چیرتی ہوئی گدھوں کے ہنہنانے کی آوازیں کانوں میں پڑی۔ آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے ادھر ہی چلنا شروع کر دیا۔ یقین ہو گیا تھا کہ یہ گدھے قافلہ کے ساتھ ہی ہوں گے۔ اسی امید کے سہارے پاؤں میں اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے بچوں کو ساتھ لئے تیز قدم اُٹھانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دُور جا کر قافلہ میں جلتی ہوئی لالٹینوں کی کپکپاتی مدھم روشنیاں نظر آئیں اور ساتھ ہی ایک فوجی سپاہی پہرہ دیتا نظر پڑا۔ جب ہم تینوں سڑک کے اُوپر چڑھے تو سب سے پہلے اسی فوجی سپاہی کی نظر ہم پر پڑی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''اے میری مصیبت زدہ ماں تو اب خطرہ سے باہر ہے''۔ منزل پر پہنچ کر تینوں بے دم ہو کر زمین پر گر پڑے۔ سڑک کے اس حصہ میں بیٹھے ہوئے ایک خاندان نے جب ہماری حالت دیکھی تو بے چین ہو گئے۔ ہمارے کپڑے پانی سے تر بتر تھے اور سردی سے دانت بج رہے تھے۔ ایک آدمی نے گھاس پھوس جلا کر جلدی سے آگ جلائی، تا کہ آگ کے سامنے بیٹھ کر اپنے کپڑے سکھائیں۔ ایک عورت نے ترس کھا کر پھٹے ہوئے کمبل کا ایک ٹکڑا، بچوں کو ڈھانپنے کے لئے دیا۔ بچوں کے کپڑے سوکھا کر انہیں اسی کمبل کے ٹکڑے میں لپیٹ کر زمین پر لٹا دیا، لیکن بچے اس قدر بھوکے تھے کہ انہیں نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ بچوں نے صبح تھوڑی سی پنجیری کھا کر پانی پیا تھا۔ اس کے بعد کچھ کھانے پینے کو نہ ملا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت سے بچوں کو کھلانے کے لئے کچھ مانگا تو اس نے بہت احسان کر کے تھوڑی سی سوکھی روٹی دی جو دونوں بچوں کو چار چار نوالے کھلا دیئے اور خود بھوکے پیٹ اللہ کا شکر کر کے بیٹھ گئی۔

دن کا اُجالا ہوا تو بچوں کو ساتھ لے کر دُور تک پھیلے ہوئے قافلہ میں کسی سے کوئی کھانے ملنے کی اُمید پر چل پڑی۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک فوجی نظر آیا جو رات کی بچی ہوئی دال کا بھرا ہوا برتن پھینکنے جا رہا تھا۔ بھوک سے ہمارے سوکھے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ دال پھینکتے پھینکتے رُک گیا اور پوچھا کہ آپ لوگوں کو دال چاہیئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور نعمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ پہلے دونوں بچوں کو دال کھلائی اور جو بچ گئی وہ خود بغیر روٹی کے ہی

کھالی۔ پیٹ میں کچھ خوراک گئی تو جان میں جان آئی اور پھر لوگوں سے مل جل کر پتہ چلا کہ تھوڑی دیر بعد بسیں آنے والی ہیں، جن میں بیٹھ کر سب پاکستان جائیں گے۔

بسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بس کے رُکتے ہی طاقتور لوگ فوراً اپنے خاندانوں کو چڑھا دیتے تھے اور کمزور لوگ منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ہر آنے والی بس میں چڑھنے کی کوشش کی، لیکن لوگوں کی بے پناہ سیل رواں کے سامنے کوئی پیش نہ گئی۔ آخر اللہ کو ہماری بے بسی پر رحم آ گیا اور ایک جوان لڑکے نے مجھے اور بچوں کو اُٹھا کر بس کی کھڑکیوں کے راستے بس میں چڑھا دیا۔ بس میں سوار ہونے کے بعد بھی بے یقینی اور خوف و ہراس کا یہ حال تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کارواں بھی صحیح و سالم منزل پر پہنچ جائے گا۔ گھنٹوں کے سفر کے بعد جب لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے تو یقین آ گیا کہ منزل مراد مل گئی۔

......☆......

روایت حبیب اللہ شاہین فتح آبادی

میرے ننھیال کا تعلق سلطان پور لودھی ریاست کپورتھلہ سے تھا، سلطان پور لودھی مسلم اکثریت کا حامل تاریخی شہر ستلج اور بیاس دریاؤں کے وسط میں واقع ایک مردم خیز شہر ہونے کے حوالہ سے معروف وممتاز شہر تھا۔ ریاست کپورتھلہ کا حکمران سکھ تھا۔ اس کے اجداد نے بعہد رنجیت سنگھ کپورتھلہ پر قبضہ کرکے یہاں کے مسلم راجپوت حکمران رائے ابراہیم خان کو معزول کردیا تھا۔ سکھ حکمران نے اپنے آہلو والیہ قبیلہ کے لوگوں کو ریاست کپورتھلہ میں بڑے بڑے عہدے سونپ رکھے تھے۔ کپورتھلہ کی افواج کا کمانڈر انچیف بخشی پورن سنگھ تھا جو انتہائی متعصب بے رحم سفاک اور مسلم دشمن تھا۔ 1930ء میں اسی کی شہہ پر سلطانپور لودہی میں عاشورہ محرم کے جلوس پر فائرنگ ہوئی تھی، جس میں سینکڑوں مسلمان شہید او زخمی ہوئے تھے۔ یہ سب مسلمانوں کی سیاسی قوت کو کچلنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس شدید فائرنگ اور بے پناہ جانی نقصان کے بعد مسلمانوں نے ریاستی حکمران کے خلاف اوراپنے سیاسی حقوق کی بحالی، ریاست کپورتھلہ میں سرکاری اداروں میں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتوں، عہدوں، وزارتوں اور مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لئے تحریک کا آغاز کیا اور وہ واضح طور پر حکمرانوں کے مسلم دشمنی پر مبنی آمرانہ رویہ کے خلاف آواز بلند کی اور ریاست میں آمرانہ قوانین ختم کرکے حکومت پنجاب کے سرکاری قوانین کے نفاذ کا بھرپور مطالبہ کیا۔ کپورتھلہ کی فوج کے کمانڈر انچیف بخشی پورن سنگھ سے سلطان پور فائرنگ کا قدرت نے یہ انتقام لیا کہ اس فرعون مزاج سکھ کے دماغ میں کیڑے پڑ گئے اور وہ عبرت ناک موت مرا۔ اس جلاد صفت کے بعد اس کا بیٹا جے سنگھ نامی ریاستی فوج کا سپہ سالار رہا۔ جو اپنے باپ سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے خلاف انتہائی سنگ دل اور شرارتی اور متعصب شخص تھا۔

جب حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے حکم پر اسلامیان برصغیر نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تو ریاست کپورتھلہ بالخصوص سلطان پور لودھی کے مسلمانوں نے مطالبۂ

پاکستان کی کھل کر زبردست تائید وحمایت کرتے ہوئے اپنے اسلامی تشخص کا پورے شدومد سے اظہار کیا اور اس امر کا بھی مطالبہ کیا کہ چونکہ ریاست کپورتھلہ واضح طور پر مسلم اکثریت کی حامل ریاست ہے، اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہئے، ہندوؤں سکھوں کی سوچی سمجھی سکیم کے تحت ریاست کپورتھلہ اور پنجاب بھر میں ہندو اور سکھ پہلے ہی خفیہ طور پر مسلمانوں کے خلاف پوری طرح منظم اور مسلح ہو چکے تھے۔ قیامِ پاکستان کا اعلان ہوتے ہی انہوں نے پورے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے، ان حملوں میں سکھ ریاستوں کی افواج بھی شامل تھیں۔ ریاست کپورتھلہ کا سرکاری اور فوجی اسلحہ سکھوں و ہندوؤں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ریاست کپورتھلہ کے کمانڈر انچیف جے سنگھ نے فوج کے اسلحہ ڈپو سے بندوقیں، رائفلیں، گولیاں اور دوسرا مہلک اسلحہ چوری کر کے اپنے آبائی شہر فتح آباد ضلع امرتسر کے مسلمانوں کو کچلنے کے لئے بذاتِ خود فوجی جیپ میں رکھ کر فتح آباد میں سکھوں، ہندوؤں کو پہنچایا جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ میرے روبرو اسلحہ سے بھرپور یہ جیپ جب فتح آباد کے شاہی صدر بازار سے گزری تو اس میں رسوائے زمانہ جے سنگھ المعروف "جرنیل صاحب" فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا اور جیپ میں پڑی ہوئی رائفلوں اور گولیوں کی پٹیوں کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے ان کے اُوپر بیٹھے رکھے ہوئے تھے۔ جیپ جب اس کی حویلی میں پہنچی تو اس کے سکھ کارندوں نے اسلحہ حویلی کے اندرون ایک کمرہ میں رکھوا دیا۔ جورات کے وقت شہر میں مختلف مقامات پر سکھوں اور ہندوؤں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ فتح آباد میں بھی شروع ہی سے مسلمانوں کی اکثریت تھی، قیامِ پاکستان کے وقت اردگرد کے دیہات پر سکھوں کے حملوں اور قتل و غارت گری اور دیہات کو جلائے جانے کے بعد اردگرد کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں فتح آباد میں جمع ہو گئے تھے۔ سکھوں نے یہاں مسلمانوں کی عددی برتری اور اجتماع سے مرعوب ہو کر مسلمانوں پر حملہ کرنا اپنے لئے تباہ کن اور خطرناک تصور کرتے ہوئے حملے کی جرأت نہ کی اور دوسرا سیمہ ہو کر شہر سے نکل کر اپنے کنوؤں، کھیتوں اور مویشیوں کے اصطبلوں میں جا کر دبک گئے۔ سلطانپور لودھی جہاں میرے ننھال کی رہائش تھی، یہ محلہ معماراں اور چھاپے والا

کہلاتا تھا، جو سکھوں اور ہندوؤں کی آبادیوں میں گھرا ہوا تھا۔اس محلہ کے مسلمان میرے نہال اور دوسرے رشتہ دار یہاں پر اپنے کو غیر محفوظ خیال کر کے خالص مسلم آبادی والے اپنے عزیزوں کے محلہ ''کردگراں'' میں منتقل ہو گئے اور تمام ایک ہی جگہ قلعہ بند ہو گئے۔

اس دوران ہندو سکھوں کے جتھے محلہ کردگراں پر حملہ آور ہوتے رہے، مگر ہر مرتبہ وہ اپنی نعشیں چھوڑ کر بھاگ جاتے، محلہ کو ہمارے ایک بزرگ ملٹری آفیسر بابو بدرالدین جو کہ معمار برادری سے متعلق تھے، کے زیر کمان اس انداز میں انتہائی مضبوط اور مستحکم بنا دیا گیا تھا۔اہالیان محلہ کردگراں نے ہندو سکھ حملہ آوروں کا یہاں ڈٹ کر جواب دیا اور پوری جرأت دلیری اور جوان مردی سے کئی روز تک دشمن سے نبرد آزما رہے اور ان کے دانت کھٹے کرتے رہے۔ ریاست کپورتھلہ کے سکھ ہندو اہلکاروں اور مقامی ہندوؤں سکھوں نے جب اپنی بار بار کی ناکامی کو دیکھا تو انہوں نے یہ اعلان کیا اور یہ سازش کی کہ حکومت نے مسلمانوں کو بلوچ افواج کی حفاظت میں پاکستان بھیجنے کا بندوبست کیا ہے اور اس سلسلے میں دریائے دائیں نالہ کے قریب واقع سکول اور بورڈنگ ہاؤس میں کیمپ قائم کر دیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ شہر سے نکل کر کیمپ میں پہنچ جائیں۔کئی روز سے محاصرہ میں محصور مسلمانوں نے اپنے گھروں محلوں سے کیمپ میں میں منتقل ہونے کو غنیمت جانا۔ان کا خیال تھا کہ وہ مسلم افواج کی حفاظت میں پاکستان پہنچ جائیں گے۔سکول میں پہنچتے ہی تمام مسلمانوں کو غیر مسلح کر دیا گیا اور وہاں ہندو ملٹری تعینات کر دی گئی اور مردوں کو سکول میں جبکہ خواتین کو بورڈنگ میں محبوس کر دیا گیا اور تلاشی کے بہانے خواتین سے تمام زیورات اور نقدی چھین لی گئی۔ 11 ستمبر بعد دوپہر کیمپ میں مقیم و محبوس تمام مسلمان، مرد و خواتین بچوں بوڑھوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سکول سے باہر آ جائیں، جب یہ لوگ باہر آ گئے ان کو قافلہ کی صورت میں کپورتھلہ کی طرف لے جایا گیا۔قافلہ ابھی چند میل ہی آگے بڑھا تھا کہ اسے ریلوے لائن کے قریب کانجلی نالہ کے پل پر روک دیا گیا۔اہل قافلہ نے جب اِدھر اُدھر دیکھا، ہر طرف سے برچھوں، نیزوں، تلواروں، کلہاڑیوں، پستولوں، بندوقوں سے مسلح

ہندوؤں، سکھوں کے غول اور غول قافلہ کی جانب بڑھے آرہے ہیں۔آن واحد میں سکھوں ہندوؤں کے جتھوں نے قافلہ پر حملہ کردیا،ان حملہ آوروں میں ہندوؤں کی دہشت پسند تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ کے علاوہ ریاست کپورتھلہ و پٹیالہ کی سکھ افواج کے فوجیوں نے جو رائفلوں سے مسلح تھے، قافلہ کو گھیرے میں لے کر شدید فائرنگ شروع کردی۔میرے ماموں میاں بدرالدین نے اس وقت اپنے بیوی بچوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے نعرہ تکبیر بلند کیا اور حملہ آوروں کی صفوں میں گھس گئے اور ان پر ہاکی سے وار کرتے ہوئے کئی سکھوں، ہندوؤں کو جہنم رسید کیا۔حملہ آور سکھوں ریاستی افواج کی بے تحاشہ فائرنگ سے ہزاروں مسلمان نوجوان، بوڑھے بچے اور خواتین نے شہادت پائی، ہرطرف کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ہرطرف چیخ و پکار اور آہ و بکا کا عالم تھا، برچھے، چاقو، بھالے، نیزے، تلوار، خنجر، جسموں میں پیوست ہورہے تھے، سنسناتی گولیاں سینکوں کو چھلنی کررہی تھیں، اہل قافلہ لہو میں غلطاں خاک وخون میں پڑے تھے، بندوقیں پستول رائفلیں، برین گنیں آگ اُگل رہی تھیں۔ کیا بتاؤں کتنے شیر خوار معصوم اپنی شہید ماؤں کی گود میں ہی حملہ آوروں کی جفا کاریوں اور ستم رانیوں سے لہولہان ہوکر دم توڑ چکے تھے۔یہ ایک ایسا دلدوز اور روح فرسا منظر تھا جسے الفاظ میں بیان کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔زخمی کراہ رہے تھے، کوئی پانی مانگ رہے تھے، کوئی اپنے عزیزوں کو پکارتا تھا، کسی کے لب ولہجہ پر کلمہ طیبہ تھا، کوئی دم توڑ رہا تھا، چاروں طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا، ایسے میں کچھ ایسی جواں ہمت لڑکیاں بھی تھیں، جو خون کے اس دریا سے گزر کر قریبی نالے سے پانی لاکر زخمیوں کو پلارہی تھیں، جبکہ ان کے بھائی بہنیں باپ اعزہ واقارب اور رشتہ داروں کے لاشے اس گنج شہداء میں پڑے ہوئے تھے، اس جگہ ہی میرے ماموں ممانیوں کے علاوہ میرے ماموں زاد وجیہہ وشکیل بھائی محمد افضل، منور حسین، میری نانی میری خالہ، میری والدہ کی خالہ ان کے جواں سال خوبرو بیٹے عظیم اور نعیم جو سلطان پور لودھی میں تحریکِ پاکستان کے معروف کارکن تھے، وہ بھی شہادت کے

مرتبہ پر فائز ہوئے، ان کے علاوہ میرے ننھیال میں سے میرے دوسرے تقریباً 135 اعزہ اقربا نے اس دشت غربت میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی، قتل و غارت، لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا۔ حملہ آوروں نے سینکڑوں نوجوان خواتین کو اغوا کر لیا۔ کچھ بھاگ کر کھیتوں میں جا چھپیں اور بہت سی نواحی قریبی نالے اور جوہڑوں، جھیلوں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے ظالموں سے محفوظ ہو کر موت کی وادی میں چلی گئیں۔ اہل سلطان پور لودھی کے ہزاروں پر مشتمل قافلے کی تباہی اور ہندوؤں، سکھوں کی سفاکی کا اندازہ صرف امر سے ہی ہو سکتا ہے کہ میرے ماموں جو اپنے والد کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے، اپنے اکلوتے بیٹے اور اپنے والد ماجد اور اپنے دیگر 135 اعزوا قارب اور قافلہ کے ہزاروں دوسرے اہل سلطان پور کے ہمراہ ہندوؤں سکھوں کی ستم رانی کی نذر ہو گئے اور پاکستان زندہ باد کہتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر گئے۔

میری ممانی، ماموں زاد بہنیں بھی اس دوران ہی کافروں کے حملہ میں شدید زخمی ہوئیں، زخمیوں کی بہت بڑی تعداد بمشکل پیدل چل سکتی تھی۔ قافلہ کی تباہی کے بعد سلطان پور لودھی کپور تھلہ روڈ پر واقع کانجلی پل کا علاقہ ہزاروں بے گناہ بے گور و کفن شہیدوں کا مدفن بن گیا، سڑک اور ریلوے لائن اور اردگرد ہزاروں مسلمانوں کے خون میں نہائے ہوئے لاشے پڑے تھے، کربلائے سلطان پور کے بچ رہنے والے لٹے پٹے زخمیوں کا قافلہ اپنے پیاروں کو خدا حافظ کہتے ہوئے نہایت ہی شکستہ حالت میں وہاں سے عازمِ پاکستان ہوا، دوسرے تیسرے روز یہ لوگ دریائے بیاس کے پل کے قریب پہنچے اور دریا کے کنارے شب بسری کے لئے ٹھہر گئے۔ ان دنوں شدید موسلا دھار بارشیں ہو رہی تھیں، دریا خون شہیداں سے رنگین تھا، شام ہو رہی تھی، دریا پورے جوبن پر تھا اور یہ بھی مسلمانوں کو نگلنے کے لئے منہ کھولے ہوئے تھا۔ اہل قافلہ سفر کی تکان سے چور تھے۔ کچھ لوگ سو گئے۔ شدید گھائل جو تھے وہ ملک عدم کو رواں ہوئے۔ نصف رات گئے دریا میں شدید طغیانی کی کیفیت

پیدا ہوئی۔ سیلابی پانی کے کئی فٹ بلند ریلہ نے اہل قافلہ کو جو سو رہے تھے آلیا۔ ان میں سے بہت سے دریا میں بہہ گئے اور لقمہ اجل ہوئے۔ ادھر پل کانجلی کے اردگرد کپورتھلہ کو جانے والی سڑک اور ریلوے لائن پر شہدا کے لاشے بکھرے پڑے تھے۔ شام ہو چکی تھی اور اس دشت ویران میں شام غریباں کا سماں تھا۔

خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ شہدائے مشرقی پنجاب کی ان عظیم اور بے مثال قربانیوں کو بھلا کر آج ہمارے حکمران ہندوؤں اور سکھوں سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ کیا اسلامی غیرت وحمیت کی ان میں معمولی سی رمق بھی باقی نہیں رہی؟ ایک طرف یہ شہدائے پاکستان کی یادگار ''بابِ پاکستان'' کا افتتاح کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہندوؤں، سکھوں سے دوستی کر رہے ہیں اور بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے کے لئے بے تاب ہیں۔ ان کو ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ہندو و سکھ کبھی بھی مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔

......☆......

کربلائے سلطان پور

یہ ریاست کپورتھلہ کی ایک اہم تحصیل اور تاریخی مقام تھا۔ اس جگہ کو گیارہویں صدی عیسوی میں سلطان خان لودھی جو کہ محمود غزنوی کا ایک نامور جرنیل تھا، کے ہاتھوں آباد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ دوسری روایت کے مطابق دولت خان لودھی جو ابراہیم لودھی کا مقرر کردہ جرنیل تھا، اس نے اس جگہ کو آباد کیا تھا۔ اس کا تذکرہ آئین اکبری میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ شہر کپورتھلہ سے 16 میل جانب جنوب واقع تھا۔ 1739ء میں نادر شاہ افشار کے ہاتھوں اس کی تباہی واقع ہوئی۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ نے اپنی ابتدائی تعلیم اسی جگہ سے حاصل کی۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں اس کی دوبارہ تعمیر اور کالی بئیں (ندی) پر پل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ شہر شاہراہ شیر شاہ پر واقعہ ہونے کی وجہ سے ایک بڑا تجارتی مرکز بھی تھا۔ نیز ہر دور کے بادشاہوں کے ناظم اور گورنروں کا صدر مقام ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے تاریخی اہمیت بھی حاصل تھی۔ اکبری دربار کا قاضی القاضات ملا، عبداللہ سلطانپوری اسی سرزمین میں پیدا ہوا تھا۔

اس جگہ ایک بہت بڑی سرائے مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کرائی تھی، جو سرائے عالمگیر کے نام سے مشہور اور آج تک قائم و دائم ہے۔ جو بطور تحصیل استعمال ہوتی ہے۔ گورونانک کی رہائش اور اس دور کی عمارتیں قابل دید ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی پرانی یادگاریں بھی بدستور قائم ہیں اور بیشتر معدوم ہو چکی ہیں۔ یہ تحصیل گیہوں کی بڑی منڈی تھی، اس جگہ اعلیٰ قسم کی چھینٹ اور کپڑا تیار ہوتا تھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد فتح سنگھ آلووالیہ نے اس پر قبضہ کر کے اسے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا۔

گورنمنٹ کی شائع کردہ ''رپورٹ'' کے حوالے سے منشی عبدالرحمٰن صاحب اپنی کتاب ''پاکستان کی قیمت'' میں شہدائے کپورتھلہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سلطانپور میں مسلم لیگ کے نائب صدر اور سرگرم کارکن مرزا سیاوش بیگ اور ان کے دوست مسلم لیگی کارکن صدیق کو گرفتار کر کے ایک درخت سے باندھا۔ پہلے ان کی آنکھیں نکالیں،

اس اذیت ناکی کے بعد انہیں گولیاں مار کر شہید کر دیا گیا۔

☆ مولوی وحید اللہ، محمود خان ڈائریکٹر ٹرانسپورٹ، نتھو قصاب، سلامت علی شاہ اور ماسٹر شہاب الدین فرنچ ماسٹر کو تھانے لے جا کر گرفتاری کے دوران نہنگ سکھوں نے قتل کر دیا۔

☆ سید لال محمد شاہ اور ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس محمد رفیع شاہ کو گرفتار کر کے مدن لال مجسٹریٹ نے ان کے تمام زیورات اور نقدی چھین کر سکھوں کے ہاتھوں نہ صرف قتل کرا دیا، بلکہ ان کی لڑکیاں بھی اغوا کر لیں۔

☆ محلہ پنڈوری کی ایک حویلی میں محصور 5 صد سے زیادہ مستورات کو قتل کیا گیا۔

☆ سرائے اعظم میں محصورین مرد، عورتیں اور بچوں کا قتل عام دس ہزار فرزندان اسلام شہید ہوئے۔

☆ شہر میں سات ہزار سے زیادہ جوانوں، بوڑھوں اور مستورات کو قتل کیا گیا۔

☆ منشی شیر محمد تھانیدار اور اس کے تمام بچوں کو قتل کیا۔

☆ سرگرم مسلم لیگی کارکن اور ممبر میونسپل کمیٹی شیخ محمد شفیع اور اس کے تمام افراد خاندان کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔

کپورتھلہ اور سلطان پور کا ایک نامور خاندان

راجہ نہال سنگھ کی اولاد میں سے کچھ لوگ مذہب عیسائیت اور کچھ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ راجہ رگھبیر سنگھ نے عیسائی مذہب قبول کر کے اپنی رہائش جالندھر شہر میں مشن ہائی سکول کے بالمقابل اختیار کر رکھی تھی اور زندگی بھر مشن ہائی سکول کی مالی امداد کرتا رہا۔ وہ لاوارث فوت ہوا۔

دوسرے بڑے خاندان کے سربراہ سردار نبی بخش سی۔ آئی۔ او تھے، ان کے بعد خان بہادر جنرل سردار اصغر علی خان سی۔ آئی۔ اے ممبر سٹیٹ ایڈوائزری کونسل تھے۔ موصوف بڑے ہردلعزیز، فیاض اور اسلام کے شیدائی تھے۔ جب تک زندہ رہے اسلامیان

کپورتھلہ کی مالی اور اخلاقی امداد کرتے رہے۔ مسلم لیگ کو منظم کرنے میں ان کا بڑا عمل دخل تھا۔ پنشن یاب ہونے کے بعد انہوں نے اپنی رہائش کے لئے شملہ کے نزدیک سوہلن پہاڑ میں ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کر رکھی تھی، جہاں موسم گرما میں آپ معہ جملہ افراد خاندان رہائش رکھا کرتے تھے۔ ان دنوں موصوف اپنی سوہلن کی کوٹھی میں افراد خاندان کے ہمراہ رہائش پذیر تھے اور سینکڑوں مسلمان خاندانوں نے اس جگہ پناہ حاصل کر رکھی تھی۔ ریاست پٹیالہ اور کپورتھلہ کی سکھ ریاستوں کے جتھے بند حملہ آوروں نے حملہ آور ہو کر آپ کو اور آپ کے بیٹے سردار ناصر علی، بیگم سردار ناصر علی، رشید انجم نواسہ خان بہادر سٹوڈنٹ بی ایس سی، گورنمنٹ کالج لاہور، محمد نسیم صفدر نواسہ خان بہادر، طالب علم ایف اسی کالج لاہور معہ جملہ ملازمان اور دیگر پناہ گزینوں کا 6 ستمبر 1947ء کو نماز صبح کے وقت شہید کر دیا اور کپورتھلہ میں ان کی کوٹھی کا سامان سامان ولی عہد کپورتھلہ پر مجیت سنگھ نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

سلطان پور میں واقع محلہ لوہاراں میں ایک قلعہ نما حویلی میں سات سو سے زیادہ مسلمان پناہ حاصل کرنے کے لئے دخل ہو کر قلعہ بند ہو چکے تھے، انہیں کپورتھلہ اور پٹیالہ کی افواج افسران نے یہ کہہ کر کہ انہیں بحفاظت پاکستان پہنچا دیا جائے گا، باہر نکالا اور عیدگاہ کے وسیع میدان میں لے جا کر قتل کر دیا اور عورتوں کو اغوا کر کے لے گئے۔

اسی طرح دو تین صد افراد پیر ضیاء الدین مرحوم ومغفور کی حویلی میں پناہ لینے کے لئے داخل ہو گئے تھے۔ شہر کے غنڈوں اور بدمعاشوں نے پٹیالہ کی سکھ فوج کے ساتھ مل کر حویلی میں داخل ہونے کے لئے حویلی کے دروازے اکھاڑ ڈالے اور مردوں کو قتل کر کے مستورات کی عزت وآبرو لوٹنے کے درپے ہو گئے۔ مستورات نے جن کی تعداد تین صد کے قریب تھی، اپنے معصوم بچوں کے ہمراہ حویلی کے اندر واقعہ بہت بڑے اور گہرے کنوئیں میں کود کر اپنی زندگیاں راہ خدا میں قربان کر دیں۔

قافلوں کا حشر

حفاظت جس سفینے کی اسے منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے خود طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

جن لوگوں نے عیدگاہ کے میدان سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر جانیں بچائی تھیں، وہ سلطان پور سے پاکستان کی طرف چلنے والے قافلے میں شامل ہوگئے۔ یہ قافلہ نمازِ مغرب کے بعد کپورتھلہ اور سلطان پور اور شیخوپورہ کے بچے کھچے مرد اور عورتوں پر مشتمل تھا۔ اس میں اطراف واکناف کے لوگ بھی شامل تھے، جن کی تعداد کم وبیش 70-60 ہزار کے قریب تھی۔ اس قافلے کو پیدل چلا دیا گیا تھا۔ اس قافلے میں علاقے کی معروف شخصیات چوہدری فتح محمد، حکیم محمد اشرف، کیپٹن نظام الدین، عنایت محمد خان جمعدار، چودھری عنایت خان آف موٹھانوالہ، چوہدری نعمت علی آف بھگووال نمبردار، کریم بخش ذیلدار مہدی خان نمبردار شامل تھے۔ جب یہ قافلہ کانجی ڈیم کے پل پر پہنچا تو قائم مقام راجہ پرجیت سنگھ اور جرنیل بے جے سنگھ سکھ فوج کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے، راجہ مذکور نے حکم دیا کہ ان سب لوگوں کو قتل کردو کوئی شخص پاکستان نہ جانے پائے۔ ان کی جواں سال لڑکیوں کو اٹھالو۔ یہ اعلان اور راجہ کے حکم کو سنتے ہی جواں سال لڑکیوں اور عورتوں نے اپنے بچوں کے ہمراہ کانجلی کے اس سمندر نما ڈیم میں چھلانگیں لگا دیں۔ چوہدری خوشی محمد آل پاکستان والی بال فیڈریشن کے عہدیدار جو اس قافلے میں شامل تھے، بتاتے ہیں کہ "ان شہیدوں کی نعشیں ڈیم کے پانی کے اُوپر اس طرح تیر رہی تھیں کہ اگر ایک پتھر بھی پھینکا جاتا تو وہ پانی تک نہیں پہنچ سکتا تھا"۔

قافلے میں چوہدری عنایت خان موٹھانوالہ شامل تھا اور جرنیل جے سنگھ کے ساتھ فوج میں رہ چکا تھا، اس نے آگے بڑھ کر جرنیل جے سنگھ سے ملاقات کی۔ اسی دوران میجر نظام الدین سکنہ بوسوال جو چھٹی لے کر اپنے گھر آئے ہوئے تھے، وہ بھی چوہدری عنایت خان اور جرنیل جے سنگھ کی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ ان کے پاس برین گنیں اور سٹین گنوں کے علاوہ پندرہ بیس رائفلیں بھی حفاظت کے لئے موجود تھیں۔ انہوں نے جے سنگھ پر واضح کر دیا کہ اگر اب قافلے پر حملہ ہوا تو مقابلہ سخت ہوگا۔ آپ یا آپ کی فوج زندہ سلامت بچ کر نہیں جا سکے گی۔ اس سے پہلے جو کچھ ظلم ہونا تھا ہو چکا، آپ اگر اپنا ہاتھ روک لیں گے تو ہمارے ہاتھ رُکے رہیں گے۔

......☆......

بہادری اور جرأت کی حماقت

ان دِنوں کا ایک اور واقعہ یاد ہے اور جو شاید میں زندگی میں کبھی فراموش نہ کرسکوں۔ ہوا یوں کہ ضعیف العمر افراد عورتیں اور بچے کپورتھلہ شہر کے وسط میں محفوظ جگہ پر رہتے تھے، جبکہ مرد اور جوان مسلمان شہر کی حفاظت کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ شہر میں داخلے کے تمام راستوں کو رکاوٹوں سے بند کردیا گیا، اردگرد کی عمارتوں پر چاک و چوبند مسلح نوجوان ہر وقت چوکنے رہ کر پہرہ دیتے تھے۔ اگر کبھی شہر سے باہر کھیتوں کی طرف جانے کی ضرورت پڑتی تھی تو مقررہ راستے کی بجائے کسی مکان کے پچھواڑے (کھیتوں کی طرف) سیڑھی لگا کر اتر جاتے تھے اور اسی طریقے سے واپسی ہوتی تھی۔ ایک دن میں اور میرے ایک دوست اشرف نے منصوبہ بنایا کہ شہر سے باہر اپنے کھیتوں میں مکئی کے بھٹے اور تازہ سبزیاں توڑ کر لائیں۔ اپنی حفاظت کے لئے ایک چھوٹی سی کلہاڑی اور چھری ساتھ لی او ہم دونوں بچے، بڑوں سے نظر بچا کر ایک مکان کے پچھواڑے سیڑھی لگا کر شہر سے باہر نکل گئے۔ ہمارے کھیت شہر سے کوئی نصف میل دور پنڈ شیخوپورہ کی طرف تھے۔ ہم خطرہ کے پیش نظر اصل راستے کو چھوڑ کر کھیتوں کے بیچوں بیچ ہوتے ہوئے اپنی زمینوں تک پہنچ گئے۔ مکئی کے کھیت اپنی انتہائی بہار دکھا رہے تھے اور پودے بھٹوں سے لدے پھندے کھڑے تھے۔ چنانچہ ہم نے کافی بھٹے توڑے، سبزی اکٹھی کی او ایک گٹھڑی میں باندھ کر سروں پر رکھ کر شہر کی طرف چل پڑے۔ اب ہم کھیتوں کے بیچوں بیچ واپس جانے کے بجائے اس راستے پر ہولئے جس پر چند یوم قبل ہی ہماری آنکھوں کے سامنے سلطانپور کے ایک پورے قافلے کا قتل عام ہوا تھا۔ ابھی ہم تھوڑے دُور ہی گئے تھے کہ ہمیں ایک نوجوان کی لاش پڑی نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو یہ ایک بیوہ عورت ہاجراں کے اکلوتے بیٹے اصغر کی لاش تھی، ہاجراں فسادات کے دنوں میں ایک قریبی گاؤں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کے ہمراہ بغرض حفاظت اپنے بھائی کے پاس شہر آ گئی تھی۔ اصغر چند یوم قبل رفع حاجت اور

تازہ سبزیاں لینے کے لئے کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی ماں ہر لحظہ روتی رہتی تھی اور اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگا کرتی تھی۔ اصغر کی لاش دیکھ کر ہم پر بڑی دہشت طاری ہوئی۔ اصغر کی شہ رگ ایسے طریقے سے کاٹی گئی تھی، جیسے بکرے کو ذبح کرتے وقت کاٹی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے مضبوطی سے پکڑ کر بڑے اطمینان سے ذبح کیا گیا تھا۔

ابھی ہم اصغر کی لاش دیکھ کر سراسیمہ اور خوفزدہ کھڑے ہی تھے کہ چند سکھ، شراب کے نشے سے دھت، ننگی اور چمکتی ہوئی کرپانیں لہراتے ہوئے ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ اب تو اتنی دہشت طاری ہوئی کہ اپنی چھوٹی سی کلہاڑی، چھری اور سبزی کی گھٹڑیاں پھینک کر سرپٹ شہر کی طرف دوڑ لگائی۔ سکھوں نے شاید ہمیں لاش کے قریب کھڑے تو نہیں دیکھا مگر ہمیں دوڑتے ہوئے ضرور دیکھ لیا، لہٰذا وہ بھی ماں بہن کی ننگی گالیاں بکتے ہوئے ہمارے تعاقب میں دوڑنے لگے۔ ہم نے راستے کو چھوڑ کر پھر کھیتوں کے بیچوں بیچ دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم پودوں، جھاڑیوں اور کھیتوں کی منڈھیروں سے الجھ کر بار بار گرتے تھے، ایک دوسرے کو سہارا دے کر اُٹھاتے اور پھر دوڑنے لگتے۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ہمارے جسم میں اتنی پھرتی اور طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ ہم تعاقب کرنے والے سکھوں کے قابو نہ آسکے اور بحفاظت شہر کے اندر پہنچ گئے۔ شاید خدا کو ہماری سلامتی منظور تھی۔ ادھر ہمارے گھروں میں جب سے ہم گم ہوئے تھے۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا، مگر جب ہم ہانپتے کانپتے گھر پہنچے تو سب نے شکرانے کے نفل ادا کئے۔ پھر جب ہم نے بتایا کہ ہم نے اصغر کی لاش دیکھی ہے تو اس کی ماں دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور بار بار شہر سے باہر کی طرف بھاگتی تھی، مگر اس کا بھائی اور بھاوج بڑی مشکل سے اسے سنبھالتے تھے۔ رات کو چند نوجوان گئے اور اصغر کی لاش کو ایک گڑھے میں دفن کر آئے۔ چند روز بعد ہاجراں بیٹے کی جدائی میں رو رو کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔

مجھے آج بھی جب اپنی ''بہادری'' اور ''جرأت'' کا یہ کارنامہ یاد آتا ہے تو جہاں اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے وہاں اس واقعہ کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کپورتھلہ سے جالندھر کیمپ میں منتقلی

جیسے جیسے اردگرد کے دیہات سے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں شہر میں پہنچ رہی تھیں، شہر کے مسلمانوں کے دلوں میں تشویش واضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا، پھر ایک ٹرین اور شہر کے بالمقابل ایک بہت بڑے قافلے کے قتل عام نے مسلمانوں میں عدم تحفظ کے احساس کو دوچند کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ شہر کی حفاظت میں ڈٹے ہوئے تھے اور اب تک بلوائیوں کو شہر کے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی، مگر یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ شہر کے مسلمانوں نے باہم مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی محفوظ طریقے سے جالندھر چھاؤنی کے مہاجر کیمپ میں منتقل ہو جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں شہر کے ایک ہندو ٹرانسپورٹر سے معاملہ طے کیا گیا۔ اس بنیے نے کپورتھلہ سے جالندھر چھاؤنی تک گیارہ میل کی مسافت کا کرایہ دو سو روپے فی کس مانگا، بڑی مشکل سے اسے ڈیڑھ سو فیصد کس پر راضی کیا گیا، مگر شرط یہ رکھی گئی کہ مسلمان اپنے تمام ہتھیار ساتھ لے کر بسوں میں سوار ہوں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے پاس کوئی قابل ذکر اسلحہ موجود نہیں تھا، مگر تاثر یہی دیا گیا کہ وہ ہر طرح سے مسلح اور ہر صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے قابل ہیں۔ چنانچہ اس تاثر کے پھیلنے کا اثر یہ ہوا کہ سکھ بلوائی مسلمانوں کی بسوں کو کپورتھلہ اور جالندھر کے درمیان کسی جگہ روکنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس طرح اکتوبر کے آخر تک کپورتھلہ کے تمام مسلمان مختلف ذرائع سے پاکستان منتقل ہو گئے۔

ہم نے عیدالاضحیٰ بھی کپورتھلہ ہی میں منائی تھی۔ اگرچہ اس وقت تک بہت تھوڑے مسلمان شہر میں رہ گئے تھے، مگر پھر بھی وہ نہایت منظم طریق سے اپنا دفاع کر رہے تھے۔ جو مسلمان پاکستان چلے گئے تھے یا جو مسلمان اس وقت تک شہر ہی میں موجود تھے، سب نے اپنے مال مویشی کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ گائیں، بیل، بھیڑ بکریاں اور بھینسیں، دن بھر شہر کے باہر کھیتوں میں چرتی رہتی تھیں اور شام کو خود بخود شہر میں اپنے اپنے باڑوں یا مالکوں کے مکانوں پر پہنچ جاتی تھیں، جن سے مسلمان دودھ حاصل کرتے اور ہر روز کئی کئی

بکرے، بھیڑیں ذبح کر کے آپس میں بانٹ کر کھاتے رہتے تھے۔اس طرح شہر کا باہر سے رابطہ کٹ جانے کے باوجود شہر کے اندر دودھ، دہی، مکھن اور گوشت وغیرہ کی کوئی کمی نہ تھی، باقی اجناس کا پہلے ہی مسلمانوں نے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ بھنے ہوئے چنے، گڑ اور پنجیری (ایک قسم کی گھریلو مٹھائی) وافر مقدار میں تیار کر کے کنستروں اور تھیلوں میں بھر رکھی تھی۔

عیدالاضحیٰ کے روز غالباً ریاست کپورتھلہ کی سرحد میں پہلی دفعہ چند گائیں ذبح کر کے ان کی قربانی کی گئی (ریاست کی حدود میں گاؤ ذبیحہ ممنوع تھا) عیدالاضحیٰ سے غالباً دوسرے یا تیسرے روز ہم جالندھر کیمپ منتقل ہو گئے۔شہر سے جب ہم بسوں میں سوار ہوئے تو شہر میں باقی رہ جانے والے مسلمانوں نے اپنی دعاؤں اور پاکستان میں دوبارہ ملنے کی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ پرنم آنکھوں سے ہمیں رخصت کیا، یہ کوئی 25,24 بسوں کا قافلہ تھا۔ڈرائیوروں کو جو کہ سب کے سب سکھ تھے، یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ بسوں کے مسافروں کے پاس کافی مقدار میں اسلحہ موجود ہے، لہٰذا وہ راستے میں کسی بہانے سے بسوں کو ٹھہرانے یا گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ اس کی اپنی زندگیاں بھی محفوظ نہیں رہیں گی۔ ہر ڈرائیور کے ساتھ دو دو طاقتور اور مسلح نوجوان بٹھا دیئے گئے تھے تاکہ وہ ڈرائیوروں کو قابو میں رکھ سکیں اور وہ راستے میں بلاوجہ بسوں کو روکنے، ٹھہرانے کی حماقت نہ کریں۔اس وارننگ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور انہوں نے راستے میں ایک دو جگہ خطرے اور رکاوٹوں کے باوجود اپنی بسوں کو کسی جگہ نہ ٹھہرایا اور اس طرح ہم لوگ کلمہ طیبہ اور درود و سلام کا ورد کرتے ہوئے خیریت کے ساتھ جالندھر کیمپ تک پہنچ گئے۔لیکن آخری تین بسیں کسی وجہ سے پیچھے رہ گئیں اور سکھ درندوں کی بربریت کا شکار ہو گئیں۔مصنف کے والد حاجی میاں محمد علی مرحوم سالار قافلہ تھے جن سے ریاست کے تمام ادنیٰ و اعلیٰ حکام واقف تھے، کیونکہ والد مرحوم شاہی باغات کے مہتمم رہ چکے تھے۔

ان بسوں میں بہت سے وہ بدقسمت لوگ بھی سوار تھے جن کے عزیز و اقارب اور

رشتہ دار سلطان پور کے قافلے، ٹرین کے قتل عام اور شیخوپورہ اور گردونواح سے بچ بچا کر کسی نہ کسی طرح شہر کے مسلمانوں کی پناہ میں آ گئے تھے۔

مصنف کے والد میاں محمد علی (مرحوم) نے بسوں کی روانگی سے پہلے چند معزز شہریوں کے ہمراہ اس وقت کے ریاستی وزیراعظم دیوان لکھپت رائے سے ملاقات کر کے یقین دہانی حاصل کر لی تھی کہ ریاستی حدود میں بسوں کی حفاظت کی جائے گی۔ یہ ملاقات وزیراعظم کی ذاتی رہائش گاہ پر ہوئی تھی جو کہ ہمارے اپنے گھر سے قریب ہی واقع تھی۔ وزیراعظم دیوان لکھپت رائے مصنف کے والد مرحوم کا بہت احترام کرتا تھا اور وہ پرجیت سنگھ اور کمانڈر انچیف سردار جے سنگھ کی طرح متعصب اور مسلمانوں کا دشمن نہ تھا۔

جالندھر چھاؤنی کا کیمپ کیا، کھلے آسمان کے نیچے، کھیتوں اور پریڈ میدان میں بے سروسامان مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے چند افسر اور جوان اس کیمپ کی حفاظت پر مامور تھے، مگر بلوچ رجمنٹ کی دہشت سکھوں اور بلوائیوں کے دلوں میں اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی کو کیمپ کے نزدیک آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچ رجمنٹ نے 1947ء میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی جس طرح حفاظت کی، اس کی مثال تاریخ انسانیت میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس رجمنٹ کا ایک ایک جوان ہزاروں سکھوں اور ہندوؤں پر بھاری تھا۔ ایک ایک جوان نے ہزاروں کے قافلے کی حفاظت کی اور انہیں سلامتی کے ساتھ سکھوں کی وحشت و بربریت سے نکال کر پاکستان پہنچا دیا۔

......☆......

مہاراجہ کپورتھلہ کی کیمپ میں آمد

ہمیں کیمپ میں پہنچے دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ اعلان ہوا کہ مہاراجہ کپورتھلہ جگت جیت سنگھ کیمپ میں آیا ہوا ہے اور اپنی ریاست کے چیدہ چیدہ افراد سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ مصنف کے والد میاں محمد علی (مرحوم) شاہی محلات کے باغات کے مہتمم تھے اور جن کو راجہ بہت اچھی طرح جانتا تھا، کیونکہ صبح کی ہوا خوری اور باغات کی سیر کے دوران راجہ کی والد صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی اور بعض اوقات وہ باغات کی بہتری اور نئے نئے پودوں کی کاشت کے بارے میں والد صاحب کو اپنے مشوروں سے بھی نوازا کرتا تھا۔

مہاراجہ اپنے غیر ملکی دورے سے دہلی اور وہاں سے کپورتھلہ جانے سے پہلے جالندھر کیمپ میں آیا تھا تا کہ جو مسلمان ریاست سے کیمپ میں منتقل ہو چکے ہیں، انہیں واپسی پر آمادہ کر سکے۔

والد مرحوم نے اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مہاراجہ سے ملاقات کی اور ریاست کی دگر گوں صورت حال مسلمانوں کے بہیمانہ قتل عام اور سرکاری فوج اور پولیس کی نگرانی میں مسلمانوں کے شہروں، قصبوں اور دیہات کی تباہی و بربادی سے راجہ کو تفصیل سے آگاہ کیا تو راجہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی دوران ریاست کے ایک ہندو اہلکار نے راجہ کو آگاہ کیا کہ ولی عہد پرجیت سنگھ نے واپسی پر راجہ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالنے اور ریاست کی گدی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ یہ سن کر مہاراجہ کپورتھلہ جانے کی بجائے واپس دہلی چلا گیا۔

جالندھر کیمپ میں ٹھہرے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ گزرا تھا کہ اعلان ہوا کہ مہاجرین کو لے کر ایک سپیشل ٹرین پاکستان جائے گی۔ اس روز مال گاڑی کے ڈبوں پر مشتمل ایک ٹرین نماز عصر کے وقت کیمپ کے نزدیک ریلوے لائن پر آ کر رک گئی اور مسلمان دھڑا دھڑ اس میں سوار ہونے لگے، چند ہی لمحوں میں نہ صرف ٹرین کے تمام ڈبے اندر سے کھچا کھچ بھر گئے بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ چھتوں پر بھی سوار ہو گئے۔ یہ ٹرین تمام رات جالندھر

سٹیشن پر رُکی رہی۔کیمپ میں تو بلوچ رجمنٹ کی وجہ سے لوگوں میں تحفظ کا احساس تھا، مگر سٹیشن پر ہر وقت خطرہ موجود تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، خطرے کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اس سے قبل کئی ٹرینیں پاکستان پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں ختم کر دی گئی تھیں اور کپورتھلہ سے ''ملٹری کی حفاظت'' میں چلنے والی ٹرین کا حشر بھی سب کو یاد تھا۔ اس لئے ٹرین میں سوار ہر شخص اپنے آخری وقت کو یاد کر کے قرآن پاک کی آیات کی تلاوت، کلمہ طیبہ کے ورد اور درود وسلام میں مشغول، دل ہی دل میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنی حفاظت کے ساتھ پاکستان پہنچنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ بچے بھوک اور پیاس سے بلک رہے تھے، مگر کسی مسافر کو پلیٹ فارم پر اُترنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر خدا خدا کر کے رات کے پچھلے پہر یہ ٹرین جالندھر سے روانہ ہوئی اور اس کی رفتار جوں کی رفتار تھی اور پھر ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر گھنٹوں کے حساب سے رُکی رہتی تھی۔ جب دن کی روشنی پھیلی تو ٹرین ''بیاس'' کے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ یہ سٹیشن دریائے بیاس کے کنارے پر واقع ہے۔ اس سٹیشن کے اردگرد کا ماحول انتہائی ہیبت ناک اور بھیانک تھا۔ ہر طرف مسلمانوں کی بے گور وکفن لاشیں ہزاروں کی تعداد میں پڑی تھیں۔ کتے اور گدھ ان کا گوشت نوچ رہے تھے۔ فضا میں بے انتہا تعفن پھیلا ہوا تھا، ایسے دلگداز اور روح فرسا منظر کو دیکھ کر ہر مسلمان کو اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے رقص کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وحشی سکھوں کے مسلح جتھے اپنی ننگی اور خون آشام تلواروں کے ساتھ سٹیشن سے کچھ دُور درختوں کے ایک جھنڈ میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور ان کے ''سر سری اکال'' کے نعروں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے جیسے سورج کی روشنی پھیل رہی تھی، جھنڈ میں جمع ہونے والے سکھوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

نو بجے کے قریب ملٹری کی ایک جیپ، ٹرین کے بالمقابل سڑک پر آ کر رُکی۔ اس جیپ پر مشین گن نصب تھی۔ جیپ میں کل تین جوان سوار تھے، غالباً دو سپاہی اور ایک ان کا افسر تھا۔ کچھ دیر تک جیپ کے جوان ٹرین کا جائزہ لیتے رہے، پھر اچانک ان کی نظر اس ذخیرے پر پڑ گئی، جہاں سکھ جمع ہو رہے تھے، شاید انہوں نے ٹرین کے لئے خطرے کو

بھانپ لیا تھا۔ جیپ پر لاؤڈ سپیکر بھی نصب تھا۔ وہ جوان جیپ سے اُتر کر اپنی مشین گنیں سنبھالے ہوئے سٹیشن پر آ گئے، تاکہ صحیح صورت حال جان سکیں۔ اس وقت تک ٹرین کے یمسافروں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جیپ کے جوانوں کا تعلق پاکستان آرمی سے ہے یا انڈین آرمی ہے۔ کہ وہ ٹرین چلائے، ورنہ اس کی خیر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جیپ پر نصب لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ بلوچ رجمنٹ کے جوان ہیں اور اس ٹرین کی حفاظت پر مامور ہیں، ''اگر کسی نے ٹرین کے نزدیک آنے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دیا جائے گا''۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی جیپ کا رُخ درختوں کے جھنڈ کی طرف موڑ کر مشین گن کا ایک زوردار برسٹ مارا اور وہاں چھپے ہوئے سکھ چیختے چلاتے اپنی جانیں بچانے کے لئے اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔ ٹرین میں موجود مسلمانوں کو جب معلوم ہو گیا کہ بلوچ رجمنٹ کے جوان ان کی حفاظت کے لئے آ گئے ہیں تو انہوں نے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ اس کے بعد ایک جوان اپنی مشین گن لے کر ڈرائیور کے ساتھ انجن میں سوار ہو گیا اور دوسرے نے ٹرین کے آخری ڈبے کی چھت پر اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ جیپ والا جوان ٹرین کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتا رہا۔ راستے میں کسی جگہ سکھوں کو جرأت نہ ہو سکی کہ وہ ٹرین کے قریب بھی آ سکیں۔ انتہائی سست رفتار اور آہستہ خرامی کے ساتھ یہ ٹرین بعد از دوپہر امرتسر ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئی۔ پھر ایسی ٹھہری کہ رات کے آٹھ بج گئے۔ غالباً ٹرین کے ساتھ موجود بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کی موجودگی کی خبر پہلے ہی امرتسر پہنچ چکی تھی، اس لئے امرتسر سٹیشن کے اردگرد کوئی بھی مسلح سکھ نظر نہیں آیا ورنہ کسی ٹرین کا امرتسر سے صحیح سلامت گزرنا معجزے سے کم نہ تھا۔ مگر جیسے جیسے رات ہو رہی تھی مسلمانوں کی تشویش میں پھر اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ افواہ بھی سننے میں آ رہی تھی کہ بلوچ رجمنٹ کے جوان اس ٹرین کو انڈین آرمی کے حوالے کر کے کسی قافلے کی حفاظت کے لئے چلے گئے ہیں۔ اس خبر یا افواہ نے مسافروں کو اور زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ امرتسر میں ٹھہرنے کے دوران مسافروں نے پلیٹ فارم سے پانی وغیرہ لے لیا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی انڈین آرمی نے ٹرین کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اعلان کر دیا کہ کوئی مسافر ٹرین سے

نیچے نہ اُترے ورنہ اسے گولی ماردی جائے گی۔ مسافر ایک دفعہ پھر اپنے پاک پروردگار کی بارگاہ میں اپنے حفظ وامان کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

رات ساڑھے آٹھ بجے کے قریب خدا خدا کر کے اس ٹرینے نے رینگنا شروع کیا۔ 9 بجے کے قریب چند زوردار دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں تو تمام مسافر ایک دم سہم گئے، مگر چند لمحوں بعد ہی نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بلند ہونا شروع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ٹرین پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئی ہے اور جو دھماکے سنائی دیئے تھے، وہ ریلوے لائن پر رکھے ہوئے ان گولوں کی آواز تھی جو مہاجرین کی پاکستان میں آمد کو خوش آمدید کہنے کے لئے رکھے گئے تھے۔

اب ٹرین کی رفتار بھی انتہائی تیز ہو گئی تھی اور ہر شخص کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر مبارک بادیں دے رہے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں اور مرد سب کے چہرے خوشی و مسرت سے دمک رہے تھے۔ انہیں اپنے گھر بار چھوڑنے، عزیز واقارب سے بچھڑنے اور آزادی کی راہ میں دی گئی ان گنت قربانیوں کے سب دُکھ بھول گئے تھے، وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے تھے۔ پاکستان کی سرزمین اپنی بانہیں وا کیے انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ وہ پاکستان جو مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سالہ قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ جس کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا اور جس کو قائداعظمؒ محمد علی جناح کی انتہائی مدبرانہ اور ولولہ انگیز قیادت نے حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک نئی اسلامی مملکت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت، پاکستان۔ پاکستان زندہ باد پائندہ باد، اللہ اکبر، الحمدللہ۔

......☆......

شہر کپورتھلہ کی عالیشان عمارات و باغات

1- جامع مسجد...... یہ عالی شان مسجد دنیا میں اپنی خوبصورتی اور دیگر خصوصیات کے اعتبار سے دوسری عالی شان مسجد متصور ہوتی تھی جسے ریاست کے وزیراعظم دیوان سر عبدالحمید کی اعلیٰ کارکردگی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ یہ مسجد ان کی کوششوں سے مراکش کی جامع مسجد کے نقشہ پر تعمیر کی گئی تھی۔ مہاراجہ نے اس کا افتتاح خود اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ اس مسجد کے جملہ مصارف کا بار خزانہ ریاست نے برداشت کیا تھا۔ حکومت پنجاب نے اس خوبصورت مسجد کا نمونہ بنوا کر عجائب گھر لاہور میں رکھ ہوا ہے۔ اس مسجد میں امامت کے فرائض حضرت مولانا جعفر علی پھلواروی قیام پاکستان تک انجام دیتے رہے۔

2- پنج مندری...... یہ خوبصورت گوردوارہ راجہ شیخ سنگھ نے تعمیر کرایا تھا جو اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے لاثانی حیثیت کا حامل تھا۔

3- دربار حال اور عدالتیں...... قابل دید عمارات تھیں۔

4- ولا محل...... یہ عالی شان محل ولی عہد کی رہائش کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جو کانجی ڈیم سے متصل عالی شان باغ میں واقع اور ایک قابل دید عمارت تھی۔

5- شالامار باغ...... یہ باغ بلا مبالغہ رنگ برنگی بہاروں کا مرکز و منبع تھا جو ریاست کے حسن و جمال میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا تھا۔

علاوہ برآں پرانی سمادھی، جلوخانہ، جگت جیت بازار، رندھیر کالج حمیرہ بیکس (کالی ندی) کمرہ باغ اور جبلی ہال ایسی عمارات اور سیر گاہیں تھیں جنہوں نے ریاست کے حسن و جمال میں ایک قسم کی جاذبیت اور تازگی پیدا کر رکھی تھی۔

والئیِ ریاست اگرچہ مذہباً سکھ تھا، تاہم مسلمانوں سے اس کا سلوک ہمیشہ فیاضانہ اور مساویانہ رہا۔ مسلمان رعایا بھی جس کی آبادی کم و بیش ستر فیصد تھی، راجہ کی ہر طرح وفادار تھی۔ مصنف کے والد میاں محمد علی (مرحوم) تمام شاہی باغات کے مہتمم تھے۔

ریاست میں مسلم لیگ کا قیام

1936ء میں حکیم سرور علی شیرانی، حافظ محمود احمد، مولوی ظفر حسین ایڈیٹر کپورتھلہ سٹیٹ اخبار۔ ڈاکٹر صادق علی خلیفہ امام الدین کپورتھلوی، محمد اکبر سیکرٹری ہیلتھ، چوہدری عبدالشکور کسٹم ڈیپارٹمنٹ، شیخ محمد احمد وکیل اور پروفیسر انوار الحسن نے مل ریاست میں مسلم لیگ کی بنیاد قائم کی۔

مسلم لیگ کے قیام کے بعد مذکورہ بالا کارکنان نے نہ صرف شہر بلکہ قرب وجوار کے قصبات وغیرہ میں بھی مسلم لیگ کے مقاصد، نظریہ پاکستان اور مطالبہ پاکستان کے موضوعات پر تبلیغ و اشاعت کا بڑی سرگرمیوں سے کام شروع کیا۔ اس طرح مسلم لیگ کی شاخیں، سلطان پور، شیخوپورہ، بولتھ، ڈھلواں، پھگواڑہ، مہند پور، سرکاں اور بیگووال وغیرہ قصبات میں قائم کرتے ہوئے عوام کے سیاسی شعور کو جلابخشی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ریاست کے قریئے قریئے میں مسلم لیگ کے سبز ہلالی پرچم لہراتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

لیاقت نہرو معاہدہ اور ڈاکٹر عبدالغنی قریشی

تاریخ پاکستان کی ایک ممتاز و معروف شخصیت ڈاکٹر عبدالغنی قریشی ایم بی بی ایس 1896ء موضع فتو ڈھینگہ ریاست کپورتھلہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طبیہ کالج دہلی میں بطور ہاؤس سرجن تعینات ہوئے۔ 1940ء تا 1947ء دہلی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری اور علاقہ قرول باغ دہلی کے میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔ مسلم کش فسادات کے دوران پرانا قلعہ کیمپ میں انہوں نے اپنا ایک قومی فریضہ سمجھتے ہوئے ہزاروں مصیبت زدگان اور بیماروں کا علاج معالجہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ ہندو حکومت ان کے درپئے آزار ہے، بعید نہیں انہیں قتل کرادیا جائے، لہٰذا وہ اپنے بیوی بچوں سمیت پاکستان آنے کے لئے تیار ہوئے۔

نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر انہیں گرفتار کرکے جیل بھجوادیا گیا اور وہ 1947ء

تک دہلی کینٹ جیل میں مقید رہے۔ان کی اس بلاجواز گرفتاری پر پاکستان کے اوراکثر غیر ملکی اخبارات نے سخت احتجاج کیا۔قریشی صاحب مذکورہ کے رشتہ داروں نے خان لیاقت علی خان وزیراعظم سے ملاقات کی، انہوں نے قریشی صاحب کے مقدمہ کی پیروی کے لئے پاکستان کے مشہور قانون دان مسٹر سلیم بار ایٹ لاء کو مقرر کیا۔مگر ہندو عدلیہ کے ججوں نے ان کی کسی دلیل کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا اور ان کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے مورخہ 14 اگست انہیں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دینے کی تاریخ مقرر کردی۔اس فیصلے کے خلاف پاکستانی عوام اور اخبارات کا ردعمل سخت دیدنی وشنیدنی تھا۔ چنانچہ ریفیوجی منسٹر راجہ غضنفر علی خان نے ایک بیان جاری فرمایا کہ اگر" عبدالغنی قریشی کو پھانسی دی گئی تو یادرہے کہ پاکستان میں ان تمام ہندو یا سکھ مجرمان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا، جن کے خلاف قتل کے الزامات ثابت ہیں۔ چنانچہ اس کشمکش کے پیش نظر "لیاقت نہرو پیکٹ" عمل میں آیا جس کی رو سے دونوں ممالک کے ایسے تمام قیدیوں کا تبادلہ ہوا، لہٰذا قریشی عبدالغنی صاحب کو براستہ گنڈا سنگھ والا 1948ء کو پاکستان میں داخل کردیا گیا۔

دہلی جیل میں ان کی صحت بہت زیادہ خراب ہوچکی تھی۔انہوں نے اپنے احباب اور دوستوں کو بتادیا تھا کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔(Slow Poisining) کردیا گیا ہے، وہ معدے کی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہوچکے تھے۔1949ء میں انگلینڈ کے مشہور سسکس ہسپتال میں ان کا آپریشن ہوا لیکن وہ زندگی سے مایوس ہوچکے تھے۔انہوں نے اپنی بیگم سے کہہ دیا تھا کہ دنیا میں لوگ پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں، یہ قانون قدرت ہے جس سے کسی کو فرار نہیں۔مگر مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں پاکستان کو قائم ہوتے دیکھ لیا ہے۔ یہ میری تمنا، دعا اور خواہش تھی چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد 22 دسمبر 1949ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

مہاراجہ ان دنوں ریاست سے باہر فرانس میں مقیم تھا۔ریاست کے کلی اختیارات اس کے بیٹے پر مجیب سنگھ کے ہاتھ میں تھے، جو قائم مقام راج گدی پر براجمان تھا۔وہ حد درجہ عاقبت نااندیش، نالائق، متعصب اور مسلمانوں کا دشمن واقع ہوا تھا۔ان دنوں کلیدی

عہدوں پر کمانڈر فوج جے سنگھ خلف بخشی پورن سنگھ (جس نے سلطان پور میں محرم کے موقعہ پر گولی چلا کر سات سو مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا) چیف سیکرٹری متھراداس، چیف میڈیکل آفیسر میجر سرنواس، انسپکٹر جنرل پولیس سردار سندر سنگھ (مہاراجہ کا ماموں زاد بھائی) میجر کوٹہ والا، انسپکٹر پولیس ڈی آئی جی پولیس اور بشن سنگھ (ماسٹر تارا سنگھ) کا دوست براجمان تھے۔

ان لوگوں نے وزیر اعظم عبدالعزیز فلک پیا کے خلاف سازشوں کے جال بننے شروع کر دیئے۔ قائم مقام راجہ پر مجیت ان کے ہاتھوں میں پوری طرح مرغ دست آموز بنا ہوا تھا۔ وزیر اعظم فلک پیا نے ریاست کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور اپنے خلاف خطرناک سازشوں کو بھانپتے ہوئے اپنا استعفیٰ قائم مقام راجہ پرمجیت کے سپرد کر کے ریاست سے رخصت حاصل کی۔ اب اس کی جگہ لکھپت رائے کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

وزیر اعظم فلک پیا کے مستعفی ہونے کے فوراً بعد تمام مسلمان ملازمین کو کلیدی اور عام ملازمتوں سے خارج کر کے ان کی جگہ سکھوں کو مامور کر دیا گیا۔

مہاراجہ پٹیالہ نے پرمجیت قائم مقام راجہ کپورتھلہ سے مل کر مسلمانوں کو ریاست سے نکال دینے پر رضامند کر لیا اور ساتھ ہی اس کام کو جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کے لئے اپنی پچاس ہزار فوج اور کثیر تعداد میں اسلحہ کو کپورتھلہ میں بھیجنے کی پیش کش کر دی۔ جس میں سے بیس ہزار فوج کپورتھلہ میں پہنچا بھی دی گئی جسے مہاراجہ کپورتھلہ کی ذاتی ملکیتی ملوں جگن جیت شوگر مل، پرمجیت شوگر مل، شراب مل اور خمیر امل میں ٹھہرایا گیا اور ان جگہوں میں مہلک ہتھیاروں کے انبار لگنے شروع ہو بھی گئے۔

بھوگپور: کندن سنگھ اور نگینہ سنگھ کے باغ میں ریاست کے سکھ فوجیوں کی زیر نگرانی ہندو مہاسبھا راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی دل، مہابیر دل وغیرہ وغیرہ تنظیموں کی ٹریننگ کے لئے کیمپ قائم کر دیئے گئے۔

پھگواڑہ: جرنیل جے سنگھ نے ریاست کے تمام چھوٹے بڑے علاقوں کا دورہ کیا اور پھگواڑہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اسلام چھوڑ کر سکھ مذہب کو قبول کر لیں، ورنہ ان کی زندگیوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس کے بعد اس نے ستار ملز پھگواڑہ میں ہندو اور

سکھوں کے ایک بڑے اجتماع کو ہدایت دی کہ وہ اشارہ ملنے پر پھگواڑہ سے تمام مسلمانوں کو نکال دیں، مزاحم ہونے والوں کو قتل کردیں، بعدازاں ان میں مہلک ہتھیار تقسیم کئے گئے۔ اس کے علاوہ ''امر سنگھ دوسانجھ'' اور ماسٹر تارا سنگھ نے ریاستی علاقوں کے دورے کرکے مسلمانوں کے خلاف پرامن فضا میں زہر ملانا شروع کردیا اور مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے ہر قسم کے مہلک ہتھیار اور دستی بم تقسیم کئے۔ اب انہیں صرف ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کا شدت سے انتظار تھا تاکہ تقسیم کے بعد بھارتی پنجاب کے مسلمانوں کو ہندو حکومت کی حمایت سے تہہ تیغ کردیا جائے۔

المیہ شیخو پورہ

ریاست کپورتھلہ کا یہ ایک تاریخی اور مشہور قصبہ شہر سے 3 میل کے فاصلے پر بجانب سلطان پورہ واقعہ صدیوں سے آباد چلا آرہا تھا۔ اس کی آبادی کم وبیش آٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی، اس جگہ غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، جن میں قاضیوں، ککے زئیوں اور خلیفوں کے خاندان زیادہ باعظمت اور باوقار سمجھے جاتے تھے اور ریاستی معاملات میں بھی سرکردہ اور مقبول تھے۔ قاضی محمد امین شاہ آنریری مجسٹریٹ اور ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے رکن تھے، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر کرنل محمود احمد ایم بی بی ایس اور قابل ترین ڈاکٹر سول ہسپتال کپورتھلہ کے میڈیکل آفیسر تھے، دوسرا لڑکا مسعود شاہ تھا۔ قاضی مقبول عالم، قاضی مخدوم عالم یہ تمام افراد مسلم لیگ کے بڑے سرگرم کارکنان اور معاونین میں شامل تھے۔ 12 ستمبر بوقت صبح اس خاندان پر زبردست منظم حملہ ہوا۔ ان کے گھروں اور حویلیوں کا گھیراؤ کیا گیا۔ قاضی خاندان کے 35-30 نفوس جن میں قاضی صاحب موصوف کے فرزندان، ان کے داماد، نواسے اور نواسیاں ودیگر افراد خاندان تھے، حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے شہادت کا جام پی کر اپنے پروردگار کے

پاس پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ مہر محمد نومسلم سب انسپکٹر پنشن یافتہ اور منشی شاہ محمد نومسلم معہ تمام افراد خاندان شہید کر دیئے گئے۔ دس گھنٹے تک حملہ جاری رہا۔ امرت لال کی گلی میں ایک ہندو نے کم وبیش چار صد سے زیادہ مسلمان خواتین کو پناہ دے رکھی تھی، ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ ان شہداء کے علاوہ جالندھر شہر، نکودر، شاہکوٹ کے ڈیڑھ صد سے زیادہ جو لوگ اس جگہ پناہ حاصل کرنے کی غرض سے جمع ہو چکے تھے، وہ تمام لوگ بھی شہید کر دیئے گئے اور ان کی نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا۔

اُوپر بیان کردہ تمام دردناک واقعات مہاراجہ جگجیت سنگھ کی ریاست سے غیر حاضر ہونے کے دوران پیش آئے۔ وہ حسب معمول ان دنوں یورپ میں اپنے عیش ونشاط کی زندگی گزارنے میں مصروف تھا۔ اسے ریاست کے واقعات وحالات کا جب علم ہوا تو وہ فوراً ہندوستان میں وارد ہو کر دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز جالندھر کے ہوائی اڈہ آدم پور میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ اس کے ایک خدمت گار ڈنی چند پہاڑیہ نے انہیں بتایا کہ ریاستی افواج کے جرنیل جے سنگھ نے ریاست کے بعض افسران سے ملی بھگت کر کے انہیں (راجہ) کو قتل کر کے گدی پر قبضہ کرنے کی سازش تیار کر رکھی ہے۔ یہ سن کر راجہ مذکور آدم پور ہی سے واپس دہلی کو روانہ ہو گیا، پھر دو ماہ بعد نومبر میں جب مسلمانوں کا ریاست سے خاتمہ کر دیا گیا اور امن و امان کی فضا قدرے سازگار ہوئی تو مہاراجہ ریاست میں داخل ہوا۔ اس نے تمام سازشی افسران معہ جنرل جے سنگھ کو ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا۔

کپورتھلہ کے قصبہ شیخوپورہ کے قتل عام اور تباہی کے ردعمل میں پاکستان کے شہر شیخوپورہ کو مسلمانوں نے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ کپورتھلہ کے مہاجرین کی آخری ٹرین جب لاہور کی بجائے شیخوپورہ آ کر رُکی تو شہر کا کوئی مکان رہائش کے قابل نہ تھا، چنانچہ مصنف اور اس کے خاندان کو ریلوے سٹیشن کے پار ایک رائس فیکٹری میں ٹھہرایا گیا تھا۔

بابو خان مہاوت کا بیان

ریاست سے بیشتر مسلمانوں کو یا تو قتل کر دیا گیا یا انہیں ریاست سے بچ بچا کر نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک مسلمان فردِ واحد "بابو خان مہاوت" کو جبراً ہاتھیوں کی نگہداشت کے لئے روک رکھا تھا۔ راجہ نے ہاتھی پر سوار ہو کر قرب و جوار کے علاقوں کا جائزہ لینے کے لئے بابو خان مہاوت کو اپنے خاص ہاتھی کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ راجہ نے ہاتھی پر سوار ہو کر قریب و جوار کے مسلمان دیہاتوں کا دورہ کیا۔ جو بالکل برباد ہو چکے تھے۔ فصلیں تباہ ہو چکی تھیں۔ ہزاروں لوگ جو کبھی مہاراجہ کے استقبال کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے انتظار میں کھڑے رہتے تھے، اب وہاں صرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

مہاراجہ نے مہاوت بابو خان سے پوچھا، "بابو خان یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟" بابو خان نے جواباً کہا کہ "مہاراج یہ سب تباہی و بربادی بڑی سرکار پر جیت سنگھ (راجہ کا بیٹا) اور جرنیل جے سنگھ نے کی ہے۔ لاکھوں مسلمان قتل کئے گئے۔ ان کی لڑکیوں کو اغوا کیا گیا، ان کے گھروں اور حویلیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ فصلیں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ ریاست کی وہ بہار آفرینیاں ختم ہو چکی ہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے، بازار بند ہیں، کاروبار ختم ہیں۔ ہر طرف ہو کا عالم ہے اور بھوت ہیں جو ناچ رہے ہیں، اگر آپ موجود ہوتے تو شاید یہ تباہی جو آپ دیکھ رہے ہیں وہ نہ ہوتی"۔ راجہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس نے حکم دیا "واپس چلو"۔ واپس آ کر وہ اپنے محل میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے پر جیت سنگھ اور دیگر ملازمین ریاست کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور سب کو مخاطب کرتے ہوئے دُکھ سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"تم سب تارا سنگھ جیسے سکھ لیڈروں کے جال میں گرفتار ہوئے۔ تم نے میری وفادار رعایا مسلمانوں کو قتل کیا۔ تا کہ تمہارا خالصتان بن جائے۔ میری پیش گوئی کو غور سے سن لو"۔

"ہندو تمہیں کبھی خالصتان بنانے نہیں دے گا۔ عنقریب سکھوں کی ریاستوں کو

بھی ختم کر دے گا۔ تم نے مسلمانوں کو قتل نہیں کیا بلکہ سمجھ لو کہ تم لوگوں نے اپنی گردنوں پر کرپانیں چلائی ہیں۔ مسلمان پاکستان بنا کر زندہ ہو گئے ہیں اور وہ ایک قوم کی حیثیت سے زادہ رہیں گے، مگر ہندو زود یا بہ دیر سکھوں کو اپنے اندر جزب کر کے ان کے تشخص اور وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا"۔ ان باتوں کے بعد بقول بابو خان حاضرین کو رخصت کر کے مہاراج اپنی آرام گاہ میں چلے گئے۔ مہاراجہ کی یہ پیش گوئی 1984ء میں مشرقی پنجاب میں اندرا گاندھی کے ہاتھوں "گولڈن ٹمپل" کی تباہی اور ہندوستان بھر میں سکھوں کے قتل عام کی صورت میں پوری ہوئی۔

حضرت قائداعظمؒ کو قیامِ کپورتھلہ کے دوران شاہی خاندان امانت علی خاں کے تیار کردہ فرنچ کھانے بہت پسند آتے تھے، چنانچہ زیارت میں اپنی علالت کے دوران جبکہ ان کی بھوک بالکل ختم ہو چکی تھی، محترمہ فاطمہ جناحؒ کی خواہش پر امانت علی خان کو لائل پور سے زیارت بلوایا گیا تھا اور ان کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا قائداعظمؒ نے رغبت سے کھایا تھا، جس کا ذکر ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش (مرحوم) نے اپنی کتاب "قائداعظمؒ کے آخری ایام" کے صفحہ 37 پر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کی ہدایت پر امانت خاں کو لائل پور کے کچہری بازار میں گھنٹہ گھر کے قریب واقع گرانڈ ہوٹل الاٹ کیا گیا تھا۔ امانت خاں کی مصنف کے والد صاحب سے گہری دوستی تھی۔

قیامِ پاکستان کی غرض وغایت

اکثر نوجوان جنہوں نے پاکستان بنتے نہیں دیکھا اور نہ ہی حصولِ پاکستان کی جنگ میں حصہ لیا۔ شعوری یا لاشعوری طور پر سوال کرتے ہیں کہ مشرقی یعنی بھارتی پنجاب کے مسلمانوں پر ظلم وسفاکی اور بہیمیت وبربریت کے اتنے پہاڑ کیوں توڑ گئے جن کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی؟ اور ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر پاکستان بنانے کی غرض وغایت کیا تھی؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ:

مسلمان بحیثیت ایک قوم اپنی تہذیب ومعاشرت، اپنی روایات وثقافت اور

اپنے دین وتمدن کی حفاظت کے لئے غیر مسلم ہندو اور انگریز دشمنوں کی دائمی غلامی سے آزاد رہتے ہوئے اپنی آئندہ نسلوں کے لئے پاکستان کے نام سے اپنی ایک علیحدہ مملکت حاصل کرنے کے خواہاں تھے، تاکہ اس مملکت خداداد میں انہیں خوشگوار اور شگفتہ کامرانیاں حاصل ہوں۔ وہ دائمی اور لازوال عظمتوں سے ہمکنار ہوں، اسلامی عدل واحسان کی زمرہ ریزیوں سے اس قصر زرنگار (پاکستان) کی فضائیں لبریز ہوں اور اس شہرستان لازوال (پاکستان) کی وسعت اور پہنائیوں میں اسلام کی روح پرور اور نشاط انگیز داستانیں جگہ جگہ بکھری نظر آئیں۔ اسلام کے متعلق صدیوں سے نظریاتی انتشار کا شکار یہ قوم ایک بار پھر توحید کی مرصع ومجلی سلک میں منسلک ہو۔ تاکہ اس ناقہ بے زمام میں کوئی جذب دروں پیدا ہو سکے۔ اور ہر متنفس کو اس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمر باری کے اسباب ومواقع بلا روک ٹوک حاصل ہوں۔ یہ تھا وہ جذبۂ محرکہ اور مقاصد اس قوم کے جس نے اپنے عظیم قائد حضرت محمد علی جناحؒ کی بے مثال قیادت میں متحد ہو کر اور تاریخ انسانی کی بے مثال و بے نظیر قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا۔

ہولناک مظالم

(سردار بچن سنگھ ایم ایل اے)

ماہ جولائی کے اخیر میں اکالی پارٹی والوں نے ایک خاص پروگرام کے ماتحت شہیدی دل قائم کر کے سکھ عوام کو گمراہ کیا۔ ابتداء میں انہوں نے چند آدمی گوردوارے کی حفاظت کے بہانے ملازم رکھے۔ انہیں خاص طور پر فسادات کی تربیت دی گئی اور تربیت دے کر دھرم کے نام پر اس بات کے لئے تیار کیا گیا کہ وہ دیہات کے رہنے والے مسلمانوں کو موقع پا کر قتل کر دیں۔ ماہ اگست کے شروع میں ضلع امرتسر کے اکثر دیہات میں اکے دکے مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ مسلمانوں نے بھی مقابلے میں راہ گیر سکھوں کو قتل کیا۔ پھر کیا تھا، اکالی پارٹی نے سمجھ لیا کہ ان کا کام بن گیا ہے۔ لوہا گرم ہے اس پر چوٹ لگانی چاہئے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے چند ایک پولیس افسروں کی حمایت لے لی۔ ان پولیس افسروں نے 13,12 اگست کے بعد جب مسلمان پولیس ملازمان سے ہتھیار چھینے

جا چکے تھے۔ کھلم کھلا اکالی جتھوں کی حمایت شروع کر دی۔ مجھے ذاتی علم ہے کہ بعض پولیس افسروں نے خود سکھ عوام کو اکسایا اور انہیں مسلمان دیہات پر حملہ کرنے کے لئے زور دیا بلکہ خود ان کے ہمراہ ہو گئے۔ جب سکھ عوام نے دیکھا کہ ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں تو انہوں نے نہایت بے باکی اور بے فکری سے مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا۔ 19,18 اگست (عیدالفطر) کو ضلع امرتسر کے دیہات میں یہ وبا بہت زور پکڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکالی پارٹی کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ انہوں نے ساڑ پھونک کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا، جس کے باعث مسلم عوام اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ انہیں گھر بار کو خیر باد کہنے کے سوا اپنی سلامتی کا کوئی دوسرا راستہ نظر ہی نہیں آیا۔ اس دوران میں سکھ جتھے مسلمان دیہاتوں پر اکٹھے یورش کرتے اور پولیس والے بھی ان کے ہمراہ جاتے، قتل کرنے کے علاوہ جو مسلمان بھاگ کر جان بچاتے اور اپنے گھروں کو خالی کر دیتے، ان کی جائیدادوں پر یہ جتھے ہاتھ صاف کرتے، ان کو دل بھر کر لوٹتے، جوں جوں لوٹ کی عادت بڑھنے لگی، جتھوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا...... راولپنڈی کے مسلمانوں نے یکمشت وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کو اپنے گھر بار چھوڑنے کے لئے کوئی باقاعدہ مہم شروع نہیں کی تھی، جس کے باعث وہ تحریک تمام پنجاب میں نہ پھیل سکی اور وہ ایک مقامی گڑ بڑ بن کر رہ گئی، مگر اکالی پارٹی نے جو مہم اگست میں شروع کی، وہ ایک باقاعدہ سکیم کے تحت شروع کی گئی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو نہ صرف مشرقی پنجاب بلکہ تمام ہندوستان سے نکالنا تھا۔ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے معتبر دوستوں سے اس گڑ بڑ کے ہولناک مظالم کی بابت سنا ہے، اس کی یاد بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ مشرقی پنجاب کے لوگوں نے بے گناہ انسانوں اور معصوم بچوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ ان کا کبھی کسی کو تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ بچوں کو والدین کے روبرو برچھیوں اور بھالوں پر چڑھا کر مار دیا گیا اور زندہ انسانوں کو جلتی آگ میں ڈال کر بھون دیا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا۔ ایک عورت کے ساتھ دس دس غنڈوں نے رات بھر زنا بالجبر اس شدت سے کیا کہ وہ پاگل ہو گئی۔

(12 جولائی 48ء کے اخبار "بندے ماترم سے")

ہم پھر واپس آئیں گے

(فیروز خان نون)

میرا خیال ہے کہ کانگرسی لیڈروں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ یہ کٹا پھٹا پاکستان جو دو حصوں کے درمیان ہندوستان کے ایک ہزار میل حائل ہیں، زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گا۔ لائل پور کے ایک سکھ ایڈووکیٹ سردار سمپورن سنگھ نے جو بعد میں ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر ہو کر لاہور آئے تھے، مجھے بتایا کہ ماسٹر تارا سنگھ نے لائل پور میں سکھوں کے پاس گیلانی کرتار سنگھ کو یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ نقل مکانی نہایت پرامن طریقے پر کریں کیونکہ انہیں اپنی کھڑی فصلوں کی کٹائی کے لئے چھ مہینہ بعد ہی واپس آنا ہوگا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ایک منصوبے کا حصہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس نوزائیدہ مملکت میں لٹے پٹے مسلمان مہاجرین کو دھکیل کر اور جو ہندو یہاں کے کاروباری اداروں اور بنکوں میں کام کر رہے ہیں، انہیں یہاں سے بلا کر اس سے ملک کی معیشت تباہ کر دی جائے گی۔

(خودنوشت ''چشم دید'' سے)

بیس لاکھ مسلمانوں کی لاشیں

(مرتضیٰ احمد خاں میکش)

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع امرتسر، گورداسپور (ماسوائے تحصیل شکر گڑھ) فیروز پور، جالندھر، ہوشیار پور، کانگڑہ، انبالہ، رہتک، حصار، گوڑ گاؤں نیز کپور تھلہ، پٹیالہ، جیند نابھ، کلیہ، الور، بھرت پور اور کوہستان شملہ کی تمام ریاستوں سے مسلمان بیک بٹی دو گوش نکال کر باہر پھینک دیئے گئے۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہنے والا اور اس حقیقت کبریٰ کا اقرار و اعلان کرنے والا ایک متنفس بھی اس وسیع ملک میں جس کا رقبہ ستر ہزار مربع میل ہے باقی نہ رہا۔ مخفی نہ رہے کہ بہار کے صوبے سے مسلمانوں کے اخراج کا کام بہت

پہلے پایہ تکمیل کو پہنچایا جا چکا تھا۔ اس قتل عام اور اخراج کے باعث مسجدیں ویران ہو گئیں، بزرگوں کے مزار تباہ کر دیئے گئے، ہزاروں مسلمان عورتیں جبراً وقہراً لونڈیاں بنا کر رکھ لی گئیں، ہزاروں بچے چھین لئے گئے اور ہزاروں خاندان ہندو یا سکھ بنا لئے گئے۔

ان اضلاع کی چھپن لاکھ مسلم آبادی میں سے لاکھوں کلمہ گو قتل کر دیئے گئے، اکثر گولیوں کا شکار ہوئے، بہت سے تیز دھار رکھنے والے آلات سے مارے گئے، ایک بڑی تعداد زندہ نذر آتش کر دی گئی۔ یہ ساری زمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنگئی اور کلمہ گویان توحید کی لاشوں سے پٹ گئی۔ چیلوں، کوؤں، گدھوں، کتوں اور گیدڑوں نے ان کا گوشت نوچ نوچ کر اس حد تک کھایا کہ سیر ہو کر منہ موڑ گئے۔

لاکھوں مسلمان حشر تمثال کیمپوں کے زہر گداز مصائب اور سفر کی ناقابل برداشت صعوبتوں کا شکار ہو ہو کر مر گئے اور جہاں جہاں سے گزرے اپنے قبرستانوں سے زمین کو آباد کرتے گئے۔ ہزاروں مسلمان بارشوں کے باعث آنے والے سیلابوں اور دریاؤں کی طغیانیوں میں غرقاب ہو کر بہہ گئے۔ دریائے بیاس کے دونوں طرف کئی کئی میل تک زمین ان کی گلی سڑی لاشوں سے پٹ گئی۔ گرانڈ ٹرنک روڈ سے ناک بند کئے بغیر گزرنا مشکل ہو گیا۔

دہلی کے ہزاروں مسلمان سب کیفیات کا تختہ مشق بن کر تلف ہوئے اور ہندوستان کے دیگر اضلاع سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے کے لئے وارد ہوئے۔ یہ مسلمان کروڑوں روپے کی جائیدادیں، املاک، اموال، اراضی، باغات، مویشی، سامان، گھر، عمارتیں اور کاروبار چھوڑ کر آئے اور پاکستان میں پہنچ کر تباہ حالی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

جان و مال کے اس اتلاف پر یہ مصیبت جھیلنی پڑی کہ بھائی سے بھائی بچھڑ گیا، اعزاء واقربا ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دُور جا پڑے، گاؤں کے لوگ جو پشتوں سے رنج وراحت کے شریک چلے آرہے تھے، تتر بتر ہو گئے۔

ان تمام اتلافات اور نقصانات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل بلکہ امر محال

ہے۔تاہم زیادہ سے زیادہ حزم واحتیاط کوملحوظ رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ:

قتل ہونے والوں کی تعداد پانچ لاکھ

کیمپوں میں اور سفر کے مصائب سے مرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ

پاکستان میں پہنچنے کے بعد دو ماہ کے اندر اندر مرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ

ان عورتوں، بچوں اور مردوں کی تعداد جو ہندو بنا لئے گئے، ایک لاکھ

قصہ مختصر سولہ لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک مسلمان چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہلاک ہوگئے۔ باقی ماندہ کی خانہ بربادی اس پر مستزاد ہے۔کل ایک کروڑ سے زائد مسلمان سارے ہندوستان سے اس قیامتِ صغریٰ کی لپیٹ میں آگئے۔

(واقعاتی تصنیف ''اخراج اسلام از ہند'' سے)

ریاستوں میں مسلمانوں کی تباہی وبربادی

اسی خونی واقعہ کو مشہور صحافی، ادیب، شاعر اور دانشور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے اپنی کتاب ''اخراج اسلام از ہند'' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مشرقی پنجاب اور اس کے نواحی اضلاع واقطاع میں ہندوستان کے آزاد ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردینے کی جو مہم ہمہ گیر تنظیم وسازش کے ساتھ شروع کی گئی، اس میں کپورتھلہ، فردکوٹ، پٹیالہ، جیند، کلسیہ، نابھہ اور بھرت پور کی ریاستوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان ریاستوں کے حکمران اور اعلیٰ حکام تمام کے تمام اس سازش میں شریک تھے جو ہندوؤں اور سکھوں کے چوٹی کے سیاسی لیڈروں نے پہلے سے طے کررکھی تھی۔ ان ریاستوں کے فوجی دستے سکھوں کے جتھوں میں شامل ہوکر مسلمانوں کو تاراج کرتے رہے اور انہیں ریاستوں کے حکام نے مشرقی پنجاب اور دہلی کے سکھوں اور ہندوؤں کو ہر قسم کا اسلحہ بہم پہنچایا اور خود اپنے علاقوں میں شدید تر سفاکی کے ساتھ مسلمانوں کو نیست ونابود کردینے پر عمل کیا اور کرایا۔ ان ریاستوں کے مسلمانوں کی سرگزشت کے سلسلے میں جو بیانات موصول ہوئے ہیں وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

کپورتھلہ:

15 اگست کے بعد جب امرتسر، ہوشیار پور اور جالندھر کے اضلاع میں جو ریاست کپورتھلہ کی حدوں پر واقع ہیں، مسلمانوں کے دیہات پر حملے ہونے لگے اور شہر جالندھر کو تاراج کیا گیا تو متاثرہ علاقوں کے لوگ ریاست کو بدامنی سے محفوظ خیال کرتے ہوئے ریاست میں جانے لگے۔ عام شہرہ یہ تھا کہ مہاراجہ صاحب کپورتھلہ نے جوروادارى

کے ساتھ حکومت کرنے کے معاملہ میں اچھی شہرت کا مالک تھا۔ حکم دے رکھا ہے کہ ریاست کو ہر قیمت پر بدامنی سے محفوظ رکھا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی نواحی اقطاع کے باخبر لوگ کہہ رہے تھے کہ مہاراجہ کا حکم اور ان کی نیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ریاست کے ٹکا صاحب، جگجیت سنگھ (ولی عہد) اور دوسرے چھوٹے بڑے اہلکار اکالیوں کی سازش میں شریک ہیں اور ٹکا صاحب نے اکالیوں کی ایک بھاری جمعیت باغ میں جمع کر رکھی ہے جس سے وہ اپنے وقت پر کام لے گا۔

15 اگست سے لے کر ستمبر کے آغاز تک ریاست کپورتھلہ میں امن رہا بلکہ اردگرد کے پناہ گزین بھی ریاستی علاقہ میں جمع ہوتے رہے۔ آغاز ستمبر میں سکھوں کے جتھوں نے تباہ کاری کا پروگرام شروع کیا اور مسلمانوں کو گھروں سے بے داخل کر کے قافلوں کی شکل میں نکالنے کی مہم شروع کر دی گئی۔

10 ستمبر کو کپورتھلہ کے دس ہزار خانماں برباد مسلمانوں کو ایک اسپیشل ٹرین میں سوار کرایا گیا۔ یہ ٹرین جو چھیاسٹھ کھلے چھکڑوں پر مشتمل تھی دوپہر کے وقت کپورتھلہ سے جالندھر کی طرف روانہ ہوئی۔ پانچویں میل پر کھوجے والی اسٹیشن کے قریب اس کا انجن اور تین چھکڑے پٹڑی سے اتر گئے اور ٹرین وہیں رک گئی۔ سکھوں کے ایک جم غفیر نے ٹرین پر حملہ کر دیا۔ بیس بائیس گھنٹے قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے کہرام مچ گیا۔ بہت سے لوگ ٹرین سے اتر کر بھاگ گئے۔ ڈوگرا ملٹری حملہ آوروں کو روکنے اور پیچھے ہٹانے سے عمداً ناکام رہی۔ اسی مقام پر کوئی پانچ سو افراد شہید کر دیے گئے جو لوگ گاڑی سے اتر گئے وہ ایک ایک کر کے بحال تباہ جالندھر کی بستی بابا خیل میں پہنچے جہاں ابھی چند گھر مسلمان گارد کی حفاظت میں بیٹھے تھے۔

دوسرے دن دوپہر کے تین بجے جالندھر سے ایک خالی ٹرین آئی۔ مسافروں کو اس پر سوار کرایا گیا۔ اس ٹرین نے 35 منٹ میں ایک میل کا سفر طے کیا، پٹڑی سے لڑھک گئی۔ یہاں پر حملہ ہوا اور سکھ مسلمانوں کو قتل کرتے رہے۔ کپورتھلہ کی افواج کا کمانڈر رجے سنگھ بھی موقع پر موجود تھا۔ اس نے بھی حملہ آوروں کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ رات کے

وقت جالندھر سے کرین آیا اس نے ٹرین کو اٹھا کر پٹڑی پر رکھا اور گاڑی وہاں سے رجعت قہقری کے کھیل کھیلتی ہوئی روانہ ہوئی اور تیسرے دن شام کے چھ بجے جالندھر پہنچی۔

جالندھر میں ٹرین کو پلیٹ فارم کے بجائے یارڈ کی لائن پر لگا دیا۔ رات بھر غنڈے لوٹ کھسوٹ کرتے رہے اور کوئی اڑھائی سو جوان عورتوں کو اٹھا کر لے گئے جن وارثوں نے انہیں بچانے کی کوششیں کیں، انہیں قتل کر دیا گیا۔

رات کے وقت یہ لٹا ہوا قافلہ امرتسر کی طرف روانہ ہوا۔ بیاس کے اسٹیشن سے ذرا آگے ٹرین کو روک لیا گیا اور تلاشی لی گئی۔ مسافروں کے پاس جو نقد اور زیور بچ رہا تھا وہ یہاں چھین لیا گیا۔ صبح پانچ بجے ٹرین امرتسر پہنچی، اسے یارڈ میں واشنگ لائن پر لگا دیا گیا۔ کپور تھلہ سے روانہ ہونے کے بعد مسافروں کو کسی جگہ پانی نہ ملا تھا اس لئے کوئی پانچ سو افراد پیاس کے مارے مر گئے۔

امرتسر میں گورداسپور سے مہاجرین کی ایک اور اسپیشل بھی پہنچ گئی جس کے ساتھ 16 پنجاب رجمنٹ کا ایک محافظ دستہ تھا۔ اس دستہ کے بہادر اور فرض شناس جوانوں نے دونوں ٹرینوں کی حفاظت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ یہ جوان پوری مستعدی سے مسافروں کو پانی پلاتے رہے۔ یہاں سے دونوں ٹرینوں کو ایک کر کے لاہور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ٹرین لڑکھڑاتی ہوئی کوئی شام کے پانچ بجے لاہور پہنچ گئی۔ اس مختصر سے راستے میں ٹرین پر چار حملے ہوئے، کوئی اڑھائی ہزار افراد شہید کر دیئے گئے۔ پانچ سو افراد پانی نہ ملنے کے باعث جاں بحق تسلیم ہوئے۔ نقدی تمام کی تمام لوٹ لی گئی اور اڑھائی سو کے قریب نوجوان عورتیں غائب کر لی گئیں۔

''اخراج اسلام از ہند'' (مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش)

خونیں لکیریں

اقتباس از فریڈم ایٹ مڈنائٹ، مصنفہ لیری کولن

یوم آزادی جہاں مسلمانانِ ہند کے لئے پیام مسرت تھا وہاں ان کے لئے آلام و مصائب اور آزمائش عزم و استقلال بھی تھا، لیکن خاص طور پر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے لئے یہ تباہی و قیامت کا پیام بھی تھا، اس روز ظلم و ستم، تشدد و شقاوت کے ایسے شعلے بلند ہوئے جنہوں نے ہزاروں بے گناہ مسلمان بچوں، عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

14 اگست 1947ء کی صبح کو طلوع ہونے والا سورج بھی یوں تو درخشندہ صبح اور نئے اُجالوں کا پیامبر تھا، مگر ظلم و بربریت کے ان گنت واقعات کے باعث اس کی مسرت بھری بنفشی اور سنہری کرنیں آگ و خون کے کھیل میں قرمزی رنگ اختیار کر چکی تھیں۔

آزادیٔ پاکستان کے بعد امرتسر میں نئے حکام نے اپنے اختیارات سنبھال لئے تھے، لیکن شہر میں امن و امان کی صورت حال نہایت مخدوش تھی۔ شہر اور اس کے مضافاتی و دیگر علاقوں میں سکھ غنڈے مسلسل بے گناہ مسلمانوں کا بے دریغ خون بہار ہے تھے اور ان کے گھروں کو لوٹ کر نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ ماؤں کی گود سے ان کے معصوم بچے چھین کر سفاکانہ انداز سے قتل کئے جا رہے تھے۔ جوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی آبروریزی کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلمان عورتوں کے پستان کاٹ دیئے جاتے اور انہیں برہنہ کر کے شہر کا چکر لگایا جاتا اور پھر انہیں دربار صاحب میں لا کر قتل کر دیا جاتا۔

پاکستان پہنچنے کی اُمید اور خواہش دل میں بسائے رواں دواں نہتے قافلوں پر سکھ بلوائی حملے کر کے تمام مرد و خواتین کو قتل کر دیتے اور پھر طاقت کے زعم میں خوش ہوتے، اُچھلتے کودتے، دوسرے قافلوں کے تعاقب میں بھاگ پڑتے۔

یادوندر سنگھ پٹیالہ کی ایک ریاست پر حکمران تھا، اس کے جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ کی پوری ریاست پر دھاک تھی، جب ریاست کے سکھ جتھے سرحد پار کر کے پاکستان

پہنچنے کے خواہشمند مسلمان قافلوں پر حملہ آور ہو رہے تھے تو راجہ کے بھائی بھالندر سنگھ نے سکھوں کے ایک جتھے کو روکا جو مسلمان قافلہ پر حملہ آور ہونے جا رہا تھا۔ بھالندر سنگھ نے جتھے میں شریک سکھوں کو سمجھایا کہ ''یہ وقت فصل کی کٹائی کا ہے اور تم خوامخواہ خون کی اس ہولی میں اپنا وقت گنوا رہے ہو۔ اپنے گھر واپس جا کر فصل کی کٹائی کا کام شروع کرو''۔ اس پر تمام سکھ بلوائیوں نے یک زبان ہو کر بلند آواز میں جواب دیا۔

''مہاراج! ایک اور نئی فصل بھی پکی ہوئی ہے جسے کاٹنا نہایت ضروری ہے۔ پہلے ہمیں اسے تو کاٹ لینے دو''۔ اور کرپانیں لہراتے ہوئے مسلمانوں کے تعاقب میں چلے گئے۔

اس واقعہ پر ظاہر ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے مطالبہ پر سکھ قوم مسلمانوں کے خلاف کس قدر نفرت اور بغض رکھتی تھی اور نفرت کے اس لاوا کا شکار اب بے گناہ مسلمان ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کے قتل عام، لوٹ مار اور آتشزدگی کی وارداتیں کم نہ ہوئیں، بلکہ یہ روز کا معمول بن گیا اور ایسا کوئی لمحہ نہ تھا جس میں تشدد کا کوئی واقعہ رونما نہ ہوتا، ٹرین کے ذریعے پاکستان پہنچنے کے خواہشمند مسلمانوں پر کسی ریلوے اسٹیشن پر زبردستی ٹھہرا کر سکھ بلوائی اچانک حملہ کر دیتے اور ٹرین میں موجود تمام مسلمانوں کو شہید کر دیتے۔

نئی دہلی اورنگ زیب روڈ پر پرانی دہلی کے چاندنی چوک، امرتسر کے گلی کوچوں اور محلوں، ریلوے اسٹیشنوں، ٹی ہاؤسوں، ہوٹلوں، غرض ہر مقام پر افراتفری اور انسانیت کے رشتوں کا تقدس محو ہو چکا تھا، وہ اپنی قوت کے زعم میں وحشی درندے بن چکے تھے، یہ ایسے واقعات تھے جنہیں نہ سرد جنگ اور نہ خانہ جنگی، گوریلا جنگ یا کسی بھی جارحیت کے جواب میں دفاعی کارروائی کا نام دیا جا سکتا تھا۔

بلکہ یہ ایک ایسی قوم پر زیادتی کی جا رہی تھی جس نے اپنا حق آزادی مانگا تھا۔ وحشت و بربریت کا یہ کھیل ایک معاشرتی تصادم بھی تھا۔ بموں، گولیوں اور ہتھیاروں سے تو عمارتیں تباہ ہوتی ہیں، مگر یہاں پنجاب کی معاشرت تباہ و برباد ہو رہی تھی۔

فیروز پور کے ایک مضافاتی دیہات کا مزارع احمد اللہ کہہ رہا ہے ''سکھ بلوائیوں کی فائرنگ سے میرا تین سالہ بچہ بھی شہید ہو گیا، یہ خونی کھیل کھیلنے کے بعد بلوائی چلے گئے اور

میں زخمی حالت میں گرتا پڑتا اپنی بیوی اور دوسرے بچے کو اٹھا کر گھر سے باہر نکل آیا۔

سکھ بلوائی دوسرے گھروں میں بھی یہ کھیل کھیل رہے تھے اور بے گناہ مسلمانوں کو اپنے تشدد اور ظلم کا نشانہ بنا رہے تھے۔ انہوں نے ان کے گھروں کو نذر آتش کرنے کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا جوان لڑکیوں کو ان کے والدین سے چھین کر اغوا کر کے آبروریزی کر رہے تھے، ہر طرف چیخ و پکار کا طوفان بپا تھا۔

اس اثناء میں چند سکھ نوجوان مجھ پر حملہ آور ہو گئے، انہوں نے میری مردہ بیوی کو مجھ سے چھین لیا اور میرے دوسرے بچے کو میری آنکھوں کے سامنے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چلے گئے اور مجھے سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ گئے۔ میں ان مناظر کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

آزادی کی قیمت

ایک ہزار مسلمان چالیس ہزار حملہ آور

یو پی کے ضلع بلند شہر میں کیسر کلاں نامی ایک بستی ہے، ڈھائی ہزار کے لگ بھگ آبادی آدھے مسلمان، آدھے ہندو، مسجدیں، پکی سڑکیں جو علی گڑھ اور دلی کو جاتی ہے اور ریلوے لائن بھی۔

اگست 1947ء کے تیسرے ہفتے تک ارضِ دلی میں اندیشہ و اضطراب کی لہریں تو اُٹھنے لگی تھیں، مگر یہ شہر ابھی تک فساد کے شعلوں سے محفوظ تھا۔ پاکستان بنتے ہی ہندوؤں کے برتاؤ اور ملنے جلنے کے طور طریق میں ایکا ایکی تبدیلی آ گئی۔ ان کے تیوروں سے برہمی ظاہر ہونے لگی۔ مسلمانوں کو نفرت او غصے کی نگاہوں سے دیکھتے۔ ہمارے گاؤں کے ہندوؤں کا بھی یہی رنگ تھا۔

12 ستمبر کی صبح کچھ اس طرح طلوع ہوئی جیسے وہ انتہائی بھیانک اور خطرے کی خبر دے رہی ہے۔ ساڑھے تین بجے کے قریب چاروں طرف سے حملہ آور آتے ہوئے نظر آئے۔ ریل کی پٹڑی پر کئی فرلانگ تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس

مسلمان عورتوں کو لے جانے کے لئے کوتل گھوڑے تھے۔ بندوق، دستی بم، نیزے، تلواریں، بلم، کلہاڑیاں اور وہ سب کچھ تھا جس سے مسلمانوں کو ذبح کیا جا سکتا تھا۔ میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر دروازے کے بالکل سامنے مسجد ہے۔ اس کی چھت پر ہمارے محلے کے لوگوں نے مورچہ لگا دیا تھا، اس پر چھوٹی سی خانہ ساز توپ نصب تھی، تھوڑی دیر بعد حملہ آوروں نے مسلمانوں پر ہلہ بول دیا اور گولیاں چلنے لگیں۔ ریلوے سٹیشن کی طرف سے جو سڑک آتی ہے وہاں حملہ آوروں کا سب سے زیادہ دباؤ تھا محتاط اندازہ ہے کہ حملہ آوروں کی کل تعداد 40 ہزار کے لگ بھگ تھی۔ دُور دُور سے گاؤں سے ہندو اس کام میں حصہ لینے کے لئے آئے تھے۔

(''جسے میں بھول نہیں سکتا'' تحریر از ماہر القادری)

......☆......

شہیدِ ناموسِ پاکستان، کامریڈ امریک سنگھ

میاں محمد ابراہیم طاہر

کامریڈ "امریک سنگھ" سے میرا ابتدائی تعارف میاں محمد شفیع (م۔ش) مرحوم نے کرایا تھا۔ یہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے، میاں صاحب ان دنوں میاں افتخار الدین کے اخبار "پاکستان ٹائمز" کے چیف رپورٹر تھے۔ "پاکستان ٹائمز" (انگریزی) اور "امروز" (اردو) اس کے دور کے دو ایسے اخبارات تھے جن کے عملے کو ہر ماہ باقاعدگی سے تنخواہ ملا کرتی تھی۔ ان اخبارات کے دفاتر لاہور شہر کے قلب میں، میو ہسپتال چوک میں واقع تھے۔ میاں محمد شفیع، م۔ش کے قلمی نام سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا کرتے تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ انگریزی زبان کے بڑے صحافی ہیں یا اردو زبان کے۔

میں جب کبھی لائل پور سے لاہور آتا تو میاں صاحب کو سلام کرنے "پاکستان ٹائمز" کے دفتر میں حاضری دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ میں نے ان دنوں اردو اخبارات میں مضامین لکھنے کا آغاز کیا تھا اور میاں صاحب کے مفید مشورے، رہنمائی، ان کی شفقت اور حوصلہ افزائی میرے لئے نعمتِ غیر مترکہ سے کم نہ تھے۔

ایک روز میں م۔ش صاحب کے رپورٹنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور وہ اپنی کاپی لکھنے میں مصروف تھے کہ ایک لمبا تڑنگا سکھ نوجوان، دھوتی کرتے اور مخصوص پگڑی میں ملبوس، کالا چشمہ لگائے کمرے میں داخل ہوا اور زور سے "ست سری اکال" کا نعرہ لگاتے ہوئے میاں صاحب کے سامنے کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ میاں صاحب نے ایک

اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنی کاپی لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ سکھ نوجوان نے میز پر پڑے "پاکستان ٹائمز" کے تازہ پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی، لیکن ایک دومنٹ بعد اخبار ایک طرف رکھ کر پنجابی میں میاں صاحب سے مخاطب ہوا۔

"میاں جی! تواڈے پنڈ پروہنیاں نوچاہ پانی پچھن دا رواج نہیں اے؟"

(میاں جی! کیا آپ کے گاؤں میں مہمانوں کو چائے پانی پوچھنے کا رواج نہیں ہے؟)

اب میاں صاحب نے قلم روک کر اس نوجوان کی طرف ذرا غور سے دیکھا......

اور پھر اچھل کر اپنی بانہوں کے جپھے میں لے لیا۔ "اوئے غنی توں ایہہ کی حلیہ بنایا ہوا اے۔ توں کتے بہروپیاں دا کم سے نہیں شروع کر دتا؟" دونوں کچھ دیر بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے رہے۔ پھر میاں صاحب نے سامنے پڑی چینک میں سے خالی کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے اسے کہا۔ "لے توں دومنٹ چاہ پی تے میں دو تین لائناں ہور گھسیٹ لواں۔ پھر گپ شپ لگاندے آں"۔ چنانچہ میاں صاحب پھر قلم گھسنے میں مصروف ہو گئے۔ میں چائے پی چکا تھا۔ جب میاں صاحب اپنی کاپی کمپوزنگ کے لئے دینے کو اُٹھے تو میں بھی اجازت لے کر ان کے دفتر سے نکل آیا۔ میں ان کی بات چیت اور گپ شپ میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن ایک بات میرے ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی کہ میاں صاحب نے سکھ نوجوان کو "غنی" کہہ کر کیوں مخاطب کیا تھا؟ وہ نوجوان مسلمان تھا جو ایک سکھ کا بہروپ اختیار کیے ہوئے تھا۔ یہ کیا راز تھا؟ لہٰذا میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگلی ملاقات میں میاں صاحب سے اس راز سے پردہ اُٹھانے کی درخواست کروں گا۔

"اگلی دفعہ میں لائل پور سے لاہور آیا اور میاں صاحب سے ملنے "پاکستان ٹائمز" کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میاں صاحب کو زیڈ اے سلہری صاحب "ڈان" کراچی میں لے گئے ہیں اور پھر کافی عرصہ تک میاں صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اکتوبر 1958ء میں پاکستانی مسلح افواج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے ملک میں سیاسی حکومت کی بساط لپیٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا اور اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لی۔ حکومت نے صحافیوں اور صحافت پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیں۔ ملک میں

پہلی دفعہ ''لفافہ جرنلزم'' کا آغاز ہوا۔ صحافیوں کے ضمیر کے سودے ہونے لگے۔ اس سے ابن الوقت، ضمیر فروش، چڑھتے سورج کے پجاری صحافیوں کی ایک نئی فصل پیدا ہونے لگی۔ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے اور آزادانہ اظہار خیال کرنے والے صحافیوں کا مختلف حیلوں بہانوں سے گلا گھونٹا جانے لگا۔ اخبارات پر سنسر شپ نے بہت سے آزاد اخبارات کا خاتمہ کر دیا۔ باضمیر صحافی اپنی روزی روٹی کے لئے صحافت کو خیر باد کہہ کر روزگار کے دوسرے ذرائع تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

انہی دنوں لائل پور کے ایک خوبصورت ماہانہ رسالے ''شعاع حرم'' جس کا میں ڈپٹی ایڈیٹر بھی تھا، میں میری ایک نظم شائع ہوئی۔ جسے خلاف قانون قرار دے کر رسالہ پریس میں ہی ضبط کر لیا گیا اور ڈیکلریشن منسوخ کر کے پرچے کی آئندہ اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی اور ''شاعر'' کی مارشل لاء کورٹ میں پیشی کے لئے وارنٹ جاری کر دیئے گئے اور اس کے گھر چھاپہ مار کر اس کی تمام کتب فائلیں، اخبارات و رسائل کا ریکارڈ ضبط کر لیا گیا۔ مارشل لاء حکومت نظم کے کسی شعر یا بند کی بناء پر شاعر کو کوئی سزا تو نہ دے سکی، لیکن اس کے ضمیر پر اتنے کچوکے لگائے کہ وہ شاعری اور صحافت کو خیر باد کہہ کر روزگار کے متبادل ذرائع تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مقدمے کے دوران شاعر کو حکومت کی طرف سے کئی قسم کی پُرکشش مراعات، سرکاری نوکری اور سرکاری مطبوعات کی ادارت کی پیشکش کی جاتی رہی، لیکن شاعر نے ضمیر کا سودا کرنے سے انکار کر دیا۔

چنانچہ سال 1959ء میں میں لائل پور سے روزی روٹی کی تلاش اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لاہور آ گیا۔ شعبۂ اکاؤنٹس کی تربیت لائل پور میں ہی حاصل کر چکا تھا، لہٰذا لاہور آتے ہی ایک بڑی کمپنی میں اکاؤنٹس اسسٹنٹ کی جاب مل گئی اور کمپنی کا دفتر بھی مال روڈ پر اسی بلڈنگ میں تھا جہاں سے اپنے وقت کا مشہور انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' شائع ہوتا تھا۔ جلد ہی اخبار کے بہت سے صحافی دوستوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں، اسی دوران یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جناب میاں محمد شفیع (م۔ش) صاحب صاحب اسی اخبار سے وابستہ ہیں اور چیف رپورٹر ہیں۔ چنانچہ اب میاں صاحب سے

باقاعدگی سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

میاں محمد شفیع (م۔ش) قبل ازیں مغربی پنجاب کی پہلی لجسلیٹو اسمبلی کے اوکاڑہ سے ممبر منتخب ہو کر مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے سیکرٹری کے فرائض بھی ادا کر چکے تھے اور پنجاب اسمبلی میں میاں عبدالباری (لائل پور) سے مل کر حزبِ اختلاف کی بنیاد رکھنے کا اعزاز حاصل کر چکے تھے۔ م۔ش صاحب شروع ہی سے وڈیرہ شاہی جاگیرداری اور سرداری نظام کے سخت مخالف تھے، جبکہ اسمبلی ممبران کی اکثریت اسی طبقے پر مشتمل تھی اور وزیراعلیٰ پنجاب میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اس طبقے کے سرخیل تھے۔ وزیراعلیٰ اور ان کے وڈیرے اور جاگیردار ہمنوا م۔ش صاحب کی تندوتیز تقاریر، بیانات اور اخبارات میں ان کے مضامین سے اس قدر تنگ آچکے تھے کہ اکثر اسمبلی ہال سے م۔ش صاحب کو ڈولی ڈنڈا بنا کر باہر پھینکوادیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس دور کے اخبارات میں اسمبلی کی کارروائی کی ''جھلکیاں'' اکثر اسمبلی میں م۔ش صاحب کی طرف سے چھوڑی ہوئی پھلجڑیوں، لطیفوں، میاں دولتانہ کے اڑائے گئے تمسخر اور جاگیرداروں کے لئے گئے لتوں پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ میاں صاحب اپنی شعلہ بیانی کا لوہا منوا کر شہرتِ دوام حاصل کر چکے تھے۔

میاں محمد شفیع (م۔ش) انتہائی نڈر اور دبنگ مقرر تھے، وہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ان رہنماؤں میں شامل تھے جن میں حمید نظامی، عبدالستار خاں نیازی اور آفتاب قرشی جیسے بے باک اور جی دار لوگ شامل تھے اور جنہیں براہِ راست حضرت قائداعظم محمد علی جناح تک رسائی حاصل تھی۔ (قائداعظمؒ کے ساتھ حمید نظامی اور م۔ش مرحومین کی ایک بڑی تصویر آج بھی نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کی گیلری میں آویزاں ہے)۔

ایک شام میں دفتر سے چھٹی کر کے مال روڈ پر نکلا تو سامنے فٹ پاتھ پر چند سکھ جاتے ہوئے نظر آئے۔ میرے دماغ میں ایک دم شعلہ سا لپکا اور کئی سال پہلے ''پاکستان ٹائمز'' کے دفتر میں م۔ش صاحب سے ملنے آنے والے نوجوان سکھ کا خاکہ ابھر آیا جسے میاں صاحب نے ''اوئے غنی'' کہہ کر جپھا مارا تھا۔ میں نے اسی وقت ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے رپورٹنگ روم میں جا کر میاں صاحب کا پتہ کیا لیکن وہ اس دن مجھے نہ مل سکے۔ میری

رہائش ان دنوں پرانی انارکلی کے علاقے دھوبی منڈی میں تھی، لہٰذا میں دفتر سے چہل قدمی کرتا ہوا پیدل گھر کی طرف آ رہا تھا کہ وائی۔ایم،سی،اے (YMCA) بلڈنگ کے سامنے مال روڈ کے فٹ پاتھ پر مجھے میاں صاحب نظر آ گئے۔ وہ وہاں کسی پریس کانفرنس کی کوریج کر کے نکلے تھے اور فٹ پاتھ پر ممتاز احمد خاں مرحوم سے محوِ گفتگو تھے۔ ممتاز احمد خاں معروف صحافی، پاک چائنا فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کے صدر اور ایبٹ روڈ پر لکشمی چوک کے قریب واقع "پاکستان پرنٹنگ ورکس" میں میاں صاحب کے شراکت دار بھی تھے۔ ان کی رہائش گاہ لارنس روڈ اور ایوانِ تجارت کے سنگم پر، "چائنا چوک" میں آج بھی موجود ہے۔

جب دونوں دوستوں کی گفتگو ختم ہو گئی اور وہ مخالف سمتوں میں چل پڑے تو میں نے آگے بڑھ کر میاں صاحب کو سلام کیا اور گزارش کی کہ "میں چند منٹ ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ وائی، ایم، سی، اے ریسٹورنٹ میں ایک کپ چائے پی لیں"۔ میاں صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت کر لی کہ انہوں نے پریس کانفرنس کی کاپی "کمیٹ" کرنی ہے، لہٰذا کل گپ شپ لگا لیں گے۔ چنانچہ وہ پیدل ہی ریگل چوک کی طرف اور میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلے روز چھٹی کے بعد میں میاں صاحب کی تلاش میں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کی طرف جانے لگا تو میاں صاحب دفتر کے باہر سائیکل سٹینڈ پر "ٹوکن بوائے" کے ساتھ گپ شپ لگاتے نظر آ گئے۔ میں قریب پہنچا تو میاں صاحب اپنی سائیکل لڑکے کے حوالے کر کے تیزی سے میری طرف آئے اور سلام دعا اور مصافحہ کرنے کے بعد خود ہی فرمانے لگے۔ "آؤ میاں طاہر آؤ۔ میں ذرا دفتر میں حاضری کے رجسٹر میں انگوٹھا لگا کر ڈپٹی ایڈیٹر کو اپنی رونمائی کرا کے ابھی آتا ہوں۔ پھر "گارڈینیا" میں چل کر چائے پیتے اور گپ شپ لگاتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اپنے دفتر کی طرف چلے گئے اور میں باہر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر آ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں میاں صاحب ایک لمبے تڑنگے انگریز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دفتر سے نکلے۔ گورا کچھ دیر میاں صاحب سے فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے کسی بات پر بحث کرتا رہا۔ پھر ہاتھ ملا کر چیرنگ کراس کی طرف چلا گیا

اور میاں صاحب میرا بازو پکڑ کر "گارڈینیا ریسٹورنٹ" کی بڑھتے ہوئے بتانے لگے۔ "یہ گورا تقسیم ہند پر مشہور کتاب "The Great Divide" کا مصنف ہے اور آج کل اسی موضوع پر کسی دوسری کتاب کے مسودے پر کام کر رہا ہے اور فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ میرا تفصیلی انٹرویو کرنا اور تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں میرے خیالات جاننا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کل پر ٹرخا دیا ہے"۔

"گارڈینیا" میں چائے پیتے ہوئے میں نے میاں صاحب کو چند سال پہلے "پاکستان ٹائمز" کے دفتر میں ایک سکھ نوجوان سے ملاقات کا واقعہ یاد دلایا۔ جسے انہوں نے اوئے غنی اتوں کی بہروپ بھریا ہویا اے" کہہ کر جھاڑ الا تھا۔

میاں صاحب اچانک اداس ہو گئے اور خلاء میں گھورنے لگے۔ پھر کچھ توقف کے بعد بتانے لگے۔

"میرے ذہن کے کباڑ خانے میں بے شمار اور ان گنت تصاویر گڈمڈ موجود ہیں۔ ان میں میرے محلے کی جیوی جھیوری سے لے کر، جس کی بھٹی کے بھنے ہوئے چنوں کی سوندھی خوشبو آج بھی دماغ میں بسی ہے، ایوا گارڈنر تک، جس کے حسن و جمال کو "بھوانی جنکشن" نامی فلم کی لاہور میں شوٹنگ کے دوران قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، کی تصویریں شامل ہیں، ایک تصویر ہزارہ کے اس لمبے تڑنگے پٹھان چوکیدار کی ہے، جو مالا بار ہل پر قائداعظم کی کوٹھی میں اپنی سفید وردی میں ملبوس ڈنڈا ہاتھ میں لے کر پہرہ داری کے فرائض ادا کرنے پر مامور تھا۔ ایک اور تصویر رحمان گوجر کی ہے جو "جاوید منزل" میں علامہ اقبال کا حقہ تازہ رکھنے اور چلم بھرنے کی خدمت پر مامور تھا۔ میں نے کئی بار ان تصاویر کو اپنے دماغ کے کباڑ خانے سے نکال کر انہیں صفحۂ قرطاس پر سجانے کا سوچا ہے، لیکن میری بے معنی مصروفیات نے ہنوز مجھے اس پر سنجیدگی سے متوجہ ہونے سے باز رکھا ہے"۔

"ایک بھولی بسری تصویر جو کئی دنوں سے میری چشمِ تصور میں گھوم رہی ہے۔ وہ ایک متوسط طبقے کے دُبلے پتلے منس مکھ نوجوان غنی کی ہے۔ جو سول لائنز مسلم لیگ کی سیاسیات میں شیخ رشید گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ غنی اپنی مسکراتی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے

شیخ رشید گروپ کی خبریں چھپوانے کے لئے باقاعدگی سے ملاقات کے لئے پاکستان ٹائمز کے دفتر آیا کرتا تھا۔ وہ بلا کا سگریٹ نوش تھا۔ میرے سمجھانے پر اس نے سگریٹ نوشی سے توبہ کرلی تھی اور وہ اس کا احسان بھی میری گردن پر ڈالا کرتا تھا''۔

''میاں صاحب! دیکھئے میں نے آپ کے کہنے سے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔ آپ آج کوشش کرکے شیخ رشید صاحب کی خبر دو کالمی سرخی سے لگوادیں''۔ میں اس کی تالیف قلب کے لئے سب ایڈیٹروں سے مل کر اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا تھا۔ یہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کا زمانہ تھا''۔

''پھر غنی یکا یک لاہور اور میرے ذہن سے غائب ہوگیا۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ غنی نام کا کوئی سیاسی کارکن بھی تھا۔ غنی حرفِ غلط کی طرح میرے ذہن کے پردے سے محو ہو چکا تھا۔ ایک شام میں اپنی کاپی لکھنے میں مصروف تھا کہ ایک جواں سال آدمی داڑھی اور کیسوں کے ساتھ سکھوں کی مخصوص پگڑی میں ملبوس ''ست سری اکال'' بلا کر میرے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ میں نے اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر قلم کی گھس گھس میں مصروف ہوگیا۔ پنجاب کی تقسیم کے بعد تمام ہندو اور سکھ لاہور سے بھارت چلے گئے تھے، لیکن کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے میاں افتخارالدین کی اسٹیٹ کے بعض سکھ مزارعین کبھی کبھار ''پاکستان ٹائمز'' کے دفتر آجایا کرتے تھے (میاں افتخارالدین دونوں اخبارات ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کے مالک تھے) میں نے نووارد کو اسی قسم کی کوئی سوغات سمجھ کر اس سے تعرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں۔ جب میں اپنی کاپی لکھ چکا تو نووارد نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے مخاطب کرکے کہا۔ ''میاں شفیع صاحب! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' اب میں نے اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور ''اوئے غنی'' کہہ کر چھاڈال لیا اور اس کی ہیئت کذائی پر تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ اس نے مجھے رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ وہ گزشتہ ایک سال سے سکھ بن کر مشرقی پنجاب میں مغویہ مسلم خواتین کی برآمدگی میں کام کررہا ہے۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کے بعض دردِ دل رکھنے والے کامریڈوں کے ساتھ مل کر مسلمان مغویہ عورتوں کے کھوج کا کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ

فلاں گاؤں میں فلاں سکھ کے گھر مسلمان مغویہ خاتون موجود ہے تو وہ اس کا پتہ لے کر مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ، جو پاکستان کی طرف سے مغویہ خواتین کی برآمدگی کی تنظیم کی سربراہ تھیں، رابطہ قائم کرتا تھا۔ پھر مس طوسی یا مس امینہ یا بیگم سلمیٰ تصدق حسین، جو جالندھر میں مغویہ خواتین کے کیمپ کی انچارج تھیں، پولیس گارڈ کے ساتھ مغویہ کو برآمد کر کے کیمپ میں لے آتی تھیں۔ اس نے اپنے تشخص کا راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ مس رابعہ قاری سمیت ہندوستان اور پاکستان کے حکام اسے کامریڈ امریک سنگھ کے نام سے ہی جانتے اور پہچانتے تھے۔ اس کی کامیابی کا راز بھی یہی تھا کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک سکھ بن گیا تھا۔ اس نے اس پردے میں امرتسر اور گردونواح سے بے شمار مظلوم مسلمان خواتین کو برآمد کر کے پاکستان ان کے ورثاء تک پہنچایا"۔

میں غنی کی کہانی سن کر عش عش کر اُٹھا۔ میں نے اسے تھاپی دیتے ہوئے کہا۔ "غنی جب تم آخری مغویہ کو برآمد کر کے آؤ گے تو میں تم پر ایک فیچر لکھوں گا اور تمہیں حکومت سے قرار واقعی انعام دلاؤں گا"۔ غنی نے مجھ سے قرآن پاک کی قسم اُٹھوا کر وعدہ لیا کہ میں اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔ مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا کہ آپ نے مجھے سگریٹ نوشی کی لعنت سے نجات دلائی تھی۔ میں صرف شکل صورت سے ہی نہیں بلکہ عادات واطوار سے بھی مکمل سکھ بن چکا ہوں"۔

"پھر میں نے "پاکستان ٹائمز" چھوڑ دیا اور "ڈان" کراچی سے منسلک ہو گیا۔ ایک بار پھر غنی میرے دل و دماغ سے محو ہو گیا۔ مجھے اس آخری ملاقات کے بعد غنی کی سرگرمیوں کی کوئی خبر نہیں۔ آج آپ نے یاد دلایا تو اس کی دھندلی سی تصویر میرے دماغ کے نہاں خانے میں اُبھر آئی ہے، شاید شیخ رشید، مس رابعہ قاری یا بیگم سلمیٰ تصدق حسین اس کے بارے میں بہتر جانتے ہوں گے"۔ یہ کہہ کر میاں صاحب خاموش ہو گئے اور میرے دل میں غنی کے بارے میں مزید جاننے کا اشتیاق دوچند ہو گیا۔

شیخ رشید صاحب ان دنوں اچھرہ موڑ کے نزدیک پانی والی ٹنکی کے پاس رہتے تھے اور میں نے بھی اسی طرف، اچھرہ اور رحمان پورہ کے درمیان "دوہٹہ کھوہ" پر ایک کنال

سے زائد زمین خرید کر نیا نیا گھر بنایا تھا۔ اس لئے اکثر آتے جاتے شیخ صاحب سے دعا سلام ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی وکالت کا دفتر بھی گھر کی بیٹھک میں ہی بنا رکھا تھا۔ وہ ان دنوں میجر (ر) اسحٰق کی "کسان تحریک" سے وابستہ ہو چکے تھے اور اپنے سوشل خیالات اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر کافی معروف تھے اور ان کے پاس ہر وقت مخلص کارکنوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ صبح کی ہوا خوری کے لئے "دوہٹہ کھوہ" کی طرف نکل آیا کرتے تھے تو والد صاحب کے پاس بیٹھ کر حقے کے چند کش بھی لگا لیا کرتے تھے۔ اتوار کے روز تو باقاعدہ ان کی والدہ صاحب کے ساتھ بیٹھک رہتی تھی۔ وہ "دوہٹہ کالونی" کی نئی آبادی کو اپنے حلقۂ انتخاب کا اہم مرکز خیال کرتے تھے۔ بعد میں 1970ء کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور والد مرحوم کی کوششوں سے اس حلقے سے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی اور مرکزی حکومت میں بھٹو صاحب نے انہیں وزیر صحت بنایا، وزیر بننے کے بعد والد صاحب کی الیکشن میں خدمات کا اعتراف اور شکریہ ادا کرنے وہ ہمارے گھر تشریف لائے اور "دوہٹہ کالونی" کی مرکزی سڑک کو والد صاحب کے نام پر "محمد علی روڈ" کے نام سے منسوب کیا۔ اسی دور میں جب سنٹرل جیل کو موجودہ "شادمان کالونی" سے کوٹ لکھپت منتقل کر دیا گیا اور پلاٹوں کی بندربانٹ کی گئی تو شیخ صاحب بھی اچھرہ سے شادمان شفٹ ہو گئے۔ انہوں نے والد صاحب کو بھی ایک کنال کے پلاٹ کا الاٹمنٹ لیٹر لا کر دیا جسے والد صاحب نے بوجوہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں غنی کے بارے میں مزید جاننے کے لئے مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ، جن کے بھائی مسٹر افضل قاری ایڈووکیٹ میرے دوست تھے، سے ملا۔ مس قاری نے غنی کے بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "ہم نے غنی کو رازداری کا حلف دے رکھا ہے۔ اس لئے معذرت!" پھر میں انسپکٹر آف سکولز مس طوسی اور بیگم امینہ (ممسن) صاحبہ سے بھی ملا، لیکن انہوں نے بھی معذرت کر لی۔ اب میری آخری امید بیگم سلمٰی تصدق حسین اور شیخ رشید احمد تھے۔

پہلے میں بیگم سلمٰی تصدیق حسین صاحبہ سے ملا۔ تحریکِ پاکستان میں مسلم خواتین کو متحرک کرنے میں بیگم صاحبہ کا کردار تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ انہوں نے نہ صرف پنجاب میں مسلم خواتین میں بیداری کی لہر پیدا کی بلکہ قائداعظمؒ کے حکم پر صوبہ سرحد جا کر رجعت پسند پٹھان پردہ دار خواتین کو ریفرنڈم کے دوران شعلۂ جوالا بنا دیا اور وہاں سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی کانگرسی وزارت کو ریفرنڈم میں عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ کانگرس اپنی حکومت ہونے کے باوجود مسلم لیگ کے 289244 ووٹوں کے مقابلے میں صرف 2874 ووٹ حاصل کر سکی۔

بیگم صاحبہ مغویہ خواتین کی بازیابی کی کمیٹی کی رکن تھیں اور اس سلسلے میں وہ بار بار بھارت جاتی رہتی تھیں۔ جب میں نے ان سے امریک سنگھ کے بارے میں سوال کیا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد فرمانے لگیں۔ ''میں نے سب سے پہلے کامریڈ امریک سنگھ کا نام جالندھر کیمپ برائے مغویہ خواتین کی انچارج فاطمہ بیگم، مسز شمیم جالندھری اور مس رابعہ قاری سے کیمپ کے دورے کے دوران سنا تھا۔ وہ سب خواتین کامریڈ امریک سنگھ کی مہیا کردہ سو فیصد درست اطلاعات، مغویہ خواتین کی نشاندہی اور برآمدگی میں تعاون پر اس سکھ نوجوان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ اس کی کوششوں سے بے شمار مسلم خواتین بازیاب کرائی جا چکی تھیں۔ یہ تو بہت بعد میں، غالباً 1958ء میں مجھے معلوم ہوا کہ کامریڈ امریک سنگھ دراصل مسلم لیگ کا وہ پھرتیلا انس کھ اور ہم وقت متحرک اور چھلاوے کی طرح اپنی سائیکل پر ہر اس کیمپ میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ جہاں اس کی ضرورت ہوتی تھیں۔ یہ دُبلا پتلا نوجوان کبھی ریلیف کیمپ میں ڈیوٹی دے رہا ہوتا تھا کبھی سٹیشن پر آنے والی گاڑیوں سے زخمیوں اور بچوں کو ہسپتال پہنچا رہا ہوتا تھا۔ جب کبھی اسے کچھ وقت ملتا تو کچھ دیر آرام کے لئے میری کوٹھی پر آ جاتا تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ نئی سے نئی اطلاعات ہوتی تھیں۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ''کامریڈ'' کا لاحقہ لگانا پسند کرتا تھا اور تمام ورکر اسے کامریڈ غنی کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔

ایک شام وہ ایک ہندو لڑکے کو پکڑ کر میرے پاس لایا اور کہنے لگا۔ ''آپا جی اس

لڑکے کے پاس بہت کارآمد معلومات ہیں۔ آپ ذرا اس کی بات سن لیں''۔ یہ کہہ کر لڑکے کو جس کی عمر کوئی 20,18 سال تھی، میرے سامنے کھڑا کر کے خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ لڑکا بہت گھبرایا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور پانی پلایا۔ جب اس کے حواس ذرا درست ہوئے تو کہنے لگا۔'' ماں جی! آج رات آپ کے گھر پر سکھ حملہ آور ہوں گے۔ آپ گھر پر نہ سوئیں''۔ پھر اس نے چار پانچ ایسی جگہوں کے بارے میں بتایا جہاں ہندوؤں، سکھوں نے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے اسلحہ کا ذخیرہ کر رکھا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہماری کوٹھی کے قریب ہی ایک سکھ ریاست کے مہاراجہ نے اپنی محل نما کوٹھی میں گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ میں نے لڑکے کو اپنے مسلم لیگی ورکروں کے حوالے کر کے ہدایت کی کہ اس کی نگرانی کی جائے، لیکن اسے کسی قسم کا گزند نہ پہنچایا جائے اور خود فون کر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ان جگہوں کی تلاش لینے کی درخواست کی جن کی نشاندہی ہندو لڑکے نے کی تھی۔ واقعی ہر جگہ سے اسلحے کا بھاری ذخیرہ برآمد ہوا۔ جب سکھ مہاراجہ کے محل پر پولیس چھاپے کی تیاری کر رہی تھی کہ کسی طرح سکھوں کو مخبری ہو گئی اور انہوں نے گولہ بارود کو آگ لگا دی۔ دھماکے پورے لاہور میں سنے گئے، اس طرح ایک ہندو لڑکے کی اطلاع پر لاہور بہت بڑی تباہی سے بچ گیا۔

اس رات ہم اپنی کوٹھی میں نہیں سوئے۔ آدھی رات کے وقت دو تین جیپوں میں سکھ حملہ آور ہوئے، لیکن گھر میں ہمیں موجود نہ پا کر نوکروں کو ڈرا دھما کر مایوس واپس چلے گئے۔ مسلم لیگ کے لئے میری خدمات اور تحریک پاکستان میں میری سرگرمیوں کی وجہ سے ہندو سکھ میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

میرا گھر مہاجرین کے لئے ریلیف کمیٹی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مسلم لیگی ورکر لڑکے اور لڑکیاں سامانِ خورد و نوش کپڑا لتا لے کر ریلوے سٹیشن اور کیمپوں میں پہنچتے تھے اور لٹے پٹے

مہاجرین کی خدمت میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تقسیم کے اعلان سے ایک ماہ پہلے شیخوپورہ کا ایک 26,25 سالہ سکھ نوجوان میرے پاس آیا اور مسلمان ہونے کی خواہش کا اظہار کیا، بشرطیکہ اس کے جان و مال اور شیخوپورہ میں اس کے گھر بار اور جائیداد کی حفاظت کی ضمانت دی جائے۔ اس روز شدید گرمی اور حبس کا موسم تھا۔ میں نے اپنے چند ورکرز کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اس نوجوان کو حفاظت کے ساتھ شاہی مسجد کے امام صاحب کے پاس لے جائیں تاکہ اسے حلقہ بگوش اسلام کر لیا جائے۔ ان ورکروں میں کامریڈ غنی بھی شامل تھا۔ امام صاحب نے لڑکے کو مشرف بہ اسلام کر کے کیس کٹوا کر شرعی داڑھی سے مزین کر دیا اور اس کا اسلامی نام ذوالفقار علی رکھ کر اسے دھوتی کرتے کی جگہ سفید کرتا پاجامہ بھی اپنے پاس سے پہنایا۔ امریڈ غنی اتنا خوش ہوا کہ ذوالفقار کو اپنا بھائی بنا لیا اور اپنی سائیکل بھی اسے دے دی کہ اسے شیخوپورہ اپنے گھر جانے میں آسانی رہے۔

ایک ہفتہ بعد ذوالفقار میرے پاس دوبارہ آیا تو میں نے اسے نئے حلیے میں بالکل نہیں پہچانا۔ کامریڈ غنی بھی اس کے ساتھ تھا جس نے مجھے بتایا کہ یہ وہی سکھ لڑکا ہے جسے آپ نے ہماری معیت میں شاہی مسجد کے امام صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ اب یہ آپ کو سلام کرنے اور آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی، ذوالفقار کہنے لگا کہ وہ یہ معلوم کرنے شیخوپورہ جانا چاہتا ہے کہ اس کے والدین اور بیوی بچے بھارت چلے گئے ہیں یا نہیں، لیکن اس کے پاس خرچہ نہیں ہے۔ میں نے اسی وقت اسے پچاس روپے دیئے (جو اس وقت بہت بڑی رقم تھی) نیز ڈی۔ سی شیخوپورہ کے نام چٹھی بھی دی کہ اس کے مال اسباب اور جائیداد کی حفاظت کی جائے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ بھارت سے لٹے پٹے مہاجرین کی آمد کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ریلیف کا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ مجھے چند گھنٹے آرام کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ یہی حال باقی مسلم لیگی ورکرز کا تھا۔ ایک روز ریلوے سٹیشن پر کٹے پھٹے مہاجرین کی ایک ٹرین

آئی۔ مسلم لیگی ورکر میری نگرانی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے ہسپتال بھجوانے میں مصروف تھے کہ کامریڈ غنی میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں بے آرامی اور مسلسل جگراتے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''آپا جی! ذوالفقار غدار ہے''۔ میں کچھ نہ سمجھی۔ ''کون ذوالفقار؟''

''وہی سکھ لڑکا جسے آپ نے مسلمان کرایا تھا اور شیخوپورہ جانے کے لئے پیسے بھی دیئے تھے''۔

''وہ شیخوپورہ نہیں گیا۔ یہیں موجود ہے۔ رات کو مختلف گردواروں میں جاتا ہے اور سکھ لیڈروں کو ہماری خبریں پہنچاتا ہے۔ آپ کے گھر یہ حملہ بھی اسی کی سازش سے ہوا تھا''۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔

چند روز میں اس بات کی تصدیق کچھ اور ذرائع سے بھی ہو گئی۔ پھر پتہ چلا کہ کسی مسلم لیگی ورکر نے ذوالفقار کا ''بستر گول'' کر دیا ہے۔ کس نے کیا؟ کچھ پتہ نہ چل سکا...... اور اس کے بعد کامریڈ غنی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا''۔ اتنا کہہ کر بیگم صاحبہ خلاؤں میں گھورنے لگیں اور میں اجازت لے کر گھر آ گیا۔

یہاں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ بیگم سلمٰی تصدق حسین (مرحومہ) کے اکلوتے صاحبزادے میاں اسلم ریاض حسین ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے جج اور پاکستان کے چیف جسٹس بنے۔

بیگم سلمٰی تصدق حسین کے اندازے کے مطابق بھارت میں اغوا شدہ مسلم خواتین کی تعداد 90 ہزار تھی اور ان میں سے 40 ہزار بدقسمت خواتین صرف ریاست پٹیالہ میں اغوا کی گئی تھیں، جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان میں رہ جانے والی ہندو سکھ عورتوں کی تعداد کسی صورت بھی 26,25 ہزار سے زائد نہ تھی۔ پاکستان کی حکومت پولیس، مسلم لیگی ورکرز اور پٹواریوں، نمبرداروں کے ذریعے ہر گاؤں، قصبے یا شہر سے غیر

مسلم خواتین کو برآمد کر کے بھارت کے حوالے کر رہی تھی، کیونکہ ہمارا مذہب خواتین اور بچوں، بوڑھوں اور نہتے بے گناہ انسانوں پر ظلم و جبر کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اس کے مقابلے میں بھارتی حکومت اغوا شدہ مسلمان خواتین کی بازیابی میں قطعاً دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بھارتی حکومت نے اس مقصد کے لئے جو کمیٹی قائم کر رکھی تھی اس کے سربراہ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور ممبر مہاراجہ پٹیالہ جیسے متعصب اور مسلم دشمن افراد کو بنا رکھا تھا جو یہ ماننے کو ہی تیار نہ تھے کہ بھارت میں چند سو سے زائد اغوا شدہ مسلمان خواتین موجود ہیں۔ پٹیل کا اصرار تھا کہ "بھارت میں کوئی مسلمان مغویہ لڑکی ہے ہی نہیں اور اگرچہ کچھ ہیں بھی تو "اپنی مرضی" سے اغوا ہوئی ہیں۔ جبراً اغوا ہونے والی لڑکیوں کی تعداد کسی صورت بھی دو چار سو سے زیادہ نہیں"۔

میں شیخ رشید احمد صاحب سے کامریڈ امریک سنگھ کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین صاحبہ سے ملنے کے بعد جب میں اس سلسلے میں شیخ صاحب سے ملا تو وہ کامریڈ امریک سنگھ کا نام سنتے ہی بے حد اداس ہو گئے۔ بات شروع کرنے سے پہلے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ وہ بتانے لگے۔ "غنی میرا جاں نثار ورکر تھا۔ وہ انتہائی دلیر، نڈر اور خطرات سے ٹکرا جان والا انسان تھا۔ جب اس نے مسلم خواتین کی بازیابی کے مشن پر بھارت جانے کا فیصلہ کیا تو وہ امرتسر کے ایک دو پرانے کمیونسٹ ساتھیوں کو اپنا ہم خیال بنا چکا تھا اور انہی کے مشورے سے اس نے اپنا سکھوں والا بہروپ اختیار کیا تھا۔ نوجوان سکھ کامریڈوں نے اس سے بہت تعاون کیا۔ پہلے چھ ماہ کے اندر اس نے امرتسر، جالندھر، کپورتھلہ اور گردونواح سے کوئی پانچ سو سے زائد مسلم دوشیزائیں بازیاب کرائیں۔ اس دوران وہ دو بار خفیہ طور پر لاہور بھی آیا اور مجھ سے بھی ملا۔ آخری بار اس نے بتایا کہ اب وہ پٹیالہ جا رہا ہے، کیونکہ سب سے زیادہ اغوا شدہ مسلم لڑکیاں وہاں موجود ہیں اور وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی انہیں بازیاب کرائے گا۔

بعد میں اس کی شہادت کے بہت عرصہ بعد ایک سکھ کامریڈ دوست سے جو تفصیل مجھے ملی اس کے مطابق وہ پٹیالہ کے ضلع نارنول میں ایک سکھ پٹواری کے پاس بطور "بستہ بردار" نوکر ہو گیا تھا۔ اس طرح اسے پٹواری کے ساتھ گاؤں گاؤں گھومنے کا موقع ملنے لگا۔ جہاں کہیں اسے کسی مسلم خاتون کا پتہ چلتا وہ اپنے خفیہ ذرائع سے جالندھر کیمپ میں مس رابعہ قاری تک خبر پہنچا دیتا اور لڑکی برآمد کر لی جاتی۔ ایک دفعہ اس نے مہاراجہ کے فیل خانے میں پانچ سو اغوا شدہ لڑکیوں کی موجودگی کی اطلاع دی، لیکن بھارتی حکومت اور پولیس نے مہاراجہ کے فیل خانہ پر چھاپہ مارنے سے انکار کر دیا اور مہاراجہ صاف مکر گیا کہ اس کے فیل خانے میں کوئی مغویہ خاتون موجود ہے، لیکن اطلاع سو فیصدی درست تھی، جس سے پٹیالہ کی انتظامیہ اور خود مہاراجہ بہت پریشان ہوئے۔ لڑکیوں کی فوری طور پر فیل خانہ سے قلعہ بہادر گڑھ اور دوسرے مقامات پر منتقل کر دیا گیا۔ تقریباً ایک سو لڑکیوں کو کھٹمنڈو اور نیپال بذریعہ ٹرک سمگل کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ ٹرک راستے میں پکڑا گیا اور تمام لڑکیوں کو بازیاب کر کے جالندھر کیمپ اور وہاں سے پاکستان پہنچا دیا گیا۔ ان بدقسمت لڑکیوں میں سے بہت سی سکھ بچوں کی مائیں بن چکی تھیں اور بہت سی حاملہ تھیں۔ وہ کسی قیمت پر بھی پاکستان آنے، اپنے والدین، بہن بھائیوں، رشتہ داروں کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھیں، کیونکہ وہ اپنی عزت و آبرو لٹا چکی تھیں اور خوفزدہ تھیں کہ ان کے والدین اور بہن بھائی انہیں پاکستان میں قبول بھی کریں گے یا نہیں۔ جالندھر کیمپ اور بعد ازاں پاکستان لا کر ان کی تالیفِ قلب کی گئی اور انہیں سمجھایا گیا کہ وہ تو مظلوم اور ستم رسیدہ ہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تو زور زبردستی اور ان کی بدقسمتی کا نتیجہ تھا۔ حالات کا جبر تھا، اس میں ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو بے بس اور مجبور تھیں۔

ٹرک والی سو لڑکیاں پکڑے جانے پر مہاراجہ پٹیالہ کی بہت سبکی ہوئی۔ وہ خود مسلم مغویہ خواتین کی بازیابی کی ذمہ دار کمیٹی کا ذمہ دار رکن تھا اور اس کے اپنے علاقے سے بیک

وقت اتنی لڑکیوں کا بازیاب ہونا اس کے لئے بڑی ندامت اور شرمندگی کا باعث تھا۔ چنانچہ "مخبر" کی تلاش کے لئے بھارت کی تمام خفیہ ایجنسیاں، سی، آئی، ڈی اور پولیس سرگرم ہو گئیں۔ ان میں حکمران کانگرس پارٹی کے کارکن اور راشٹریہ سیوک سنگھ (RSS) کے مسلم دشمن غنڈے سب سے پیش پیش تھے۔

مغویہ خواتین کے بارے میں جالندھر کیمپ میں اطلاعات پہنچانے کے لئے کامریڈ امریک سنگھ کیمپ سے رابطہ قائم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ امرتسر اور جالندھر شہر میں موجود اپنے دو ہمراز کمیونسٹ کامریڈوں کے ذریعے پیغام رسانی کا کام لیتا تھا۔ جب پٹیالہ میں بیک وقت سولڑکیوں کی برآمدگی کی خبر پھیلی تو بھارت کے خفیہ اداروں نے جالندھر کیمپ میں آنے جانے والے والنٹرز اور ورکرز کی سخت نگرانی شروع کر دی۔ اس کے باوجود چھ ماہ تک وہ کامریڈ امریک سنگھ کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن ایک دن بدقسمتی سے کیمپ میں صفائی کے لئے آنے والی بھنگن کے پلو سے ایک رُقعہ پکڑا گیا، جسمیں اردو میں بہادر گڑھ قلعہ (پٹیالہ) میں مقید مسلم مغویہ خواتین بارے اطلاع دی گئی تھی۔ یہ بھنگن جالندھر کے اس کمیونسٹ کامریڈ کے گھر میں بھی کام کرتی تھی جو کامریڈ امریک سنگھ سے ملنے والی اطلاعات کیمپ میں مس رابعہ قاری تک پہنچایا کرتا تھا اور اس بھنگن کو کیمپ کی صفائی کی ڈیوٹی پر اس نے لگوایا تھا۔

جب "خفیہ" والوں نے بھنگن کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے بتا دیا کہ وہ تو چٹی اَن پڑھ ہے۔ اس کا "مالک" کبھی کبھار کوئی پرچی اس کے پلو سے باندھ دیا کرتا تھا اور کیمپ کی انچارج میم صاحب وہ پرچی میرے پلو سے کھول لیا کرتی تھی۔ وہ بالکل بے قصور ہے۔ بھنگن کی نشاندہی پر پولیس نے فوراً سکھ کامریڈ کو قابو کر لیا۔ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی جہاں سے کامریڈ امریک سنگھ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ پرچے پولیس کے ہاتھ لگ گئے، لیکن ان پر کامریڈ امریک سنگھ کا کوئی اتہ پتہ یا ایڈریس تو موجود نہیں تھا اور نہ ہی سکھ کامریڈ کو

امریک سنگھ کا ٹھکانہ معلوم تھا۔ پولیس نے سکھ کامریڈ پر بے پناہ بہیمانہ تھرڈ ڈگری تشدد کیا، لیکن وہ امریک سنگھ کے ایڈریس یا جائے رہائش بارے کوئی معلومات حاصل کر سکی۔

آخر پٹیالہ میں ایک خفیہ آپریشن کیا گیا اور امریک سنگھ نامی جتنے دس بارہ لوگ تھے، سب کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس طرح نارنول کے پٹواری کا "بستہ بردار" امریک سنگھ بھی دھر لیا گیا۔ تحقیقات کے دوران سب کی ننگا کر کے چھترول کی گئی۔ کامریڈ امریک سنگھ کو ننگا کرنے سے اس کی "مسلمانی" ظاہر ہو گئی۔ اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا، لیکن اس نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا۔ اسپر تشدد کا ہر حربہ آزمایا گیا۔ جب تشدد نا قابل برداشت ہو جاتا تو وہ اپنی زبان دانتوں کے درمیان دبالیتا تھا۔ ایک روز اس کی زبان کٹ کر منہ سے باہر گر گئی۔ جب کامریڈ امریک سنگھ بہیمانہ تشدد سے ادھ موا ہو گیا تو پولیس نے اسے آر۔ ایس۔ ایس کے غنڈوں کے حوالے کر دیا۔ ان ظالموں نے نیم بے ہوش کامریڈ امریک سنگھ کو ایک درخت کے ساتھ باندھ کر پہلے اس کے دونوں پاؤں کاٹے، پھر آنکھیں نکالیں، پھر اس کا سینہ چیر کر اور پیٹ چاک کر کے اس کا دل اور انتڑیاں نکالیں اور اس طرح عبدالغنی عرف کامریڈ امریک سنگھ اپنی ہزاروں بہنوں کی عزت و ناموس پر قربان ہو گیا۔" اب شیخ صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے"۔

خدا رحمت کند آں عاشقانِ پاک طینت را

......☆......

1947ء کی داستانِ خونچکاں

حصہ دوم

ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام

ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کا قتل عام

آج کل ہمارے حکمرانوں کا ایک خاص طبقہ مشرقی پنجاب کے حکمرانوں سے محبت و خیر سگالی کے نام پر پچھے ڈالنے میں بڑا سرگرم عمل ہے اور سرکاری، نیم سرکاری اور سرکاری سرپرستی میں غیر سرکاری وفود کی ادھر سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنیاں جانیاں زوروں پر ہیں۔ دونوں طرف ایک دوسرے کی بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ عیش و عشرت کے دیوانے اور پینے پلانے کے شوقین اپنی اپنی ترنگ میں آکر دونوں ملکوں کے درمیان 1947ء میں کھینچی گئی "لکیر" کو مٹانے کی باتیں کر رہے ہیں۔

یہ ہماری نئی نسل کے نمائندہ حکمران ہیں جنہوں نے نہ ہندوؤں سکھوں کی وحشت و بربریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور نہ ہی غالباً ان کے بزرگوں نے خون کے وہ دریا اسلام کی عصمتوں اور جان و مال کی وسیع پیمانے پر قربانیاں دے کر مملکت خداداد پاکستان تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ تحریک پاکستان میں ان حکمرانوں کے آباؤاجداد کا کوئی کردار نہ تھا۔

ہم نے اس مختصر مضمون میں صرف ایک سکھ ریاست "پٹیالہ" کے حکمران کے اپنی مسلم رعایا پر 1947ء میں ڈھائے گئے مظالم کی چند جھلکیاں اپنی نئی نسل کے لئے پیش کی ہیں ورنہ 1947ء کی خونی داستان پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

ہماری بوڑھی نسل، جواب ناپید ہوتی جا رہی ہے اور جنہوں نے اس ملک کے حصول کی جدوجہد میں عملاً حصہ لیا اور ہندوؤں اور سکھوں کی وحشت و بربریت کے مظاہرہ کو بچشم خود دیکھا، ان خونیں واقعات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کاش ہماری نئی نسل ہندوؤں

اور سکھوں سے خیر سگالی اور محبت کی پینگیں بڑھانے سے پہلے لاکھوں انسانوں کے اس خون کو، جس سے دونوں ملکوں کے درمیان کھینچی گئی "لکیر" کو سینچا گیا ہے، پیش نظر رکھے اور قومی عزت، ملی حمیت وغیرت اور حب الوطنی کے تقاضوں کو فراموش نہ کرے۔

ہندوؤں کے ایک مشہور محبت وطن اور انصاف پسند سوشل ورکر مسٹر دھنوتری جو سیاست میں حصہ لینے کی پاداش میں بار بار جیل یاترا بھی کر چکے تھے، اپنی کتاب "پنجاب کی خونی داستان" میں لکھتے ہیں۔

"جو کچھ پنجاب میں (1947ء میں) ہوا، اسے ہنگامہ یا فساد کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ یہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں اور مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی ایک منظم جنگ تھی۔ یہ جنگ اتنی خونریز تھی کہ اس کا مقابلہ کلکتہ، نواکھی اور بہار سے بھی نہیں کیا جاسکتا وہاں ان فسادات میں ایک فرقہ کے لوگوں نے دوسرے فرقہ کی اقلیت کو قتل اور تباہ کرنے میں حصہ لیا تھا لیکن پنجاب کی سرزمین پر انسانی خون کی زبردست ہولی کھیلنے والی، املاک و جائیداد کو تباہ و برباد کرنے والی، عورتوں کی عصمت دری کرنے والی ایک باقاعدہ تربیت یافتہ جماعت تھی جو ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح تھی۔ مشرقی پنجاب میں اکالیوں کے شہیدی دل ہندو مہاسبھا کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ موجود تھے۔ ان لوگوں نے پنجاب میں قیامت خیز مظالم ڈھائے۔ پولیس اور فوج نے نہ صرف ان کا ساتھ دیا بلکہ قیادت بھی کی۔ شری پرکاش نرائن کا اندازہ ہے کہ پنجاب میں ڈیڑھ لاکھ انسان ہلاک ہوئے۔ اس کشت و خون کا ذمہ دار پنجاب کا انگریز گورنر جینکنز تھا۔"

آگ اور خون کا یہ خوفناک ڈرامہ جس کی ابتداء، پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں نے کی تھی اگر سیاست تک ہی محدود رہتا تو شاید اتنا کشت و خون نہ ہوتا لیکن ہندو اور سکھ رہنماؤں نے اسے مذہبی رنگ دے کر سارے پنجاب میں تباہی مچادی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ آگ لگانے والا اور اس آگ کو بھڑکانے والا انگریز تھا۔ انگریز نے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد اسلام دشمنی کی جو قسم کھائی تھی وہ انگریز کے ہندوستان چھوڑنے تک نہ ٹوٹی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پنجاب میں جس بربریت کا

مظاہرہ کیا۔اس پر پنڈت نہرو کو بھی کہنا پڑا ''مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور سکھ پاگل ہو گئے ہیں۔''

اکالی دل شہیدی جتھوں کے لئے سکھ ریاستوں سے آتشیں اسلحہ برابر آ رہا تھا اور ریاستی افواج کے افسر سکھوں کو ہتھیار استعمال کرنا بھی سکھاتے تھے اور ان کی قیادت بھی کرتے تھے اور لاہور امرتسر میں آگ اور خون کا کھیل بڑی بے باکی سے کھیلا جا رہا تھا۔ لاہور والوں کو، جو امرتسر سے صرف تیس میل کے فاصلے پر تھا، کچھ معلوم نہ تھا کہ امرتسر میں کیا ہو رہا ہے۔ امرتسر کے چوک پراگداس میں سکھوں نے بہت سے مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بازار کڑہ جمیل سنگھ راکھ اور اینٹوں کا ڈھیر بن گیا تھا۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے بازار تھے۔ وہ سب پہلے لوٹے گئے، پھر جلائے گئے اور مسلمان قتل کئے گئے۔امرتسر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس بدری داس نے تمام مسلمان سپاہیوں سے ہتھیار لے کر انہیں برخاست کر دیا۔امرتسر کے بہادر اور غیرت مند مسلمانوں نے بھی حملہ آور سکھوں کا مار مار کر بھرکس نکال دیا لیکن امرتسر کے آس پاس کی سکھ آبادیوں سے مسلح سکھ بڑی تعداد میں شہر میں آ گئے۔اس کے علاوہ ریاست چندہ، کپورتھلہ، نابھہ اور پٹیالہ کی فوجیں بھی سکھوں کی امداد کے لئے شہر میں داخل ہو گئیں اور وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا جس کی وجہ سے بالآخر امرتسر کے مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔امرتسر کا کروڑ پتی سکھ باوا گرمکھ سنگھ بڑی فیاضی سے اکالیوں کی مالی امداد کر رہا تھا جبکہ یہی کام لاہور میں گوکل چند نیرنگ فرقہ پرست رائے بہادر بدری داس، بھیم سین سچر اور بھار گو کر رہے تھے۔ یہی لوگ ہندوؤں اور سکھوں کو اسلحہ وغیرہ فراہم کرتے تھے۔

اکالی جتھے جو سکھ ریاستوں سے ملنے والے اسلحہ سے مسلح ہوتے تھے، ریاستی جیپوں میں سوار ہو کر مسلمانوں کے دیہات پر حملہ آور ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے کشت و خون میں انگریز کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ پنجاب کا چیف سیکرٹری میکڈانلڈ تھا جو بڑا متعصب اور بدباطن شخص تھا۔ پنجاب میں جب فساد کی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے تو کچھ ہندو اور سکھ لیڈروں نے میکڈانلڈ سے درخواست کی کہ ''جو لوگ

گھروں سے نکل کر پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں، انہیں کہیں محفوظ ٹھکانہ فراہم کیا جائے۔"

میکڈانلڈ نے جواب دیا۔ "تم لوگ فکر مت کرو تم کچھ روز بعد اپنے لوگوں کو مسلمانوں سے ایسا انتقام لیتے دیکھو گے جس سے تم اپنی مصیبت بھول جاؤ گے۔"

اکالی لیڈروں نے پہلے ہی سکھ ریاستوں کے حکمرانوں مہاراجہ پٹیالہ، فرید کورٹ، کپور تھلہ اور نابھہ کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مسلم لیگ اور کانگریس کے خلاف محاذ بنا کر پنجاب میں اپنی سکھ ریاست قائم کر لیں گے۔ اکالی سکھوں کی ایک جماعت "بر برا کالی" کے نام سے تھی۔ یہ جماعت صرف اور صرف مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ یہی مقصد راشٹریہ سیوک سنگھ کا تھا۔ اس کے علاوہ سکھوں کی ایک تنظیم "شہیدی دل" کے نام سے تیار کی گئی تھی جس کا مقصد وحید بھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا تھا۔ یہ سب اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت گری میں مصروف تھے۔ "شہیدی دل" نے دیہات میں مسلمانوں کے قتل عام کے لئے دستے مقرر کر رکھے تھے جن کو سکھ ریاستوں سے رائفلیں اور تلواریں مہیا کر دی گئی تھیں۔ جیپیں اور ٹرک بھی دیئے گئے تھے۔

راشٹریہ سیوک سنگھ کا لیڈر لاہور کا مشہور متعصب، مسلم دشمن اور فرقہ پرست رائے بہادر بدری داس تھا اور مسلمانوں کے خلاف بم بنانے میں بھی مدد کرتا تھا۔

ان دنوں سکھوں کے گردوارے اور ہندوؤں کے مندر مسلمانوں کے خلاف اسلحہ خانے بن چکے تھے۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں کے حکمران بڑی بھاری تعداد میں رائفلیں، دستی بم، سٹین گنیں، چھوٹی توپیں اور گولہ بارود ان اسلام دشمنوں کو بہم پہنچاتے تھے۔ ان ریاستوں میں پٹیالہ کا حکمران سب سے پیش پیش تھا۔ فرید کوٹ کے راجہ نے سکھوں کو بڑی تعداد میں جیپ گاڑیاں دی تھیں۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے کارکنوں کو فوجی تربیت دینے کا انتظام مہاراجہ کپور تھلہ کے ولی عہد نے کیا تھا۔

"مسلمان مہاجرین کی گاڑیوں پر حملوں، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی ابتداء

ریاست پٹیالہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ پنجاب کے گورنر جیکنز کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیکنز نے سکھوں اور ہندوؤں کو قتل وغارت گری اور لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔"

("پنجاب کی خونی داستان" از مسٹر دھنوتری)

ریاست پٹیالہ میں سب سے زیادہ مسلمانوں پر ستم ڈھائے گئے۔ مسلم پناہ گزینوں کے لئے پٹیالہ میں مختلف مقامات پر کیمپ بنادیئے گئے تھے۔ ان میں دو لاکھ کے لگ بھگ مسلمان مہاجرین نے پناہ لے رکھی تھی۔ ایک سینئر مسلمان سول افسر (میاں امین الدین) جن کو حکومت پنجاب کی طرف سے مسلمان مہاجرین کی اشک شوئی کے لئے پٹیالہ کے مہاجر کیمپوں کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا گیا وہ جب پٹیالہ پہنچے تو سب کیمپ خالی پڑے تھے۔ اس سینئر سول افسر کے استفسار پر مہاراجہ پٹیالہ نے کہا "سب مسلمانوں کو پاکستان کی سرحد پر پہنچا دیا گیا ہے۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان بدنصیب مسلمانوں کو پٹیالہ کی فوج کی "حفاظت" میں پاکستان کی سرحد کی طرف بھیجا تو جاتا تھا لیکن راستے ہی میں قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ریاست پٹیالہ میں لگ بھگ دو لاکھ خانماں برباد مسلمان شہید کئے گئے۔ اس قتل وغارت گری کی تمام تر ذمہ داری مہاراجہ پٹیالہ پر عائد ہوتی ہے۔

("تگ وتاز" از میاں ایم اسلم)

سکھوں کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے ریاست پٹیالہ میں ایسے فرضی فوٹوگراف تیار کرائے گئے تھے جن میں مسلمان خصوصاً پٹھان سکھ عورتوں کو ان کی عصمت دری کی نیت سے پکڑے ہوئے تھے۔ سکھ کھلے بندوں ابدالی کے حملوں کا بدلہ لینے کے نعرے لگاتے تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ، اکالی دل اور ہنوماں دل وغیرہ نے ریاست میں مسلمان افسروں، مسلم لیگیوں اور سرکردہ مسلمان خاندانوں کے مکانوں پر خاص نشان لگا رکھے تھے۔ سکیم کے مطابق ان سب شہروں، محلوں اور بستیوں میں مسلمانوں کو ایک ہی وقت اور ایک ہی دن حملہ کر کے قتل کیا جانا تھا۔ اس کام کے لئے ریاستی فوج،

پولیس اور ملٹری کی امداد تعاون سے اکالی دل کو تمام تر ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ دوسری سکھ ریاستوں میں بھی اس سکیم پر اسی طرح عمل کیا جانا تھا۔ اس سکیم کے محرک اور کرتا دھرتا مہاراجہ پٹیالہ، راجہ فرید کوٹ، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور اودھم سنگھ وغیرہ تھے۔ اس سکیم پر عملدرآمد کے لئے ریاست پٹیالہ اور فرید کوٹ نے سکھوں کو اسلحہ اور فوجی گاڑیاں اور جیپیں دی تھیں۔ ریاستی فوج شہری لباس میں ان جتھوں کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی۔ سکھوں نے قتل عام کی ابتداء ان ٹرینوں سے کی جن میں وہ لوگ سفر کرتے تھے جنہوں نے بطور سرکاری ملازم اپنی خدمات حکومت پاکستان کے سپرد کر دی تھیں۔

سب سے پہلے 9 اگست 47ء کو اس ٹرین پر جو سرکاری ملازمین کو لے کر دہلی سے بھٹنڈہ جاتی تھی، حملہ کیا گیا۔ دوسری ٹرین جو بھٹنڈہ سے سمہ سٹہ کو جا رہی تھی، تباہ کی گئی۔ تیسری ٹرین جو ان کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنی جو انبالہ سے لاہور براستہ امرتسر جاتی تھی۔ دہلی سے مہاجرین کی ایک بدقسمت ٹرین بھٹنڈہ کے پاس روک کر تباہ و برباد کر دی گئی۔ اس پوری ٹرین میں سے صرف تین افراد زندہ بچے جو لاہور پہنچے، باقی پوری ٹرین لاشوں سے اٹی پڑی تھی۔ یہ تین افراد بھی لاشوں کے نیچے دبے ہونے کی وجہ سے جان بچانے میں کامیاب رہے۔

ماہ جون اور جولائی 1947ء میں مسلم لیگ کے لیڈروں کو آنے والے خطرات کی اطلاع مل چکی تھی۔ سکھ مسلمانوں کے قتل عام کے لئے شہیدی جتھے تیار کر رہے تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے علی الاعلان یہ کہہ دیا تھا کہ اس کی ریاستی فوج سکھ پنتھ کی خدمت کرے گی۔

پنجاب میں مسلمانوں پر جو خوفناک تباہی آئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ اور دوسری مسلمان سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کو منظم و مسلح کرنے کی طرف بھول کر بھی توجہ نہ دی تھی۔

ذاتی ڈاکٹر کا حشر

ڈاکٹر عبدالعزیز خان مہاراجہ پٹیالہ کا ذاتی معالج تھا۔ ایک روز مہاراجہ نے اسے محل میں طلب کیا اور کہا کہ ''پٹیالہ میں برہنہ مسلمان عورتوں کا ایک جلوس نکالا جانے والا ہے۔ تم میرے ساتھ بیٹھ کر یہ جلوس دیکھو۔''

ڈاکٹر نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ ''حکمران رعیت کا باپ ہوتا ہے۔ آپ کو اپنی (مسلم) رعیت پر ایسا ظلم نہیں کرنا چاہئے''

یہ سن کر مہاراجہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے ڈاکٹر عبدالعزیز کو ایک ستون کے ساتھ بندھوا کر خنجر سے اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور بڑی بے رحمی سے قتل کرا دیا۔ اسی پر بس نہیں کیا۔ ٹریکٹر بھیج کر ڈاکٹر کے گھر کو مسمار کرا دیا۔ گھر کے اندر جتنے لوگ تھے وہ بھی ٹریکٹروں اور ملبے کے نیچے آ کر پس گئے۔

مہاراجہ پٹیالہ کے حکم سے بے شمار مسلمانوں کو گرفتار کر کے قلعہ بہادر گڑھ میں محبوس کر دیا گیا۔ پھر تمام مسلمان قتل کر دیئے گئے اور جوان عورتیں سکھ غنڈوں کے حوالے کر دی گئیں۔ (سٹوری آف انڈین ایگریشن)

مہاراجہ نابھ نے ریاست کے تمام کھاتے پیتے گھرانوں کے مسلمانوں کو 19 ٹرکوں میں سوار کرا کر پنجاب کی ایک مسلم ریاست ملیر کوٹلہ کی طرف بھیج دیا لیکن راستہ ریاست پٹیالہ کی حدود سے گزرتا تھا۔ مہاراجہ کے حکم سے انیس ٹرکوں میں سوار تمام مسلمانوں کو راستے میں ہی قتل کرا دیا گیا۔ صرف چار آدمی زندہ بچ کر ملیر کوٹلہ پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ مسلمانوں کو جہاں موقع ملتا تھا، جان ہتھیلی پر رکھ کر قاتلوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ موضع جھنڈیانوالہ کے قریب مسلمان مہاجرین کا اک بڑا کیمپ تھا۔ کیمپ میں تیس ہزار سے زائد مسلمان پاکستان جانے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ایک غیر منظم جم

غفیر نے اچانک کیمپ پر ہلہ بول دیا۔ مسلمانوں نے بڑی بہادری سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور مار مار کران کا بھرکس نکال دیا۔ ہزاروں حملہ آور کھیت رہے اور باقی بدحواس ہوکر بھاگ نکلے۔ پھر چند روز تک کسی کو کیمپ کے نزدیک آنے کی جرأت نہ ہوسکی جب جنرل موہن سنگھ کو اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے ریاست بھرت پور اور پٹیالہ کی فوجوں کو ساتھ لے کر کیمپ پر حملہ کیا۔ پہلے توپوں سے گولہ باری کی گئی جس سے بے شمار مسلمان شہید ہوگئے۔ پھر پیادہ فوج نے حملہ کر کے مسلمانوں کو قتل کر کے عورتوں کو اغواء کرلیا اور تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ (سٹوری آف انڈین ایگریشن)

آئندہ صفحات میں ہم ریاست پٹیالہ کے چند مسلمان افسروں اور سرکاری ملازمین پر گزرنے والے قیامت خیز واقعات انہیں کی زبانی پیش کررہے۔

......☆......

داستانِ خونچکاں

تحریر: جمیل اطہر قاضی

(جناب جمیل اطہر قاضی ہمارے ملک کے کہنہ مشق صحافی، مصنف، کالم نگار اور دانشور ہیں۔ وہ روزنامہ "جرأت"، "تجارت" انگریزی "بزنس" اور ماہانہ "وویمن ٹائمز" کے مالک و چیف ایڈیٹر ہیں۔ ان کے یہ اخبارات بیک وقت لاہور، راولپنڈی، مظفر آباد، میرپور، کوئٹہ اور پشاور سے شائع ہوتے ہیں۔ جمیل اطہر صاحب آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی اور کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کے بانی ممبر اور ان دونوں اداروں کے صدر، جنرل سیکرٹری اور خازن رہ چکے ہیں۔ اخبارات میں ان کے تین صاحبزادے عرفان اطہر قاضی، عمران اطہر قاضی اور ریحان اطہر قاضی ان کے معاون و مددگار ہیں۔)

"میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس نے مجھ سے گلے ملنے کی مقدور بھر سعی کی مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔"

1947ء میں جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میرے والد محترم قاضی سراج الدین سرہندی نے جو سرہند (ریاست پٹیالہ) کے ایک متمول تاجر تھے، ہمیں اپنے ننھیال پٹیالہ بھیج دیا تاکہ ہم وہاں اپنے نانا مرحوم شیخ مہر علی کے پاس بحفاظت رہ سکیں کیونکہ وہ وہاں

ایک ممتاز پولیس افسر تھے۔ ہمیں سرہند سے گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور پٹیالہ ریلوے سٹیشن پر ہمارے نانا ہمیں لینے کے لئے موجود تھے۔ ٹانگہ میں سوار ہو کر گھر پہنچے وہاں ایک دو روز امن اور چین سے گزارے۔ ایک روز دوپہر کے وقت جبکہ کھانا تیار ہو رہا تھا تو اچانک گولیوں کی آواز سنائی دی اور ہمارے نانا نے ہمیں یہ پیغام دیا کہ ہمیں بہت جلد یہ مکان چھوڑ دینا چاہئے کہ محلہ کے غیر مسلم لوگوں کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اس صورتحال سے گھر بھر میں پریشانی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ یہ مکان چھوڑ دیا جائے اور کسی مسلم اکثریت والے علاقے میں پناہ لی جائے۔ ابھی یہ مکان چھوڑنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ہمارے ماموں نے جو مکان کی بالائی منزل میں رہائش رکھتے تھے اور محکمہ پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے، یہ اطلاع دی کہ ایک ہندو پڑوسی نے ان کی طرف بندوق کا نشانہ باندھنے کی کوشش کی مگر وہ جان بچا کر نیچے آ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں مزید ایک لمحہ کے لئے اس مکان میں رہنا قرین مصلحت نہیں تھا، اس لئے جملہ اہل خانہ مکان سے باہر نکل آئے۔ باہر پولیس یا فوج کے کچھ جوان پہرہ دے رہے تھے۔ ہم یہاں سے ایک دوسرے محلہ میں چلے گئے اور وہاں ایک واقف کار کے مکان میں پناہ لی۔ ہم لوگ اس مکان کے آخری کمرہ میں پناہ گزین تھے۔ مالک مکان کسی ضرورت سے بالائی منزل پر گیا مگر واپس نہ لوٹا۔ کافی انتظار کے بعد پتہ کیا گیا تو وہ خون میں لت پت پایا گیا۔ خیال گزرا کہ یہ کسی بدبخت کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اسی دوران گولیوں کی آواز بڑھتی گئی اور ہمیں مجبوراً ایک قافلہ کے ساتھ دوسرے محلہ میں ہجرت کرنا پڑی۔ ہم گھر سے جو معمولی سامان ہمراہ لائے تھے اس کا بڑا حصہ اسی مکان میں چھوڑ دیا گیا۔ یہاں سے ایک اور جگہ پہنچے۔ وہاں بدقسمتی سے عورتوں کو ایک علیحدہ بڑے کمرے میں رکھا گیا اور مردوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ غیر مسلموں نے کچھ عرصہ میں اس محلہ پر حملہ کر دیا جس حویلی میں ہم مقیم تھے، اس کا مالک نہایت نیک اور شریف مسلمان تھا اور پٹیالہ کے معززین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس نے حالات کی نزاکت دیکھ کر تمام خواتین کو ہدایت کی کہ وہ غیر مسلموں کی چیرہ دستیوں اور ان کے مذموم ارادوں سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کریں کہ جب غیر مسلم حملہ آور مکان میں

داخل ہوں تو مکان کے صحن میں گزرتی ہوئی بجلی کی ننگی تار کو چھوکر خود کو موت کے حوالے کردیں۔ چونکہ محلہ میں گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی اس لئے کئی کمزور دل خواتین نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا، ہماری والدہ محترمہ بھی اس کے لئے تیار ہوگئیں مگر اچانک انہیں یہ احساس ہوا کہ مرنے سے پہلے بچوں کو پانی ضرور پلانا چاہئے، وہ ہمیں لے کر پانی کے نل کی طرف گئیں کہ اچانک ہمارے ماموں کی نظر پڑی۔ وہ ہمیں دیکھ کر دیوانہ وار دوڑے اور ہم سب کو بری طرح گھسیٹ کر ایک اور جگہ لے گئے، اس وقت ہم اپنے نانا اور دوسرے اہل خانہ سے الگ ہو چکے تھے۔ رات اسی طرح گزاری۔ اگلے روز ایک اور جگہ منتقل ہوئے۔ وہاں نانا اور دوسرے اراکین کنبہ پھر مل گئے۔ اس جگہ بھی وہی حادثہ ہوا کہ غیر مسلموں کے حملہ کے خوف سے مالک مکان نے اپنے مکان کو آگ لگانے کا اعلان کردیا۔ ہم اپنی والدہ کے پاس اسی مکان کی بالائی منزل پر تھے۔ یہ سن کر عورتیں بچے بڑی تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگے۔ اسی ریل پیل میں ہماری خالہ زاد بہن بری طرح زخمی ہوگئیں (بعد میں وہ پاکستان آکر انتقال کر گئیں) اور جب ہم مکان سے باہر نکلے تو خالہ بھی فائرنگ کی زد میں آچکی تھیں۔ انہیں اگرچہ شدید زخم آئے مگر ان کی جان بچ گئی۔ اس دھکم پیل میں چھ سات روز گزر چکے تھے اور اب پٹیالہ شہر میں ہمارا آخری پڑاؤ ''شیرانوالہ گیٹ'' تھا۔ یہاں ہم دکانوں کے آگے ''پھٹوں'' پر پناہ گزیں تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اپنے ماموں زاد بھائی کے ساتھ سیڑھیوں کے ذریعے اس دکان کی چھت پر گیا تو وہاں ان گنت لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور دوسری دکانوں کی چھتیں بھی لاشوں سے اٹی پڑی تھیں۔ سخت جانچ پڑتال اور ''آخری مرحلہ بعافیت'' گزارنے کے لئے ہم نے سڑک پر پڑی ہوئی لاشوں میں اپنے لئے جگہ بنالی اور ان لاشوں میں ''مردہ'' بن کر چھپ گئے۔ پھر اعلان ہوا کہ اگلے روز مسلمانوں کو پاکستان بھیجنے کے لئے بہادر گڑھ کیمپ میں بھیجا جائے گا۔ صبح سویرے گیٹ پر ایک ہجوم جمع ہوگیا تھا، ہم بھی لاشوں کے انبار سے باہر آگئے تھے۔ گیٹ پر تلاشی لی گئی، ہماری آخری پونجی پیتل کا ایک تھال تھا جو یہاں چھیننے کی کوشش کی گئی مگر کافی منت سماجت کے بعد یہ ہمیں واپس کر دیا گیا۔ بہادر گڑھ کیمپ میں ایک ماہ کے قریب عرصہ

گزارنا پڑا۔ یہاں اس دوران میں راشن کا حصول، لکڑی اور ایندھن اور کپڑوں کی نایابی کے مسائل نے بری طرح پریشان کر رکھا تھا۔ راشن کا مسئلہ تو اس طرح حل ہوا کہ نانا مرحوم کسی نہ کسی طرح ایک سو روپے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ایندھن کی ضرورت ایک کمرے کی چھت کی لکڑیاں، کھڑکیاں اور دروازے توڑ کر پوری کی گئی۔ رات کو پتھروں پر سوتے تھے اور صبح ادھر ادھر چل پھر کر اور گھوم کر...... بالآخر پاکستان آنے کے لئے گاڑی میں سوار ہوئے اور ہزارہا پریشانیوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہو کر ہماری گاڑی کی منزل شاہ جیونہ (ضلع جھنگ) قرار پائی لیکن گاڑی کے مسافروں نے جو تمام کے تمام پٹیالہ شہر کے رہنے والے تھے، اس پر سخت اعتراض کیا جس کے نتیجہ میں گاڑی کا سفر جھنگ ریلوے سٹیشن پر ختم ہوا۔ یہاں مکان کا حصول سب سے پہلی ضرورت تھی، لوگ دھڑا دھڑ متروکہ مکانوں کے تالے توڑ رہے تھے مگر ہمارے شریف النفس نانا اس لاقانونیت پر آمادہ نہ ہوئے اور اس کی بجائے متعلقہ حکام کے دفاتر کا طواف کرنا پڑا۔ اس دوران میں جھنگ صدر کی ایک شاہراہ واقع گندے نالہ کے کنارے پر پڑاؤ کرنا پڑا۔ ہمارے پاس بوریوں کے بستر تھے اور تن ڈھانپنے کے لئے بھی بوریوں کا ہی لباس...... ادھر والد صاحب ضلع لائل پور (اب فیصل آباد) کے ایک قصبہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تشریف لے آئے تھے جو جھنگ سے بیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ پٹیالہ میں خون ریزی اور مار دھاڑ کی اطلاعات انہیں مل چکی تھی۔ وہ ہماری زندگی یا موت کے واقعات کے بارے میں معلومات لینے کے لئے جھنگ آئے۔ میں اسی گندے نالے کے قریب کھڑا سڑک پر آنے جانے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے سامنے سے ایک شناسا صورت نظر آئی اور دفعتہً میرے منہ سے چیخ قسم کی آواز نکلی: ابا جی......! ابا جی......! میں والد صاحب کی طرف بھاگا اور ان سے لپٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور جب میں نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ فرطِ مسرت سے والد صاحب کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھیں۔''

......☆......

نارنول ریاست پٹیالہ کے حالات

سردار احتشام الحق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی تلخ یادیں

21 جولائی 1947ء کو مہاراجہ نے موتی باغ محل پٹیالہ میں ایک اجلاس بلایا جس میں تمام وزراء، ضلعی مجسٹریٹ اور ریاست بھر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس شریک ہوئے۔ ان سب میں اکیلا میں ہی مسلمان تھا۔ مہاراجہ نے تلخ لہجے میں شکایت کی کہ امرتسر کے آگے (پاکستان) کے علاقوں میں مسلمان غیر مسلموں پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ ''آخر میں مہاراجہ نے کہا۔ ''اگر کوئی پاگل ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سب اسی طرح ہو جائیں۔'' اس اجلاس میں، میں نے مہاراجہ سے دریافت کیا کہ ''بھرت پور، الور کی ریاستوں اور برطانوی ہند کے علاقے سے ریاست پٹیالہ میں پناہ لینے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔'' مہاراجہ نے کہا ''آپ ان کی حفاظت کریں کیونکہ ہماری پالیسی یہ ہے کہ جو کوئی بھی چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہمارے پاس آتا ہے ہم اسے پناہ دیں، آپ کو یاد ہوگا کہ اس اجلاس کے بعد میں نے پٹیالہ میں آپ کے گھر پر آپ سے ملاقات کی تھی اس اجلاس میں مہاراجہ کے رویے کی بنیاد پر میں نے یہ کہا تھا کہ پٹیالہ کی ریاست میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔

میرے والد سردار فضل حق خاں جو ریٹائرڈ وزیر تھے ان کا اعلیٰ حلقوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ شروع میں مہاراجہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے خلاف تھا اور اس نے یہ بات ماسٹر تارا سنگھ کو کھلے الفاظ میں کہہ دی تھی لیکن بعد میں جب مسٹر ولبھ بھائی پٹیل مہاراجہ سے ملے اور ان کو یہ یقین دلایا کہ اگر مسلمانوں کو ریاست پٹیالہ سے نکال دیا گیا تو پنجاب کا اقتدار مہاراجہ کے حوالے کیا جائے گا، تو اس کے رویے میں تبدیلی آگئی

اور پھر اس نے فوج اور پولیس کو اپنا کام دکھانے کی اجازت دے دی۔

ریاست پٹیالہ کے جی او سی جنرل بلونت سنگھ اور آئی جی پی دلیپ سنگھ بد قسمتی سے پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ نہ صرف مسلمانوں کو ریاست سے نکال دیا جائے بلکہ ان سے غیر انسانی سلوک کیا جائے اور مظالم ڈھائے جائیں۔

میں 1947ء میں پوری ریاست میں واحد مسلمان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا۔ مسلمان بڑی تعداد میں اس ضلع میں آباد تھے۔ غیر مسلموں میں اہیر اور راجپوت شامل تھے جبکہ سکھوں کی تعداد برائے نام تھی اہیر بزدل تھے لیکن ہندو راجپوت فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف تھے۔ ان کے مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے، لہٰذا ضلع نارنول میں گڑ بڑ کا کوئی امکان نہ تھا تاہم مسلمانوں کو اس ضلع سے نکالنے کے لئے حسب ذیل اقدامات کئے گئے تھے۔

آئی جی پی دلیپ سنگھ نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ جو مسلمان الور اور بھرت پور کی ریاستوں سے آ کر اس ضلع میں پناہ گزیں ہوئے ہیں، ان کو نکالا جائے۔ اس مقصد کے لئے اے ایس آئی پی ریلوے مسٹر سنگھا نارنول آئے اور انہوں نے مسلمانوں کے پر امن انخلاء کے لئے انتظامات کئے جب میں نے ریلوے اسٹیشن پر اس سے ملاقات کی تو نارنول کا ایس پی بھر پور سنگھ میرے ہمراہ تھا۔ مسٹر سنگھا نے پوچھا۔ ''کیا ریاست پٹیالہ کی حکومت مسلمانوں کو نکالنا چاہتی ہے؟''

بھر پور سنگھ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، حکومت کی ایسی پالیسی نہیں۔''

اس نے پھر پوچھا۔ ''کیا مسلمانوں کو نکالنے کے لئے کوئی طویل منصوبہ بنایا گیا ہے؟''

بھرت پور سنگھ نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے مسٹر سنگھا کو اس صورتحال کا پوری طرح علم ہے اور ایس پی بھرت پور سنگھ اس لئے میرے ساتھ ہو گیا کہ کہیں ہم دونوں مل کر بات چیت نہ کر سکیں جن دنوں نارنول میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ یہی مسٹر سنگھا بچے کھچے مسلمانوں کو ایک ٹرین میں بٹھا کر لے آئے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی تھی جب یہ گاڑی ایک سنسان علاقے سے گزر رہی تھی تو ڈرائیور نے اسے روک کر کہا کہ ''اب وہ گاڑی آگے نہیں لے جائے گا۔'' اس کی نیت یہ تھی

کہ آس پاس کے ہندو گاؤں سے لوگ آکر ٹرین کو لوٹ لیں گے لیکن مسٹر سنگھا نے اس کے سینے پر پستول رکھ کر کہا کہ ”ٹرین دہلی لے چلو ورنہ میں تمہیں ہلاک کر دوں گا۔“ اس کی دھمکی میں آکر ڈرائیور گاڑی کو دہلی لایا۔

میری مخالفت کے باوجود بیس ہزار سکھ اور ہندو مہاجر ضلع نارنول میں لائے گئے۔ میں اعلیٰ حکام سے کہا ”اس سے فسادات کی آگ بھڑکے گی اور یہ کہ ان کو ٹھہرانے کے لئے جگہ بھی نہیں ہوگی تو یہ مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے۔“

نارنول سے تیس میل کے فاصلے پر ایک جگہ مہندر گڑھ تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کے زمانے سے وہاں ایک پرانا قلعہ موجود تھا۔ اس کو جیل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ 1947ء میں اس کی دیواریں گر گئی تھیں اور یہ ویران ہو گیا۔ مجھے اطلاع ملی کہ قیدیوں کو مہندر گڑھ قلعہ میں رکھنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے اس کی بھی مخالفت کی کہ ”جب تک اس قلعہ کی دیواروں کی مرمت نہ ہو جائے، اسے جیل کے طور پر استعمال کرنا مناسب نہ ہوگا۔“ اس کے باوجود سینکڑوں قیدی وہاں بھیج دیئے گئے۔

20 جولائی 1947ء کو جب میں نارنول سے پٹیالہ بذریعہ ٹرین جا رہا تھا تو ایک شخص ایشر سنگھ نے جو میرا ہمسفر تھا اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں واپس نارنول نہ آؤں کیونکہ وہاں میرے لئے خطرہ ہے۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ یہ ایشر سنگھ بھرت پور سنگھ کا معتمد تھا اور مہاجرین اور پٹیالہ سے قلعہ سے لائے گئے سکھ قیدیوں کا لیڈر تھا۔

ستمبر 1947ء کو مسلمانوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ایس پی بھرت پور سنگھ نے مجھے بتایا کہ ”شہر کے لوگ میری جان کے درپے ہیں اور اگر مجھے نقصان پہنچا تو اس کی ذمے داری اس پر نہ ہوگی، لہٰذا اس نے مجھے اپنے گھر میں رہنے کا مشورہ دیا۔ میرا اسلحہ بھی ایس پی نے واپس لے لیا۔ اسی طرح دوسرے مسلمان جو پولیس اور فوج میں تھے ان کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔

فسادات کے پہلے روز تو غیر مسلم پولیس اور فوجیوں نے غیر مسلم فساد کرنے والوں کی کوئی مدد نہ کی۔ نتیجہ مسلمانوں نے غیر مسلموں کو مار بھگایا۔ ایس پی اور دوسرے

غیر مسلم افسروں کو اس سے خاصی تکلیف پہنچی۔ میں نارنول کے قلعہ میں اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ 6 ستمبر کو جب میں نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا تو ایک تار کے ذریعے پیغام بھیجا کہ مجھے کسی دوسری جگہ تبدیل کر دیا جائے۔ اس سے اگلے روز اور اس کے بعد مسلمانوں کو پولیس، فوج کے آدمیوں اور سکھ مہاجرین اور نام نہاد سکھ قیدیوں نے مل کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ 14 ستمبر کو دو ٹرک مجھے اور دوسرے مسلمان سرکاری ملازمین کو لینے کے لئے آئے۔ 15 ستمبر کو ہم سب نے نارنول چھوڑا۔

ایک رات ہم دہلی میں ٹھہرے اور 16 ستمبر کو پٹیالہ پہنچ گئے۔ راستے میں ہم ہندو گڑھ سے بھی ہوتے ہوئے آئے اور وہاں کے مسلمان ملازمین کو بھی ساتھ پٹیالہ لائے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ تمام مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور ہمیں بتایا گیا کہ ستنالی ریلوے اسٹیشن سے ایک ٹرین روانہ ہوگی۔ لیفٹیننٹ احمد علی خاں مہندر گڑھ کے آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ان کا خاندان بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ انہوں نے ہمارے ٹرکوں کے گارڈز سے کہا کہ وہ ان کے خاندان کے افراد کو بھی ساتھ لے جائیں، ان کو صاف جواب ملا ، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو ستنالی ریلوے اسٹیشن پہنچانے کے لئے پیدل چلایا گیا۔ راستے میں سینکڑوں ہندوؤں اور سکھوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان سے بیشتر قتل کر دیئے گئے۔ جوان عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ کچھ نوجوان جان بچا کر بھاگ گئے۔

میں نے اس روز ایشر سنگھ کو مہندر گڑھ میں دیکھا تھا وہ ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور وہ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ وہ وہاں مسلمانوں کو قتل کر رہا تھا۔ مجھے بستی پٹھاناں بھیجا گیا جہاں پر میرا آبائی گاؤں تھا۔ مجھے چیف آف جنرل سٹاف کی زبانی معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کو پاکستان جانا ہوگا۔ آپ اسے مسلمانوں کی سادگی کہیے یا غلط سوچ کہ 16 ستمبر تک انہوں نے یہ بات محسوس ہی نہ کی تھی کہ ان کو گھر بار چھوڑ کر پاکستان جانا ہوگا۔

پٹیالہ جاتے ہوئے ہم راستے میں دہلی ٹھہرے تھے۔ ہمارے ساتھ جو سرکاری گارڈ تھے، ان کی گفتگو ہم نے سنی، وہ کہہ رہے تھے کہ حکومت کی کیسی بیہودہ پالیسی ہے کہ غریب لوگ تو قتل ہوتے رہیں اور بڑے آدمیوں کی حفاظت کی جائے۔

اب میں وہ باتیں بتانا چاہتا ہوں جو میں نے خود مشاہدہ کیں یا جو میرے عزیزوں نے مجھے بتائیں۔ ایک خاص منصوبے کے تحت سکھ فوج کو بستی بھیجا گیا اور اس نے 2 دسمبر کو ہائی سکول کی عمارت میں کیمپ لگا دیا۔ سول اور فوج کے اعلیٰ حکام نے حافظ حلیم مرحوم کے بنگلے میں رہائش اختیار کر لی۔

میری معلومات کے مطابق ریاست پٹیالہ میں سرکاری اشارے کے بغیر کہیں بھی مسلمانوں پر حملہ نہ کیا گیا۔ مثلاً روضہ شریف سرہند کو حکومت نے محفوظ مقام قرار دیا اور گرد کے گاؤں سے سینکڑوں مسلمانوں نے وہاں پناہ لی جن پر اجرا سنگھ ایم اے ایل پی (علیگ) ایڈووکیٹ کی قیادت میں مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ روضہ شریف کے آس پاس سے سکھ اور ہندو شرنارتھیوں کا گزر ہوتا تھا لیکن انہوں نے اس کے اندر کسی مسلمان سے زیادتی کرنے کی جسارت نہ کی۔ ان کو حکم یہ ملا تھا کہ روضہ شریف کی دیوار تک پر کسی گولی کا نشانہ نہیں ہونا چاہئے تاکہ افغانستان کی حکومت ناراض نہ ہو۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اوم پرکاش نے میرے چچا مسٹر ضیاء الدین خاں اور میرے بھائی مظہر الحق خاں سے متعدد بار کہا کہ وہ روضہ شریف میں پناہ لے لیں۔

13 ستمبر کو سینکڑوں مسلح سکھوں نے بستی کے چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ حکام کی طرف سے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔

14 ستمبر کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو وائرلیس پر پیغام ملا کہ مسلمانوں کو مزید قتل عام نہ کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پرتاپ سنگھ نے بستی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سکھوں کو جا کر بتایا کہ مہاراجہ کا حکم ہے قتل و غارت گری نہ کی جائے۔

یوں بستی آگ اور خون کی ہولی سے بچ گئی۔ ان شرنارتھیوں نے بھی شور مچایا کہ اگر لوٹ مار نہیں مچانی تھی تو بلایا کس لئے تھا۔ سنت پرتاپ سنگھ نے ان کو بتایا کہ پالیسی میں تبدیلی کی گئی ہے۔

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست پٹیالہ میں جس قدر قتل و غارت گری ہوئی مہاراجہ ہی کے احکامات پر ہوئی۔

براس (ضلع پٹیالہ) میں خونِ مسلم کی ارزانی

تحریر: سردار علی احمد خان (مرحوم) [1]

پندرہ فروری 1977ء کی صبح کو 94 پاکستانی زائرین پر مشتمل بلا کشان محبت کا قافلہ شوق لاہور سے عازم سرہند ہوا۔

سرہند جو اپنے نام کے ساتھ صدیوں کی تاریخ کی ایک جھلک ہماری آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ اپنی انفرادیت کی وجہ سے یہ ایک خاص امتیاز کی حامل ہے۔ سرہند کا نام زبان پر آیا تو کیسی کیسی خوشنما تصویریں ذہن میں متحرک فلم کی طرح سے گزرنے لگیں۔ انڈین ریلوے کے تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں جائے تنگ و مرد ماں بسیار والا معاملہ تھا لیکن ایک کونے میں راقم کو گزارے لائق آرام دہ جگہ مل گئی۔ سفر شروع ہوا تو دماغ نے آہستہ آہستہ کروٹ لینی شروع کی اور خیالوں کا جمگھٹا بڑھنے لگا، تصورات کے غول کے غول جمع ہوتے گئے۔ سرہند ان کا مرکز تھا۔ ادھر تاریخ کی پرانی اور طویل داستانوں کا اژدھام تھا۔ ادھر اسلامی علوم وفنون، حکمت وشعر اور تہذیب کی یادوں کا انبوہ خیالات کی زیادہ دھکم پیل ماضی بعید وقریب پر رہا کی۔ اسی عالم میں غیر ارادی طور سے بار بار نظر ریل گاڑی کی کھڑکی سے دکھائی دینے والے مناظر پر جا ٹکتی۔ گندم کی فصل سے لہلاتے کھیت، باریک پر پیچ پگڈنڈیاں، ندی نالے بے ٹیلے تیزی سے گزرتے جاتے۔ اب سے چالیس برس پہلے انہیں راستوں سے مظلوم و بے بس مہاجرین کے قافلے گزرے تھے۔ یہ راستے آگ اور خون کا سمندر بن گئے تھے جسے پاکستان جانے والے مسلمانوں کو عبور کرنا تھا۔ ان میں سے ہزاروں نہیں لاکھوں کھیت رہے جو بچ پائے اور سرحد پاکستان میں داخل ہوئے، اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے، صرف ایمان اور اسلام کی محبت ساتھ تھی اور وطن کی تعمیر کا جذبہ۔

---

[1] سردار صاحب 20 نومبر 2006ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔

اُف یہ کب کی ہے لے جو یوں دل سے
آنچ کی طرح سنساتی ہے

کچھ دیر تک خیالات کے ہجوم کو قیامت و محشر کی یادوں نے گھیرے رکھا سینہ میں ہزاروں شعلے پرفشاں ہو گئے۔

جلتے بجھتے بلب کی مانند دل میں کبھی یہ خیال کبھی وہ تصور غلبہ پاتا رہا لیکن کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر خیالات کا رخ سرہند کی جانب پلٹ گیا۔ شہر سرہند، وہ متبرک بستی جسے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ؒ کا مولد و منشاء ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اسی خاک پاک کے خمیر سے سینکڑوں اکابر، مصلحین، علماء اور اولیاء اٹھے جنہوں نے اسلام کی تمدنی روایات کو تابندہ تر بنا دیا۔ دور حاضر کی مانند سرہند اجڑے دریاؤں اور کھنڈروں کا تودہ نہ تھا۔ اپنی جوانی میں یہ جیتا جاگتا، ہنستا بستا شہر تھا جو عظیم اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ تھا کہ جس کی گود میں علوم تفسیر و کلام حدیث و فقہ، حکمت و دانش، شعر و ادب اور زمانہ بھر کے ہنر ہائے زیبا پرورش پاتے رہے۔ غرضیکہ ایک عالم کا خوشہ چین کرم تھا۔ قریب و بعید کے مسلم ممالک میں سرہند کی شہرت کا غلغلہ تھا اور دور دراز سے طالب علم، تاجر، مذہبی رہنما، سلاسل صوفیاء کے پیشوا مبلغ صاحب منصف، حاکمان اعلیٰ، بادشاہان ذی شان، عمائدین باوقار زیارت کے لئے آتے، خراج تحسین و عقیدت ادا کرتے اور روحانی و مادی دولت کے تحفے لے کر واپس جاتے۔ اب یہ اپنے شاندار اور پر شکوہ ماضی کی عظیم یادگاروں کو اپنے سینے پر صدیوں سے اٹھائے تھکا ماندہ نظر آتا ہے۔

سرہند میں پانچ روز قیام کے دوران مجدد اعظم ؒ کے آستانہ عالیہ پر حصول فیوض و برکات کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کا شرف حاصل ہوا کہ جس کی ایک مدت سے آرزو تھی۔

برصغیر ہند و پاکستان میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا سہرا صوفیائے کرام کے سر ہے۔ کفر زار ہند میں اسلام کی شمع اولین انہوں نے ہی روشن کی اور صدیوں تک اسے فروزاں رکھنے میں تن من دھن سب نچھاور کر دیا۔ الحمد للہ آج برصغیر میں مسلمان ایک عظیم

قوت ہیں اور تعداد کے اعتبار سے 40 کروڑ سے زیادہ ہیں۔ مجدد الف ثانی ؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنایا اور تصوف کو ویدانت کے زہریلے اثرات سے پاک کیا۔ اسلامیان ہند کو ایک قومی تشخص اور نصب العین دیا۔ آپ کی ہستی ایک نعمت عظمیٰ کے مصداق تھی جس کے انوارات آج بھی ضو فگن ہیں۔

براس

سرہند کے مضافات میں تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک قدیم گاؤں براس واقع ہے۔ بہت بڑا گاؤں تھا اور ہے، اسے براس انبیاء بھی کہتے ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت یہاں کی کثیر آبادی مسلمان راجپوتوں پر مشتمل تھی۔ اسی موضع میں دو نبیوں کی قبریں ہیں جن کی نشاندہی حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے کی تھی۔ ان نبیوں کے مقدس ناموں کا پتہ نہیں، حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے سکوت فرمایا ہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ انبیاء کرام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمعصر تھے۔

کاروان زائرین براس پہنچا۔ یہاں دور تک تا حد نظر ایک پر سکون جمود کی فضا تھی۔ ایک پراسرار سکوت اور خاموشی کا ایک سناٹا جو کسی گزرے ہوئے طوفان کا پتہ دے رہا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دو نبیوں کے جسد اطہر پاکیزہ ترین مٹی میں قرار گیر ہیں۔ یہی وہ قریہ ہے جہاں کم و بیش چھ ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ بیکراں رفعتوں کا یہ وہ قطعہ زمین ہے جس کے مرتبہ میں آسمان بھی پست نظر آتا ہے۔

جون 1947ء میں پٹیل محور کی داغ بیل ڈالی گئی، ولبھ بھائی پٹیل، یادوندر سنگھ، مہاراجہ پٹیالہ اور اس وقت کے وزیر جنگ بلدیو سنگھ نے ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ کو آلہ کار بنایا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام اور بالجبر اکھاڑ پھینکنے کا ماسٹر پلان بنایا۔ چنانچہ جون اور جولائی 1947ء میں دہلی سے لے کر امرتسر تک اکالی دل کے جتھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی ٹولیوں کو مسلح اور منظم کیا گیا اور 16 اگست 1947ء سے مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا جن دیہات میں مسلمان قلیل تعداد میں آباد تھے سب سے پہلے ان کا خاتمہ کیا گیا اور عورتوں کو اغواء کیا۔ پھر ہندو سکھ فوج کی مدد سے اکالی اور سکھ جتھوں نے

کثیر آبادی والے دیہات اور چھوٹے قصبات میں غارت گری کا بازار گرم کیا۔ دیہاتی مسلمان ان بڑے دیہات میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد تھی وہاں ہندو سکھوں کے مسلح جتھوں اور ہندوستانی فوج کے ساتھ انہوں نے بڑی پامردی سے مقابلے کئے۔ موضع براس بھی ایک بڑا گاؤں تھا جہاں کی آبادی 98 فیصد کے قریب مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اردگرد سے پناہ گزیں مسلمان بڑی گنتی میں اپنے بال بچوں اور مویشیوں کو لے کر یہاں چلے آئے تھے۔ 19 اگست 1947ء سے یکم ستمبر 1947ء تک براس پر سکھوں نے بار بار حملے کئے لیکن انہیں بھاری جانی نقصان اٹھا کر بے نیل و مرام بھاگتے بنی۔ 6 ستمبر 1947ء کو ریاست پٹیالہ کی فوج کا ایک مسلح دستہ، مشین گنوں سے لیس اپنے ساتھ پانچ ہزار حملہ آور سکھوں کے جلو میں براس پہنچا اور گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ مشرقی پنجاب کا شاید یہ واحد گاؤں تھا کہ جہاں سے کوئی مسلمان فرد اپنی جان نہیں بچا سکا۔ سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔ اس قیامت صغریٰ کی تفصیل ہمیں ایشر داس نامی نے سنائی جو اس گاؤں کا قدیم باشندہ تھا اور پیشہ کے اعتبار سے سنار تھا۔

درد میں ڈوبی ہوئی شہداء کی خاموش نوائیں ...... براس کی سنسان فضا دھیرے دھیرے ایک کہانی سناتی ہے جسے سننے والا کبھی نہ بھلا سکے گا۔ 2 ستمبر کی صبح کو براس کی فضاؤں میں آخری بار صدائے اذان بلند ہوئی، ابھی مسلمان نماز سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ سکھ حملہ آوروں کا ٹڈی دل کفر کی ظلمتوں کا غبار اڑاتا ہوا ان پر ٹوٹ پڑا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے خون کا دریا بہنے لگا، نہتے، بے دست و پا، غمزدہ مسلمانوں کی چیخیں فضا میں تیرتی اور لاشیں خاک پر تڑپتی نظر آنے لگیں، چشم فلک بے نیازی سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ در اجابت حق تک دعا پہنچانے والے فرشتوں کو شاید اونگھ آ گئی تھی لیکن حق بات یہ تھی کہ اس غنی عن العالمین کی بزرگ و برتر ہستی کی رضا میں دخل دینے کی کسے مجال ہے۔ مسلمان اس کا تابع فرماں ہے، پیکر تسلیم و رضا ہنگیا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مرد مان جب رسم شبیری ادا کر چکے تو شوق شہادت اور عصمت کی حفاظت کا جذبہ اسلام کی عفت مآب بیٹیوں کے ہر ہر نفس میں چراغ طور روشن کر چکا تھا۔ دشت غربت کے ڈستے اندھیاروں میں انہیں شہادت عظمیٰ کا نیر درخشاں اپنے نور کی چادر رحمت پھیلائے نظر آیا۔ اسی تجلی کا ایک ہیولیٰ بالکل ان کے سامنے زمین میں جذب ہوتا جا رہا تھا ان پیکران ناموس کے دلوں میں فروزاں ایمان کی تنویر انہیں کشاں کشاں روشنی کی ان وادیوں کی سمت لے گئی جن کا راستہ براس کے کنوؤں کی تہہ سے جاتا تھا۔

یوں تن خاکی سے روشن دل ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہو گیا

ان کے اس عزم و استقلال سے کنوؤں کا زہرہ آب ہو گیا، مارے سہم کے پانی خشک ہو گیا۔ کنوؤں کی تہہ سے لے کر منڈیروں تک براس کی بیٹیوں کے بے جان جسم تھے، کفار کے ناپاک ارادوں کی دستبرد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ۔

براس کے کنوؤں کی سعادت کو اسلام جن کی گہرائیوں نے امت محمدیؐ کی آبرو کے موتی اپنے اندر سمو رکھے ہیں۔ یہ گنج شہیداں بھی وہ مقام محترم ہے جو کہ تا قیامت نظر گاہ غزالان حرم رہے گا۔ حفظ عظمت کے لئے مسلمات کی مثالی قربانی کا سر بفلک مینار۔

اس دن مسلمان راجپوت عورتوں کو شاید ان کے اجداد کی رسم جوہر یاد آ گئی تھی لیکن یہ اسلام کے لئے تھی۔ ان کا عمل سنت شبیری کے اتباع میں تھا۔ کنوؤں کے گھیر اور ان کی تنگدامانی پر باقی ماندہ جاں سپار خواتین کو گلہ کرنے کا وقت نہ تھا۔ گاؤں کی بڑی مسجد سے وہ قطار در قطار برآمد ہوئیں اور جن چار جگہوں سے مشین گنوں کا فائر آ رہا تھا۔ دیوانہ وار اسی سمت چل دیں۔ یہ منظر الشیر داس نے دیکھا تھا، اس کے الفاظ میں ہی سنئے۔

''پنڈ کی کڑیوں چڑیوں، سہاگنوں اور ماؤں نے بہت اچھے اور صاف کپڑے اور زیور پہنے ہوئے تھے اور وہ بازو پھیلائے اللہ اللہ کا جاپ کرتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے آتی گئیں اور گرتی گئیں۔ کونجوں کی ڈار سب شکار ہو گئی۔ گولیوں اور گن مشینوں والوں نے کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ سکھ فوجیوں اور اکالیوں نے مردہ جسموں کی بھی کاٹا کاٹی کی۔

کسی کی مندری نہ نکل سکی تو انگلی کاٹ دی چوڑیوں کے لئے بازو علیحدہ کر دیتے اور کانٹے اور بالیاں کان کاٹ کر حاصل کیں۔ گاؤں میں میرے اور اہل کنبہ کے علاوہ کوئی نہ رہا تھا۔ لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ کتے تک گاؤں سے بھاگ گئے تھے۔ دو تین دن اور رات خوب بارش ہوئی۔ تیسرے روز ملٹری کے ٹرک اور 20 یا 25 چوہڑے لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے راجپورہ سے آئے۔ بلڈوزر کی مدد سے بہت گہرے گڑھے کھودے گئے اور تمام لاشیں ان میں دبا دی گئیں۔ گاؤں کے کنوؤں کی لاشیں بھی مشک دینے لگ گئی تھیں، ان کنوؤں کو بھی مٹی سے ڈھک دیا گیا۔ براس وہ بدنصیب گاؤں تھا کہ جہاں ہزاروں بندوں میں سے کوئی مرد، عورت، بچہ، بڑھا بچ کر نہیں جا سکا۔"

پاکستانی زائرین براس پہنچے۔ گاؤں کے چاروں طرف کھیتوں میں گندم کے ہرے بھرے کھیت تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے۔ کھیتوں کے کناروں پر اور آس پاس درختوں نے موسم بہار کی آمد کے ساتھ دھانی لباس پہنا ہوا تھا، بڑا خوبصورت منظر تھا۔

نہ جانے کتنے تلاطم سمیٹے بیٹھی ہے
یہ خاک گل جسے سرمایہ بہار کہیں

داتا کی نگری سے گلاب سے پھولوں کی کئی ٹوکریاں چار من چلے زائر، خواجہ محمد حفظ نواز ہاشمی، خواجہ عبدالمجید اور میاں یعقوب بھٹی اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ پاکستان کے عطر بیز پھولوں کا نذرانہ سرہند شریف کی درگاہوں کے علاوہ براس کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں کی مشہد گاہوں پر پیش کردہ گلہائے سرخ ہمارے درد پنہاں کی ایک گلبانگ شرح اور سرشک خون کی پیہم درفشانی کا مظہر تھا۔

گل فشانی کرتے ہوئے ہر آنکھ سے آنسوؤں کا ایک سیل بہہ رہا تھا، نظر جھلائی تو چشم تصور نے ان پاکباز دوشیزاؤں، دلہنوں اور ماؤں کے نور الایمان سے روشن چہرے دیکھے، دل کی دھڑکن میں انہی کی اللہ اللہ والی الوداعی صدا کا آہنگ سنائی دیا اور رفتہ رفتہ زائر کے معدن دل میں شوکت اسلام فی الہند کے ارمان سسکنے لگے۔

عفت آرا ملت بیضا کی خوش گل خاک سے
نور برسائے ہوئے پیدا جہاں ہوں گے بہت

شہیدان رہ حق کی عظمت کا خیال دل و دماغ پر پوری طرح محیط ہو گیا اور سارے اندھیارے گوشوں میں چراغاں کے موتیوں کی لڑی پروئی گئی۔

زائرین اب اس احاطہ میں جمع ہو گئے تھے جہاں اللہ تعالیٰ کے فرستادہ دو نبی محو استراحت ہیں۔ قاری خوشی محمد صاحب نے وجد آفرین قرأت سے روحوں کو گرما دیا۔ ایک سماں بندھ گیا۔ احاطے کے باہر گاؤں بھر کے مرد عورتیں اور بچے کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ سب اسے پہلے کہاں ہوا تھا۔ وہ بہت ششدر و حیران دکھائی دیئے۔ قرأت کے بعد صاحبزادہ فیض الحسن فیضی صاحب اور پیر خادم حسین نے دعا کرائی۔ دعا میں التجاء اور کیفیت قلوب کا اظہار ایسے پیرایہ میں ادا ہوا کہ حاضرین بے اختیار رونے لگے یا اللہ! ہمارے گناہوں کو براس کی ان عفت مآب بچیوں کی ناموس دین کے لئے دی ہوئی قربانی کے طفیل بخش دے۔ ہماری بہنوں بیٹیوں کو عفت کا وہی جذبہ عطا کر دے" ہم سب تو گریہ وزاری کر ہی رہے تھے۔ اہل گاؤں بھی رو رہے تھے۔ واللہ! کوئی الفاظ اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتے۔

اسی اثناء میں دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹی چھوٹی تین بدلیاں آسمان پر نمودار ہوئیں، شہداء کی قبور اور احاطہ انبیاء کے اوپر سے گزریں۔ چند بوندیں گریں، ہوا کا ایک جھونکا آیا، درختوں کے پتے ہلنے لگے اور شاخیں جھکیں، یوں محسوس ہوا کہ ارواح مقدسہ کا نزول ہو رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد بدلیاں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ ہوا ساکت ہو گئی۔ دھوپ کی تمازت پھر سے محسوس ہونے لگی۔ براس، اسے ہمارے شہیدوں کے خوابیدہ جذبات کی امین سرزمین ہمارا الوداعی سلام لے۔

شہیدوں کی یاد میں اب خاموشی اختیار کرتا ہوں۔

......☆......

تحصیل گھنور کے مسلمانوں کی داستانِ غم

شیخ حکومت حسین قریشی حال مقیم سرگودھا رئیس موضع ماہڑوسب تحصیل گھنور (ضلع پٹیالہ) نے اپنے علاقہ میں سکھ فوج کے مظالم اور مسلمانوں کی مدافعانہ کارروائی کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

14 اگست 1947ء سے ایک ماہ پہلے سے ہی ہندوؤں سکھوں نے ریل سے سفر کرنے والے مسلمان مسافروں پر حملے کرنے اور انہیں قتل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ دیہات میں کافی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ سکھ بھالے اور تلواریں دیہات کے لوہاروں سے بنوا رہے تھے جن دیہات میں مسلمان اقلیت میں تھے وہ بے حد پریشان اور سراسیمہ تھے۔ اکثر دیہاتی مسلمان اپنے گاؤں چھوڑ کر قصبات اور شہروں میں منتقل ہونے لگے۔ زیادہ تر اقلیتی مسلمان شہر پٹیالہ کو راجدھانی اور بڑا شہر سمجھ کر محفوظ جگہ تصور کرتے ہوئے وہاں منتقل ہونے لگے۔ اسی دوران مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد سے سکھ اور ہندو شرنارتھی ریاست پٹیالہ میں آ کر مقیم ہو گئے۔ انہوں نے مقامی غیر مسلم آبادی کو مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں ڈھائے گئے مظالم کی مبالغہ آمیز کہانیاں سنا سنا کر اشتعال پیدا کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مقامی غیر مسلم آبادی، شرنارتھی اور خود ریاستی سرکار صدیوں سے وہاں بسنے والے مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

سکھوں نے پوری ریاست میں قاتل جتھوں کی تنظیم اس طرح کی کہ ہر چھوٹے گاؤں سے پانچ اور بڑے گاؤں سے دس جوان لئے اور انہیں ہتھیار دیئے گئے۔ دو صد اور تین صد ایسے لوگوں کا ایک منظم جتھہ تیار کیا گیا اور ایک آدمی بالعموم ریٹائرڈ فوجی سکھ اس کا

جتھیدار مقرر کیا گیا۔ قتل و غارت کا پروگرام مرتب ہو گیا، صرف اس پر عملدرآمد کا سگنل دیا جانا باقی رہ گیا۔

سب تحصیل گھنور (ضلع پٹیالہ) کی جغرافیائی سرحدیں ضلع انبالہ اور ضلع کرنال سے ملتی تھیں۔ میرے اپنے گاؤں ماہڑو سے متصل ایک بیڑ (جنگل) تھا جو راجہ پٹیالہ کی شکار گاہ تھی۔ ماہڑو کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ راجہ کے بیڑ میں مسلمان اپنے مویشی چرایا کرتے اور کبھی کبھار چوری چھپے ہرنوں کا شکار کر لیا کرتے تھے۔ حاکم پٹیالہ کو یہ بہت ناگوار تھا۔ اوائل اگست 1947ء میں پٹیالہ سرکار نے 45 مسلح فوجیوں پر مشتمل ایک پارٹی ماہڑو بھیجی۔ یہ لوگ علی الصبح گاؤں میں داخل ہوئے اور ایک سرے سے دوسرے کونے تک گاؤں کو لوٹنا اور دیہاتیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ گاؤں کے اکثر لوگ اپنے کھیتوں پر گئے ہوئے تھے وہ فائر کی آوازیں سن کر گاؤں کی طرف بھاگے، گاؤں کے شکاری اپنی بندوقیں لے کر ایک پختہ مکان کے اونچے چوبارہ پر مورچہ بند ہو گئے۔ اس کے سامنے گاؤں کی مسجد تھی جس کی چھت پر سکھ فوجیوں نے مشین گن فٹ کر رکھی تھی اور وقفے وقفے سے وہاں سے وہ فائر کرتے تھے۔ جواباً چوبارہ سے مسلمان بارہ بور کی بندوق سے فائر کرتے تھے۔ مسجد کی چھت سے فائر کرنے والے سکھ کے ہلمٹ کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کو ایک ترکیب یہ سوجھی کہ ایک آدمی مورچہ میں کھڑا ہو کر گر گیا اور مصنوعی چیخ ماری کہ مشین گن والا سکھ ذرا اونچا ہو کر جونہی کھڑا ہوا تو اس کو میں نے لے لیا۔ دوسرا نشانہ لگائے بیٹھا تھا کہ اس پر فائر کر کے اسے ختم کیا۔ مسجد کے عقب میں جو سکھ فوجی موجود تھے انہوں نے چھت پر پہنچ کر پھر سے مشین گن سنبھالنے کی پوری کوشش کی لیکن ایک ایک کر کے وہ بھی مسلمانوں کی بندوقوں کا نشانہ بنتے رہے اور بارہ فوجیوں کی قربانی دے کر فائر کرتے ہوئے بھاگ نکلے۔ اس واقعہ کے آخیر اگست 1947ء تک ہمارے گاؤں پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔

''موقع ماہڑو'' شہر پٹیالہ سے 15 میل راجپورہ سے 18 میل اور انبالہ سے 15 میل کے فاصلہ پر واقعہ تھا۔ اس علاقہ میں کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ سب راستے کچے تھے۔ اگست ستمبر میں بارشوں کا زور تھا۔ ٹرک وغیرہ نہ چل سکتے تھے۔ آس پاس کے تمام راستے اور

گزرگاہیں سکھوں نے مسدود کر رکھی تھیں۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے والا آدمی ان کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تھا۔ مسلمان اپنے دیہات میں ایک طرح سے قید کر دیئے گئے تھے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے ماہڑو میں تمام آبادی مسلمانوں کی تھی چند ایک گھر ہندو چمار اور چوہڑوں کے تھے لیکن مسلمانوں نے برے حالات میں بھی ان کو تنگ نہیں کیا۔ ماہڑو کے نوجوان ان دنوں ساری ساری رات جاگ کر پہرہ دیتے تھے۔ ایک روز پندرہ مسلمان پٹیالہ شہر سے بھاگ کر ماہڑو وارد ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ شہر کی مسلمان آبادی سکھ فوجیوں کے گھیرے میں ہے۔ شہر سے اگر کوئی مسلمان باہر جانے کی کوشش کرتا ہے، اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں سے تمام اسلحہ سرکار نے چھین لیا ہے۔ شہر میں اکا دکا مسلمان گھر سے نکلے تو اسے گولی ماردی جاتی ہے اور یہ سب کارروائی مہاراجہ پٹیالہ کے ایماء پر ہو رہی ہے۔ یہ پندرہ لوگ اندھیری رات میں بڑے گندے نالے سے ہوتے ہوئے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس خبر نے سب میں مایوسی دوڑادی۔ ہم لوگ اکالی سکھوں کا خوب مقابلہ کر سکتے تھے ہمارے پاس اسلحہ برچھے، بلم، تلوار اور بھالے سبھی کچھ تھے لیکن حکومت کا مقابلہ اور وہ بھی ٹرینڈ فوج کا ہمارے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ فیصلہ یہ کیا گیا کہ اب گاؤں چھوڑ دینا چاہئے۔ ہم چلے تو راستہ میں جو مسلم دیہات تھے وہ بھی ہمارے قافلہ میں شریک ہو گئے۔ راستہ بارشوں کی وجہ سے بے حد خراب اور دشوار تھا۔ پانچ کوس کا فاصلہ طے کرنے میں دو دن لگ گئے۔ انبالہ ضلع کی سرحد میں داخل ہوئے وہاں ایک ہی بلاک میں پندرہ مسلم دیہات اکٹھے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے کھلے آسمان تلے یہ ہماری پہلی پناہ گاہ تھی۔ اردگرد کے بہت سے دیہات سے مسلمان بچتے بچاتے، مقابلہ کرتے ہوئے اسی پڑاؤ میں آن پہنچے اور کم و بیش ستر ہزار نفوس ایک بڑے قافلے کی شکل میں یہاں پناہ گزیں تھے۔ موضع میسنگن (Mossingon) ماہڑو سے پانچ کوس کے فاصلہ پر تھا وہاں کے لوگ بھی ہمارے قافلہ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ سکھ ملٹری نے پہلے سنور Sanore پر حملہ کیا۔ یہاں کی پٹھان آبادی نے بڑا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ملٹری پسپا ہوئی تو اہل سنور میسنگن منتقل ہو گئے، راستہ میں سکھ جتھوں سے مقابلہ میں کافی جانی نقصان

ہوا۔ موضع دھانڈیاں کے مسلمان بھی لڑتے مرتے مسینگن جا پہنچے۔ ہمارے قافلہ کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ آگے راستہ لینے کے لئے ہمیں جارحانہ قدم اٹھانا چاہئے چنانچہ نوجوانوں کو منظم کر کے قریبی سکھ دیہات پر حملہ کر دیا۔ مقابلہ پر آنے والے سکھوں کو تو قتل کر دیا گیا لیکن نعرۂ تکبیر کی آواز سن کر جو سکھ گنے کے کھیتوں میں چھپ گئے، ان کی جانیں البتہ بچ گئیں۔

موضع مسینگن میں مسلمانوں کا بڑا اجتماع سکھوں کے لئے بڑا سوہان روح تھا۔ اکالی سینا کے جتھے داروں نے منولہ (ضلع انبالہ) میں دس ہزار مسلح سکھوں کو حملہ کے لئے اکٹھا کیا، لیکن وہ فوجی امداد کے بغیر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پہلے تو ضلع انبالہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر گریوال سے رجوع کیا لیکن اس نے امداد سے انکار کیا، پھر انہوں نے پٹیالہ سے رابطہ کیا اور وہاں سے پچاس مسلح فوجیوں کا دستہ سکھوں کی اعانت کے لئے پہنچ گیا۔ اہل مسینگن کو اس کا بروقت علم ہو گیا۔ بیشتر آبادی کھیتوں میں چھپ گئی لیکن کوئی ایک سو کے لگ بھگ گاؤں سے باہر قافلہ کیمپ پہنچنے کی کوشش میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

پٹیالہ آرمی کے دستہ کی سرکردگی میں تقریباً دس ہزار مسلح سکھوں نے موضع مسینگن کا محاصرہ کر کے حملہ شروع کر دیا۔ کوئی درجن بھر سکھ فوجی درختوں پر چڑھ گئے اور فائر کھول دیا۔ جتھے والے سکھوں نے گاؤں کے اندر داخل ہونے کی کوشش میں ایڈوانس کیا۔ مسلمان اہل دیہہ مورچے بنا کر فائر کرنے لگے۔ چار چار یا پانچ پانچ سکھوں کی ٹولی گاؤں کے باہر والی تنگ گلی کے اندر داخل ہونے کی کوشش میں آگے بڑھتے اور بندوق کے رینج میں آتے تو مسلمان فائر کھول کر ان میں سے ایک دو کو وہیں ڈھیر کر دیتے تھے جب ان کے ساتھی لاش اٹھانے کے لئے بڑھتے تو پھر ان پر فائر کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ دن بھر رہا۔ شام تک تقریباً پانچ صد سکھ مارے گئے لیکن اللہ کا کرنا کوئی مسلمان شہید نہ ہوا۔ سورج چھپنے لگا تو مسلمانوں نے نعرۂ ہائے تکبیر لگائے گھبرا کر سکھ اپنی لاشوں کو چھوڑ کر بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کی پسپائی کے وقت کافی افراد کو مارا۔ گاؤں کے باہر اپلوں کے ڈھیروں کو آگ لگائی ہوئی تھی اسی میں

مردہ سکھوں کو جلا دیا گیا، پھر گاؤں کے لوگوں نے یہ احساس کیا کہ کل کو سکھ شاید زیادہ ملٹری فورس کے ساتھ انتقام لینے کی غرض سے آئیں گے چنانچہ گاؤں کے تمام مسلمانوں نے آدھی رات گئے اپنے گاؤں کو خیر باد کہا اور ہمارے والے قافلہ کیمپ میں بخیریت پہنچ گئے۔

ہمارے کیمپ میں تھوڑی دور ایک موضع ہڑانہ تھا جہاں مسلمانوں اور سکھوں کی آبادی مخلوط اور نصفا نصف تھی وہاں کے سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ نہ لڑنے کا سمجھوتہ کیا۔ دوسرے روز مسلمانوں سے کہا کہ ساتھ والے گاؤں سے ایک جتھہ تمہیں حفاظت کے ساتھ قلعہ بہادر گڑھ کیمپ جو شہر پٹیالہ سے چار میل پر واقعہ ہے اور اسے اورنگزیب عالمگیر کے رضاعی بھائی نواب سیف خاں کو کہ نے تعمیر کیا تھا، پہنچا دے گا۔ ریاست پٹیالہ کی انتظامیہ نے اس قلعہ کے اندر موت کے منہ سے بچ جانے والے شہر پٹیالہ اور نواحی دیہات کے مسلمانوں کے لئے کیمپ بنایا تھا۔ کیمپ سے کوئی آٹھ ہزار نفوس ماہ دسمبر 1947ء میں ریلوے ٹرینوں کے ذریعے پاکستان روانہ کیے گئے تھے۔ قافلہ کیمپ میں ہم لوگ رات بھر جاگتے اور پہرہ دیتے رہتے۔ ایک ماہ سے زائد عرصہ اس طرح گزرا۔ ہم لوگ تنگ آ گئے، سب لوگ انبالہ کے راستہ قافلہ کی شکل میں پاکستان جانے کے لئے مضطرب تھے۔ کیمپ کے معتبر اور معزز لوگوں نے باہمی مشورہ سے طے کیا کہ چار گھوڑ سوار آدمی انبالہ جائیں اور وہاں جا کر لیزان آفیسر سے ملیں تا کہ قافلہ کا پاکستان جانے کے لئے پروگرام طے کیا جائے اور جب تک یہ انتظام نہیں ہو جاتا۔ مسلم ملٹری کو ہمارے کیمپ کی حفاظت پر مامور کیا جائے چنانچہ مسلمان ملٹری کی حفاظت میں کیمپ کے لوگ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

......☆......

تقسیم پنجاب اور پٹیالہ

جسٹس سید جمیل حسین رضوی (مرحوم)

1945ء میں پٹیالہ مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ شیخ وزیر محمد مرحوم ایڈووکیٹ کو اس کا صدر چنا گیا۔ مجلس عاملہ میں ڈاکٹر کیپٹن عبدالحفیظ مرحوم، شیخ حامد حسین فاروقی ایڈووکیٹ، ڈاکٹر عبدالرحیم مرحوم، محمد بشیر مرحوم اور محمد نذیر مرحوم شامل تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی ارکان تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے۔ متذکرہ بالا افراد میں سے سوائے میرے اور فاروقی صاحب کے باقی تمام کو 6 ستمبر اور 8 ستمبر 1947ء کے درمیان شہید کر دیا گیا۔ (سردار علی احمدؒ نے بڑی حکمت سے اپنی جان بچائی۔)

پٹیالہ مسلم لیگ بڑی منظم جماعت تھی۔ 1946ء میں اسی جماعت کی دعوت پر اس وقت کے آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کے صدر منظر عالم اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ پٹیالہ تشریف لائے۔ منظر عالم اور ان کے ساتھیوں کو جلوس کی صورت میں جلسہ گاہ تک لے جایا گیا۔ راستے میں مقامی مسلم لیگ کے عہدیدار اور کارکنان پورے جوش و خروش سے نعرے لگاتے رہے "لے کے رہیں گے پاکستان۔"

منظر عالم نے جلسے سے خطاب کیا اور لوگوں کے جذبے اور جوان ہو گئے۔ مقامی مسلم لیگ کے صدر وزیر محمد نے بھی تقریر کی، جلسے کی کارروائی کے دوران میں اور آخر میں "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے بڑی دیر تک گونجتے رہے۔

1- 20 نومبر 2006ء کو لاہور میں وفات پائی۔

اسی سال ملتان سے ایک اور جوشیلے مسلم لیگی جناب عطاء اللہ جہانیاں پٹیالہ تشریف لائے۔ دراصل وہ لدھیانہ مسلم لیگ کے ایک جلسے سے خطاب کرنے آئے تھے کہ ہم نے بھی انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی۔ عشاء کی نماز کے بعد انہوں نے اپنی تقریر شروع کی اور ان تمام اسباب کا تفصیل سے جائزہ لیا جن کی بناء پر مسلمان ایک الگ ملک کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور ہمیں متحد ہو کر پاکستان کی تشکیل کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔

میں نے جلسے کی صدارت کی تھی۔ میں نے آخر میں شدومد سے مطالبہ پاکستان کی حمایت کی۔

میں یہاں ایک اور جلسے کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جو تحریک پاکستان کی حمایت میں منعقد ہوا۔ یہ جلسہ صرف خواتین تک محدود تھا۔ بہار کے فسادات کے فوراً بعد بیگم سلمیٰ تصدیق حسین دو اور خواتین کے ساتھ پٹیالہ تشریف لائیں۔ اس جلسے میں خواتین کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ جلسے میں بیگم تصدق حسین نے بہار کے فسادات میں شہید ہونے والی خواتین کے خون سے لتھڑے ہوئے کپڑے اور سر کے بال دکھا کر اپیل کی کہ جب تک مسلمانوں کا علیحدہ وطن نہیں بن جاتا، عدم تحفظ کی تلوار سر پر لٹکتی رہے گی۔ اس جلسے میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کی متفقہ قرارداد منظور کر لی گئی اور وہ اس حقیقت کے باوجود کہ پاکستان کی سرحدیں پٹیالہ تک وسیع نہ ہو سکتی تھیں لیکن پاکستان کی تشکیل کی حمایت تو کسی بھی علاقے میں رہنے والے مسلمان کا فرض تھا۔ بہر حال پاکستان بنا تو پٹیالہ کے مسلمانوں کو بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ (بیگم سلمیٰ تصدیق حسین کا بیان آگے آئے گا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''آزادی کا سفر'' میں اپنی پٹیالہ آمد کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔)

14 اگست 1947ء کو ملک تقسیم ہو گیا۔ ہم نے قائداعظمؒ، جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کی تقریریں ریڈیو پر سنیں۔ اگلے دن میں بار روم میں بیٹھا تھا کہ سردار کرتار سنگھ ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ) جو اکالی لیڈر بھی تھا، میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''سید تم

کب پاکستان جاؤ گے؟" میں نے جواب دیا۔"میں پاکستان کیوں جاؤں، مجھے وہاں سکھوں جیسے مجرمانہ ذہن رکھنے والے موکل نہ مل سکیں گے۔"

اس نے کہا۔"تمہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

میں نے سوچا کہ وہ محض مذاق کے موڈ میں ہے اور اس نے میری بات کا برا نہیں منایا۔ دن گزرتے رہے اور شہر میں کشیدگی میں اضافہ ہوتا رہا اگرچہ سرکاری حکام ہمیں تسلی دیتے رہے کہ یہاں مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں اور ہم بھی اتنے سادہ نکلے کہ ان طفل تسلیوں پر ایمان لے آئے۔ ہمارے سکھ دوست اکثر شکوہ کرتے کہ پنجاب کے مسلم (پاکستانی) اکثریتی علاقوں میں سکھوں پر مظالم ہو رہے ہیں اور ہم جواب میں کہتے کہ "امرتسر اور پٹیالہ کے درمیانی علاقے میں مسلمانوں پر اس سے بھی زیادہ ظلم توڑے جا رہے ہیں۔"

30 اگست کے قریب ہمیں اطلاع ملی کہ پٹیالہ کے دور دراز علاقوں مثلاً بھٹنڈہ، مانسہ اور برنالہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ مانسہ سے ایک مسلمان سب پوسٹ ماسٹر بچ نکلنے میں کامیاب ہوا اور اس نے لرزہ خیز داستانیں سنائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ "قصبے کا نامی گرامی وکیل محمد علی بی اے۔ ایل ایل بی اور اس کا پورا خاندان بھی تہ تیغ کر دیا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کو اغواء کر کے ان کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں۔"

ہم نے احتجاجی تاریں مہاراجہ کے نام ارسال کیں لیکن کسی نے ان پر کان نہ دھرا۔ 2 ستمبر 1947ء کو مجھے اپنے چچا سید ذاکر حسین مرحوم کا پیغام ملا کہ میں سمانہ میں ان کے ہاں پہنچ جاؤں۔ میرا خیال تھا کہ صدر مقام ہونے کی وجہ سے پٹیالہ محفوظ مقام ہے۔ خاص طور پر مہاراجہ اور اعلیٰ حکام نے یقین دہانی بھی کرائی تھی چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ سمانہ جا کر اپنے عزیزوں کو پٹیالہ میں آنے کے لئے قائل کروں۔ رات کے آٹھ بجے تھے میں نے بذریعہ کار سمانہ کا رخ کیا۔ ابھی کوئی چار میل سفر طے کیا ہوگا کہ ملٹری سیکرٹری کرنل حامد حسن کا لڑکا محمد افضل خان سامنے سے بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے کار روک لی اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ بس کے ذریعہ سمانہ جا رہا تھا۔ پٹیالہ سے چھ

میل دور سکھوں کے ایک مسلح جتھے نے بس روک کر مسلمانوں کو چن چن کر شہید کرنا شروع کر دیا۔ خود اس نے بھاگ کر جان بچائی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور کار واپس پٹیالہ کی طرف موڑ لی۔ شہر پہنچ کر سیدھا ایس پی بابو سنگھ کے ہاں گیا۔ اس کے سامنے افضل خاں نے بس پر حملے کا سارا قصہ دہرایا۔ بابو سنگھ نے کہا۔ "میں کوتوالی سے تین مسلمان سپاہی آپ کے ساتھ کئے دیتا ہوں۔ آپ سمانہ چلے جائیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "کیا حالات اتنے ہی نازک ہیں کہ ہماری حفاظت صرف مسلمان سپاہی کر سکتے ہیں۔"

بابو سنگھ نے کہا۔ "ایسی بات نہیں، میں تو ذرا احتیاط کی خاطر یہ تجویز پیش کی تھی۔"

بہر حال کوتوالی سے مجھے ایک مسلمان ایک سکھ اور ایک ہندو سپاہی حفاظتی دستے کے طور پر مل گئے۔ ہم نے دوبارہ سمانہ کا رخ کیا۔ راستے میں ہمیں کہیں بھی اکالی جتھے کا سامنا نہ ہوا۔ شاید وہ کسی اور طرف چلے گئے تھے۔

گھر پہنچنے پر میں نے اپنے نظریے کے مطابق رشتے داروں کو پٹیالہ جانے کو کہا، لیکن شاید قسمت اچھی تھی انہوں نے میری تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ آس پاس کے دیہات سے ہزاروں مسلمان ان کے ہاں اس امید پر جمع ہو گئے ہیں کہ "سمانہ کے سیدوں کے پاس اسلحہ وغیرہ ہے اور وہ دشمنوں کے کسی بھی حملے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس فضا میں اگر وہ خود پٹیالہ چلے گئے تو ان پناہ گزینوں کا سہارا کیا رہے گا؟" آخر طے یہ پایا کہ میں اپنے اہل عیال کو لے کر اگلے دن آ جاؤں۔

رات کو میں پٹیالہ واپس آ گیا۔ شہر سے ایک میل باہر ایک بس کے مسافروں نے میری کار روک لی۔ ان میں کئی چہرے جانے پہچانے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شہر میں فسادات ہو رہے ہیں اور وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے کہا۔ "میرے تو وہاں بچے ہیں۔ میں ضرور جاؤں گا۔" بہر حال میں نے یہ احتیاط کی کہ مال روڈ سے ریلوے اسٹیشن پہنچا اور پھر سرکلر روڈ سے ہوتے ہوئے سیف آبادی دروازے تک بحفاظت پہنچ گیا

وہاں سے میرا مکان صرف سو گز کے فاصلے پر تھا۔

راستے میں مجھے پتہ چلا کہ شہر میں کسی مقام پر ہندوؤں نے بم بنانے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ غلطی سے بم پھٹ گیا اور ایک ہندو چل بسا۔ ہندوؤں نے اس واقعہ کو غلط رنگ دیا اور یہ کہہ کر کہ مسلمانوں نے بم پھینکا ہے، شہر بھر میں تشدد شروع کر دیا۔ کئی مسلمان ہنگاموں میں زخمی ہوئے اور ایک ہسپتال میں شہید ہو گیا۔

تاہم شہر میں کرفیو نافذ ہونے سے امن و امان بحال ہو گیا جب میں گھر پہنچا تو فوج اور پولیس ٹرکوں میں گشت کر رہی تھی جس کسی کے پاس نیزہ بھالا یا کوئی اور ہتھیار دیکھتی، اس سے یہ اسلحہ چھین لیا جاتا۔ مسلمان گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ہندو اور سکھ شہر میں دندنا رہے تھے۔ فوج اور پولیس کی فوری کارروائی سے ہم نے محسوس کیا کہ انتظامیہ اپنے وعدوں پر قائم ہے۔

رات اسی تناؤ کی کیفیت میں گزری اور ہم لوگوں نے باری باری اپنے گھروں پر پہرہ دیا۔ اگلے دن میں نے سمانہ جانے کی تیاری کی تو وہ لوگ جو میرے گھر میں جمع ہو گئے تھے۔ میرے ساتھ ہو لئے۔ یہ دو بسوں پر سوار تھے اور میں اپنی کار پر تھا۔ سہ پہر کے چار بجے تھے۔ اس وقت ہندوؤں کی ارتھی کا جلوس جا رہا تھا اور راستے میں جو مسلمان ملتا، اسے زخمی یا ہلاک کر دیا جاتا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ "مسلمانوں کا وجود مٹا دینا چاہیے۔" جب ہم پٹیالہ سے نکلے تو چھاؤنی میں فوجی ٹرک تیار ہو رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شہر میں کرفیو نافذ کرنے جا رہے ہیں لیکن اگلی صبح کرفیو کی دھجیاں اڑا دی گئیں اور وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

ہم سب بحفاظت سمانہ پہنچ گئے۔ ابھی میں نہا دھو کر فارغ ہوا تھا کہ ایک سپاہی آیا اس نے کہا کہ پولیس انسپکٹر تیجہ سنگھ مجھے بلا رہا ہے۔ میں فوراً تھانے گیا تو سردار نے مجھے الگ کمرے میں لے جا کر کہا۔ "میر صاحب! آپ بڑے خوش قسمت آدمی ہیں۔ آپ کا پورا خاندان تہ تیغ ہو سکتا تھا کیونکہ مسلح سکھوں سے بھرے ہوئے دو ٹرک پٹیالہ ہی سے آپ کے پیچھے لگ گئے تھے لیکن آپ نے انتہائی تیز رفتاری سے کار چلا کر ان کے عزائم کو ناکام

بنا دیا۔" سردار تیجہ سنگھ نے مجھے مزید بتایا کہ "سمانہ میں فسادات کا کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر کچھ ہو جائے تو میں اپنے خاندان کو لے کر تھانے آسکتا ہوں۔"

4 ستمبر 1947ء کو سردار تیجہ سنگھ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کا ایک اجلاس بلایا۔ سکھ نمائندہ اس لئے موجود نہ تھا کہ یہاں ان کی آبادی ہی نہ تھی۔ یہ اجلاس ہندوؤں کی درخواست پر بلایا گیا تھا کیونکہ وہ اپنی اقلیت کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔ یہاں اکثر زمیندار مسلمان تھے۔ انہوں نے اسلحے کے لائسنس لئے ہوئے تھے۔ ہمیں مقامی غیر مسلموں میں امن و امان بحال رکھنے کے اقدامات پر غور کیا گیا۔ میں نے ہندوؤں کو یقین دہانی کرائی کہ "ہماری طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔"

اسی رات دس بجے میرے چچا نے مجھے بلا کر بتایا کہ "غلہ منڈی میں کئی مسلح فوجی ٹرک موجود ہیں مجھے سردار تیجہ سنگھ سے جا کر ان کے آنے کا سبب پوچھنا چاہئے کہ ان کے آنے کا سبب کیا ہے۔" میں فوراً تھانے گیا اور سکھ سنتری سے کہا کہ وہ مجھے سردار صاحب سے ملائے۔ سنتری تھانے کے اندر گیا اور پھر واپس آ کر اس نے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ تیجہ سنگھ آدھ گھنٹے بعد باہر نکلا۔ اس دوران میں سکھ سنتری مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ میں نے بھی اپنی بندوق کی لبلبی پر انگلیاں رکھی ہوئی تھیں تاکہ کسی بھی صورتحال سے نبٹ سکوں۔ تیجہ سنگھ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس سے فوج کے آمد کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اگرچہ وہ ہندوؤں کو مکمل یقین دہانی کرا چکا تھا لیکن پھر بھی وہ آئی جی کے پاس پٹیالہ چلے گئے اور فوج کو اپنی حفاظت کے لئے لے آئے۔ ساتھ ہی اس نے انہیں موٹی سی گالی دی اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "میر صاحب اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں صرف ایک بجے تک آپ کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد آپ لوگ پٹیالہ ریاست کی حدود میں زندہ نہیں رہ سکتے۔" اس کا کہنا تھا۔ "ہمیں فوری طور پر کرنال کا رخ کرنا چاہئے وہاں سے دہلی پہنچ جائیں اور پھر بذریعہ طیارہ لاہور جا سکتے ہیں۔" اس نے مزید تفصیلات سے پردہ اٹھانے سے انکار کر دیا اور بس اتنا کہا کہ اب ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔" میں نے پوچھا۔ "میرے خاندان کا کیا بنے گا؟" کہنے

لگا۔ ”انہیں بھی ساتھ کار میں بٹھا کر لے جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے خاندان سے مطلب صرف میرے بچے نہیں، بلکہ میرے تمام رشتہ دار ہیں۔ سردار نے جواب دیا۔ ”انہیں خدا کی حفاظت پر چھوڑ جاؤ، ممکن ہے میں انہیں بچالوں لیکن آپ کی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا“ فوراً اپنے چچا کے پاس آیا اور اسے حقیقت کہہ سنائی۔

آدھ گھنٹے کی گرما گرم بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میں پیدل سمانہ سے نکلوں اور میرا ڈرائیور، میرے دوست نیاز علی خاں اور میری زمینوں کے منیجر عبدالعزیز کو لے کر آئے اور ہم ریاست سے باہر ایک دوسرے سے ملیں۔ آدھی رات کے وقت میں رائفل سے مسلح ہو کر سمانہ سے نکلا۔ میرے ساتھ تین مزارعے بھی تھے جنہوں نے دفاع کی خاطر بھالے وغیرہ لے لئے تھے۔ ہم کھیتوں سے ہوتے ہوئے چلتے رہے۔ راستے میں ایک نہر کو تیر کر پار کیا اور برطانوی ہند کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ چار بجے صبح ہم طے شدہ مقام پر پہنچ گئے وہاں کار بھی موجود تھی۔ میرا منیجر اور مزارعے سمانہ واپس چلے گئے اور باقی ہم تین آدمیوں نے کار کے ذریعہ گوہلہ کا رخ کیا۔

یہ برسات کا موسم تھا اور کچی سڑک جگہ جگہ سے دلدل بن گئی تھی۔ ابھی گوہلہ دو میل دور ہی تھا کہ کار دلدل میں دھنس گئی اور ہم کوشش کے باوجود اسے باہر نہ نکال سکے۔ ہم نے کار وہیں چھوڑی اور پیدل گوہلہ کی طرف چل دیئے۔ گوہلہ پہنچ کر ہم کاظم حسین ذیلدار کے گھر گئے۔ اس کے بھائی مسلم حسین اور دوسرے رشتہ داروں نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ سب لوگ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میرے ڈرائیور نے چار پانچ آدمی اپنے ساتھ لیے اور ان کی مدد سے کار دلدل سے نکال کر گوہلہ لے آیا۔

پچھلی رات فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جہاں تک آدمیوں کا تعلق ہے وہ سمانہ سے نہیں نکلیں گے کیونکہ ان پر دوسرے پناہ گزینوں کی حفاظت کی ذمہ داری عائد تھی لیکن عورتیں اور بچے دو بسوں کے ذریعے گوہلہ کے ذریعے لاہور پہنچ جائیں گے۔ میں سارا دن انتظار کرتا رہا مگر کوئی شخص نمودار نہ ہوا۔ اس سے مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں فوج کی مدد سے غنڈوں نے سمانہ پر حملہ ہی نہ کر دیا ہو۔ میں رات بھر ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اگلی صبح پھر کوئی خبر نہ ملی۔

گوہلہ سے سمانہ کا فاصلہ بارہ میل تھا۔ میرے ڈرائیور نے پیشکش کی کہ وہ سائیکل پر جا کر صورتحال کا پتہ کرتا ہے چنانچہ وہ چلا گیا اور جب شام تک واپس نہ آیا تو میرا دوست نیاز علی خان دوسرے سائیکل پر سمانہ چل دیا۔ دوسری رات بھی گہرے کرب میں مبتلا رہا اور پلک تک نہ جھپک سکا۔ بعض ہندوؤں نے گولہ کے ہندو تحصیلدار سے یہ شکایت کی کہ میں اسلحے سے لیس شہر میں کیوں موجود ہوں۔ میں اور مسلم حسین تحصیلدار کے سامنے وضاحت کرنے لگے۔ میں نے بتایا کہ مجھے اپنے اہل وعیال کا انتظار ہے جونہی وہ آ جائیں گے، ہم چلے جائیں گے، ہندوؤں کو خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگلے روز میرا ڈرائیور واپس آ گیا۔ وہ پندرہ روپے فی گیلن کے حساب سے کہیں سے چار گیلن پٹرول حاصل کر لایا تھا حالانکہ سرکاری ریٹ 19 پیسے تھا۔ وہ میرے چچا کا خط بھی لایا جس پر لکھا تھا کہ میرے آنے کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو میرے پیچھے نہ بھیجا جائے کیونکہ دہلی کا راستہ بڑا خطرناک تھا۔ اس کے بجائے میں لاہور پہنچ کر پاکستانی فوج کی مدد سے ان کا انخلاء عمل میں لاؤں۔

میں بذریعہ کار کیتھل کے راستے کرنال کی طرف روانہ ہوا اگرچہ یہ راستہ بھی خراب تھا مگر خوش قسمتی سے کار کہیں نہ پھنسی۔ ہمیں کئی اکالی جتھے ضرور ملے لیکن چونکہ اس زمانے میں نجی کاریں بہت کم تھیں اور زیادہ تر سرکاری حکام ہی کاریں استعمال کرتے تھے۔ میں نے خاکی وردی پہن رکھی تھی اور رائفل کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ نیاز علی خان بھی پچھلی سیٹ پر مسلح بیٹھا تھا، اس لئے ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ کرنال پہنچ کر میں اپنے دوست نوابزادہ نعمت علی خان کے گھر گیا۔ اس کا گھر شہر کے وسط میں تھا جب میں مکان سے کچھ فاصلے پر تھا تو دیکھا کہ سکھوں کا ایک جتھا نیزوں اور بھالوں سے مسلح کھڑا ہے۔ بعض کے پاس رائفلیں بھی تھیں اور وہ بڑی خونی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں نے مزید آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار موڑ کر نواب صادق علی کے بنگلے پر لے جائے۔ وہ نوابزادہ لیاقت علی خان (پاکستان کے پہلے وزیراعظم) کے بڑے بھائی تھے۔ یہ بھی ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نوابزادہ نعمت علی خاں کے

گھر نہ رہے۔ وہ خود کرنال میں موجود نہ تھے اور دہلی گئے ہوئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا گھر نسبتاً غیر محفوظ تھا۔

کرنال سے ہم ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس قافلے میں لیاقت علی خان کے سب سے بڑے بیٹے نواب احسان علی خان بھی شامل تھے۔ 11 ستمبر 1947ء کو صبح چھ بجے یہ قافلہ کرنال سے نکلا۔ راستے میں جگہ جگہ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور گدھ ان کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ قافلے کی حفاظت کے لئے فوجی ٹرک موجود تھے جو ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ انبالہ چھاؤنی سے آگے سڑک پر پٹیالہ فوج نے ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن ہمارے ساتھ مالیر کوٹلہ کے ولی عہد کے ہونے سے یہاں ہمیں کسی نے نہ روکا۔ ہم باڑہ نامی گاؤں کے قریب سے گزرے جو سرہند شریف کے نزدیک جی ٹی روڈ پر واقع تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کئی گھروں سے شعلے اٹھ رہے ہیں اور گاؤں کی گلیوں میں مسلح سکھ نہتے مسلمانوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم نے بعض سکھوں کو نوجوان مسلم لڑکیوں کو گھسیٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک جگہ بیس لاشیں قطار میں پڑی ہوئی تھیں اور ایک سکھ ان پر جھکا ہوا تھا اور ان کی جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔

لدھیانہ پہنچ کر نواب احسان علی خان نے ملیر کوٹلہ جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن میں اپنے اہل وعیال کو بچانے کے لئے بے چین تھا اور لاہور جانا چاہتا تھا۔ ایک فوجی دستہ جالندھر جا رہا تھا۔ میں نے اس کے کمانڈر سے رابطہ قائم کیا۔ یہ ایک میجر تھا اور اس کی شکل ہندوؤں سے ملتی جلتی تھی جب اس نے جالندھر جانے کی تصدیق کی تو میرے خدشات تقویت پکڑ گئے لیکن میرے سامنے اور کوئی متبادلہ راستہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے لدھیانہ کے مسلمان مہاجر کیمپ کے انچارج سے ملا دے۔ میجر نے کہا کہ کیمپ لدھیانہ شہر سے باہر سڑک کے بالکل قریب ہے اور وہ مجھے اس کے انچارج سے ملا دے گا۔ فوج کے تین ٹرک آگے آگے تھے اور میری کار ان کے پیچھے تھی۔ ہمیں شہر کے اندر سے گزرنا پڑا۔ ہر جگہ مسلح سکھ قتل وغارت اور لوٹ مار میں مصروف نظر آئے۔ شاید وہ مجھ پر بھی ٹوٹ پڑتے لیکن فوجیوں کی مشین گنوں نے انہیں ہم سے دور

رکھا۔ جوں ہی ہم شہر سے باہر نکلے تو مجھے ایک کھلا میدان نظر آیا جہاں مرد اور عورتوں اور بچے بڑی تعداد میں جمع تھے۔ دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میجر نے بتایا کہ یہی مسلمان مہاجر کیمپ ہے۔ میں کار سے اتر کر ایک چھوٹے سے خیمے کی طرف دوڑا جہاں میرے خیال میں کیمپ انچارج کو ہونا چاہیے تھا وہاں ایک داڑھی والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا، ''کیا میں مسلم یونیورسٹی کے سید تجمل حسین کا چھوٹا بھائی ہوں۔'' تو میں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے بھی اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ پروفیسر غلام عباس تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ''میں یہاں تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا اور میرا خاندان کہاں ہے؟''

یہ سوال سن کر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں نے بتایا کہ چھ تاریخ سے مجھے ان کا کچھ پتہ نہیں۔ پٹیالہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہو چکا ہے اور شاید سامانہ بھی دشمنوں کا ہدف بنا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سڑک پر کھڑا ہوا میجر مسلمان ہے یا ہندو۔ وہ میرے ساتھ میجر کے پاس آیا اور اس کا نام پتہ پوچھا۔ میجر نے جواب دیا۔۔ ''میں پاک فوج کا میجر محمد حنیف ہوں'' ''ہمیں یہاں مزید دیر کیے بغیر اور سورج غروب ہونے سے پہلے سرحد پار کر لینی چاہیے۔'' بعد میں سامانہ کے سب مسلمان بخیریت پاکستان پہنچ گئے تھے۔ پنڈت آنند سروب سنگھ ڈی سی نے انسانیت کا ثبوت دیا تھا۔

......☆......

مسلمانوں کو سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق شہید کیا گیا

خواجہ سعید حسن، ایس پی پٹیالہ کے تاثرات

جولائی 1947ء میں پنجاب کے مختلف مقامات سے گڑبڑ اور افراتفری کی خبریں موصول ہونے لگیں تو یہاں بھی حالات کشیدہ ہوگئے۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے امن کمیٹیاں تشکیل دیں اور مسلمانوں کو یقین دلایا کہ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ حکومت ہر طرح سے ان کا تحفظ کرے گی۔" مہاراجہ نے بھی ذاتی طور پر یقین دہانی کرائی کہ "مسلمان مطمئن رہیں، وہ ذاتی طور پر ان کے تحفظ کا ذمہ دار ہے۔"

انسپکٹر جنرل پولیس دلیپ سنگھ نے مجھ سے پوچھا "کیا میں اسے 12 بور کے کارتوسوں کے کچھ بکس مہیا کر سکتا ہوں؟" وہ دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے قبضے میں کتنا اسلحہ ہے۔ میں نے جواب دیا۔ "میرے پاس ضرورت سے زیادہ کچھ نہیں۔"

اگست 1947ء کا آخری ہفتہ تھا۔ میں کلب جا رہا تھا کہ کچھ مسلمانوں نے میری کار روکی اور بتایا کہ پٹیالہ ریلوے سٹیشن پر غیر مسلموں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے اور پولیس خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ میں نے ریلوے سٹیشن کا رخ کیا اور دیکھا کہ ایک مسلمان زخمی حالت میں پلیٹ فارم پر پڑا ہے۔ میں نے اسے ہسپتال پہنچایا لیکن وہ گہرے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا۔ ان دنوں ٹرینوں میں مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے اور انہیں چلتی گاڑیوں سے باہر پھینک دیا جاتا۔ اس سلسلے میں انسپکٹر جنرل پولیس سے

بات کی تو اس نے جواب دیا کہ ریلوے لائن چونکہ برٹش انڈین پولیس کے براہ راست کنٹرول میں ہے اس لئے وہ اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ انہیں دنوں وائسرائے ہند شملہ جا رہے تھے ایس پی پٹیالہ بابو سنگھ کی ڈیوٹی ادھر لگ گئی تو آئی جی نے مجھے کہا کہ میں ان کا چارج سنبھال لوں (تب میں پولیس ٹریننگ سکول پٹیالہ کا پرنسپل تھا) میں دو دن شہر میں گھومتا رہا اور ہر اس فرد کو قابو کر لیا جو کسی بھی ہتھیار سے مسلح نظر آیا، چاہے یہ لاٹھی ہو۔ تیسرے دن بابو سنگھ واپس آ گیا اور اس نے دوبارہ چارج سنبھال لیا۔ اگلے دن 2 ستمبر کو ایک ہندو بم بناتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ غیر مسلموں نے یہ بے پر کی اڑا دی کہ اسے ایک مسلمان نے بم مار کر ہلاک کیا ہے۔ اس بات کو بہانہ بنا کر غیر مسلموں نے بازاروں اور گلیوں میں مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے اور اس کے نتیجے میں ایک مسلمان شہید ہو گیا۔

دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچا دی گئیں اور اگلے روز مسلمان اور غیر مسلم دونوں بھاری تعداد میں ہسپتال میں جمع ہو گئے۔ وہ اپنی اپنی لاش کو جلوس کی صورت میں لے جانا چاہتے تھے۔ یوں اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہسپتال کے احاطہ میں فساد ہو جائے گا۔ ایس پی بابو سنگھ وہاں پہنچا اور اس نے مجھے بھی بلا بھیجا۔ ہسپتال پہنچ کر میں نے دیکھا کہ مسلمان اگرچہ تعداد میں کافی تھے لیکن اکثر و بیشتر غیر مسلح تھے جبکہ غیر مسلموں کے پاس کافی اسلحہ تھا۔ بابو سنگھ نے مجھے کہا کہ میں فریقین کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کروں۔ مسلمانوں نے کہا کہ وہ لڑنے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتے وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ شہید کی لاش کو تجہیز و تکفین کے لئے لے جائیں۔ پھر میں غیر مسلموں کی طرف گیا۔ وہ بدتمیزی پر اترے ہوئے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ وہ بابو سنگھ کی شہ پر مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس سے ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں بابو سنگھ سے یہ کہتے ہوئے چلا آیا کہ ایس پی کی حیثیت سے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ امن و امان کو برقرار رکھے۔ غیر مسلموں نے لاش ہسپتال سے لی اور ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں شمشان بھومی کی طرف چل دیئے۔ راستے میں انہیں جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آیا۔ یہ اس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے بعض مقامات پر مسلمانوں کے مکانات کو بھی نذر آتش کر دیا۔

3 ستمبر کو مسلمانوں پر کھلے عام حملے کئے گئے۔ اگلے روز آئی جی نے مجھے دفتر بلایا اور کہا کہ "میں دو ماہ کی چھٹی پر چلا جاؤں کیونکہ حکومت اس پوزیشن میں نہیں کہ اپنے افسروں کا تحفظ کر سکے" میرے پاس کوئی متبادل نہ تھا چنانچہ چھٹی کی درخواست کی اور گھر چلا آیا۔ اسی روز کرفیو نافذ کر دیا گیا اور آرمی نے فرسٹ سکھ بٹالین کے جی او سی لیفٹیننٹ جنرل بلونت سنگھ کی کمان میں کنٹرول سنبھال لیا۔ سیکنڈ پٹیالہ بٹالین کے تمام مسلمانوں کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ اس دن مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر قتل عام ہوا۔ بچ نکلنے والے مسلمانوں نے پناہ کے لئے میرے گھر کا رخ کیا۔ یہاں جگہ نہ رہی تو میں نے گردو پیش میں بسنے والے رشتہ داروں کے ہاں ان کا بندوبست کیا۔

مرحوم خواجہ محمد ہاشم کا مکان میرے گھر سے کافی دور تھا اور کئی مسلمانوں نے ان کے گھر میں بھی پناہ لی لیکن سکھ اور ہندو فسادی ان کے گھر میں گھس گئے اور تمام مسلمان مردوں کو شہید کر دیا۔ بیشتر خواتین اپنی عزتیں بچانے کے لئے کنویں میں کود گئیں۔ ایک عمر رسیدہ خاتون گرتی پڑتی میرے مکان پر پہنچی اور مجھے اس حملے کے بارے میں بتایا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خواجہ محمد ہاشم اور ان کے بھتیجے خواجہ کاظم حسین پچھواڑے کی کھڑکی کی سلاخیں کاٹ کر باہر کود گئے اور امام باڑہ میں جا چھپے۔ میں نے انہیں تیسرے دن وہاں سے نکالا۔ تین چار دنوں میں دس بارہ ہزار لگ بھگ افراد نے ہمارے گھروں میں پناہ حاصل کی۔ پانی کے کنکشن کاٹ دیئے گئے لیکن خوش قسمتی سے ہمارے گھروں میں کنویں موجود تھے۔ یہ بہت عرصہ سے زیر استعمال نہیں تھے، ہم نے ان کی صفائی کی اور ان کا پانی استعمال کرنے لگے۔ خوراک خریدنے کے لئے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے گوداموں کی تمام گندم تقسیم کر دی۔ فرنیچر اور دروازوں سے چولہے کی لکڑی کا کام لیا گیا۔ ایک صبح میں نے دیکھا کہ ایک ٹرک ہمارے باغ کی دوسری جانب آ کر رکا۔ اس میں سے کچھ فوجی نکلے اور انہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ میں نے وہاں موجود تمام افراد سے کہا کہ وہ لیٹ جائیں۔ فوراً ہی مشین گن کا ایک برسٹ آیا اور دو گولیاں ایک معصوم بچے اور ایک بوڑھی خاتون کے آر پار ہو گئیں۔

میں نے فوراً پرائم منسٹر گردیال سنگھ ہریکا کو فون کیا اور انہوں نے ایک آرمی میجر کو معاملے کی تحقیق کے لئے بھیجا۔ اس کے بعد ہم پر کوئی فائر نہ ہوا اور نہ ہمیں کسی اور طریقہ سے ہراساں کیا گیا۔ آئی جی پولیس نے ایک اے ایس پی کو میرے مکان پر بھیجا کہ وہ مجھ سے اسلحہ واپس لے لے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اسلحہ دینے سے انکار کر دیا کہ جب تک مہاراجہ خود حکم نہ دے، میں اسلحہ نہیں دوں گا کیونکہ میں آرمز ایکٹ سے مستثنیٰ ہوں۔ چوتھے دن ایک ملٹری افسر آیا اور مجھ سے کہا کہ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہادر گڑھ قلعہ میں منتقل ہو جاؤں۔

میں جانتا تھا مرحوم عبدالوحید خاں کے مکان میں پناہ گزین مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا تھا جبکہ 5 ستمبر کو عبدالوحید خاں اور ان کے اہل خانہ کو ان کے بھائی میجر غنی پٹیالہ سے لے گئے تھے چنانچہ میں نے جواب دیا کہ میں ان پناہ گزین بھائیوں کو یوں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ایک دو روز بعد مجھے اجازت مل گئی کہ میں ان پناہ گزینوں کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں کیونکہ اس وقت تک پالیسی بدل گئی تھی اور بچ نکلنے والے مسلمانوں کے لئے بہادر گڑھ قلعہ میں کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ میں یہاں ایک اور واقعہ بھی بیان کرتا چلوں۔ پناہ گزین کیمپ میں منتقلی سے ایک دو روز پہلے کی بات ہے کہ ایک سکھ صوبیدار میجر میرے ہاں آیا اور کہا کہ پٹیالہ سٹیٹ مسلم لیگ کے صدر شیخ وزیر محمد کو پرائم منسٹر نے یاد کیا ہے۔ میں نے شیخ صاحب کو بلایا اور خود بھی ان کے ساتھ ٹرک میں سوار ہو گیا۔ سید محمد رضا ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج پٹیالہ بھی ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صوبیدار میجر نے یہ کہتے ہوئے مجھے ٹرک سے اتار دیا کہ وہ پرائم منسٹر کے حکم کے بغیر مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ یہ دونوں سید محمد رضا اور شیخ وزیر محمد پھر لوٹ کر نہ آئے، البتہ ان کی لاشیں ایک سڑک پر پائی گئیں۔

کیمپ کی طرف روانگی سے قبل ایک آرمی افسر نے مجھے کہا کہ میں پرائم منسٹر کی تحریری اجازت کے بغیر اپنا اسلحہ ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں اس کے ساتھ پرائم منسٹر کے ہاں جاتے ہوئے میں نے راستے میں دیکھا کہ شہر تباہ ہو چکا تھا اور سڑکوں پر جا بجا سینکڑوں مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی ٹانگوں سے رسے باندھ کر انہیں سڑکوں پر گھسیٹا

جا رہا تھا۔ میں نے بریگیڈ دلیپ سنگھ سے درخواست کی کہ میں خواجہ محمد ہاشم کے مکان سے بعض قیمتی اور اہم کتابیں لینا چاہتا ہوں۔ اس نے اجازت دے دی لیکن ہم ان کے مکان تک نہ پہنچ سکے کیونکہ راستہ مسلمان شہیدوں کی لاشوں سے اٹا پڑا تھا اور آگے جانا ممکن نہ تھا۔

پہلے روز تو میں نے اپنے ہاں کے تمام پناہ گزینوں کو کیمپ میں پہنچایا اور اگلے روز اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہاں پہنچا مجھے معلوم ہوا کہ گزشتہ روز انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ میں نے پرائم منسٹر سے رابطہ قائم کیا اور انہوں نے آٹا اور دال بھجوا دی۔

میجر عبداللطیف خاں نے تمام مراحل پر بھرپور مدد کی۔ ان کے فوجیوں کو غیر مسلح کر کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا تھا اور وہ بھی ہمارے خوب کام آئے۔ شروع شروع میں ہندو دکاندار بھاری قیمت پر اشیاء فروخت کرتے تھے۔ میں نے پرائم منسٹر سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے ہمیں اجازت دے دی کہ ہم سپلائز کے لئے کنٹریکٹرز کا بندوبست کر لیں۔ ہم ان کنٹریکٹرز سے ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے منافع میں سے حصہ لیتے اور اس رقم کو بیواؤں اور یتیموں کے لئے اور بیماروں کی ادویات پر خرچ کرتے۔ اس رقم میں تقریباً ایک ہزار لحاف تیار کرا کے ضرورت مندوں میں تقسیم کئے گئے۔ ریاست پٹیالہ میں یہ خون ریزی جنرل بلونت سنگھ آئی جی دلیپ سنگھ اور ریاست کے ایک سابق وزیر گمبیر سنگھ نے کروائی۔ مہاراجہ ایک کمزور آدمی تھا۔ وہ شاید بالکل بے بس تھا اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی رعایا کو اس لوٹ مار اور وحشت و بربریت سے بچا سکتا تھا جو ہمیشہ پٹیالہ کے حکمرانوں کی وفادار رہی۔

......☆......

پاکستان بچاؤ

ڈاکٹر اخلاق حسین

پاکستان کی کسی سیاسی پارٹی سے میرا نہ تو تعلق ہے اور نہ ہی میں شخصیات کی پوجا کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔ میری ہمدردیاں اس لیڈر اور پارٹی سے ہیں جو صرف اور صرف پاکستان اور اس کے مفادات کا محافظ اور عملی طور پر کوشاں ہے۔ 1947ء میں، میں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتے ہوئے دیکھا اور اس کے لئے کی گئی جدوجہد اور دی گئی قربانیوں سے گزرا۔ بدقسمتی سے آج اسی پاکستان کو ایک بار ٹوٹتا ہوا اور اس میں خانہ جنگی جیسے حالات دیکھ رہا ہوں۔ خدانخواستہ اگر اس بار اس ملک کو کوئی نقصان پہنچا، پھر نہ تو میں اپنی زندگی کا بدترین صدمہ برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہوں اور نہ ہی مزید زندہ رہنے کی خواہش۔ پاکستان کیسے بنا۔ موجودہ عوام کے آباؤاجداد نے اس کی آزادی کے لئے کیا کیا قربانیاں دیں۔ ذاتی طور پر میں نہ صرف ان سے گزرا ہوں بلکہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے اور اس وقت کے حالات کے متعلق میں صرف ایک مختصر آنکھوں دیکھا واقعہ قلمبند کر رہا ہوں تاکہ ہمارے نادان لیڈران اور بھٹکے ہوئے عوام ہوش کے ناخن لیں ورنہ اللہ تعالیٰ ایسی قوموں کی مدد نہیں کرتا۔

جھلستی گرمی کی ایک شام تھی جب ہم سب گھر والے مشرقی پنجاب کے شہر پٹیالہ کے ایک محلے "دھوبی گھاٹ" کی گلیوں میں پریشان حال پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دھوبی گھاٹ کی گلیاں کوچہ پہلے ہی دوسرے محلوں سے بچ کر آئے ہوئے

مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے اس لئے ہم مسجد انگوراں میں داخل ہو گئے لیکن اس میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجبوراً ہم مسجد کے سامنے والے چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئے اور بڑی مشکل سے اس کی دوسری منزل پر ہمیں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ مجھے جو جگہ ملی وہ گلی کی طرف کھڑکی کے دروازوں کے ساتھ تھی جس میں جگہ جگہ سوراخ اور دراڑیں تھیں۔ ان سوراخوں میں جھانکنے سے گلی نظر آتی تھی۔ ابھی ہم بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمیں مشین گن فائر کی آواز سنائی دیں اور اس کے ساتھ ہی بلند نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ ''جو بولے سونہال ست سری اکال''، ''جے ہند بھارت'' اور پھر خوفناک چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ پٹیالہ ریاست کی فوج کی مدد سے مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور سارے شہر میں یہ مسلسل آٹھ دن اور آٹھ رات جاری رہا۔ ریاست پٹیالہ کی نسل در نسل حکمران ایماندار اور مخلص مسلم رعایا کا اتنے بڑے پیمانے پر اور اس بربریت کے ساتھ قتل کیوں کر کیا گیا اور ان کا کیا قصور تھا کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح انہوں نے ایک علیحدہ وطن پاکستان اور آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور بس، جس کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں ہو کا عالم تھا۔ لوگ خاموش، خوفزدہ اور ناامید نظر آرہے تھے اور کسی بھی وقت اس جگہ حملہ ہو سکتا تھا۔ اچانک گلی میں بھاگتے لوگوں کی قدموں کی آواز سنائی دی جو اس مکان کے نیچے آکر ختم ہو گئی اور مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے کھڑکی کے سوراخوں سے جھانکا تو مجھے اپنی کمر میں خوف کی لہر سی محسوس ہوئی اور میں مزید خوفزدہ اس وقت ہوا جب میں نے نیچے گلی میں چند گز کے فاصلے پر مسلح ہندو سکھ جلوس اور ان کے پکڑے ہوئے مسلمان مرد اور عورتیں دیکھیں وہ انہیں ساتھ والے محلوں سے پکڑ کر ساتھ لائے تھے۔ ان میں مرد اور تین لڑکیاں تھیں۔ وہ سب زخمی حالت میں تھے اور ان کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بے حد خوفزدہ تھے۔ جلوس میں کچھ لوگ پاکستان بانیان پاکستان کو غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ دھوبی گھاٹ میں اس ساری رات قتل عام

جاری رہا۔وہ خوفناک آوازیں اور ہائے پانی، ہائے پانی، بچاؤ، مر گیا، آج ساٹھ سال گزرنے کے باوجود میرے کانوں میں گونجتی ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کو شاید ان پر رحم آ گیا اور ان کی دعا قبول کی اور جلد بارش شروع ہوگئی جو اتنی شدید اور خوفناک تھی کہ اس کے بعد اپنی زندگی میں، میں نے ایسی بارش نہیں دیکھی۔اس کے بعد ہم سب ریفوجی کیمپ بہادر گڑھ کے قلعے میں منتقل ہو گئے جہاں تین ماہ قیام کے بعد پاکستان پہنچ گئے۔میں پاکستان کا ایک سینئر سٹیزن ہوں۔پاکستان کے دشمنوں اور اس کے غداروں کو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ ملک کسی کے باپ دادا یا خاندان کی جائیداد یا وراثت نہیں ہے بلکہ یہ سولہ کروڑ عوام کا ایک آزاد ملک ہے اور وہ اس کے محافظ ہیں اور آخری دم تک اس کی حفاظت کریں گے۔انشاء اللہ! (''نوائے وقت'' لاہور 12 فروری 2008ء)

......☆......

شہر پٹیالہ کے حالات

حاجی محمد اکرم

میرا نام حاجی محمد اکرم ہے۔ میں ہندوستان میں شہر پٹیالہ محلہ سائیں جمال شاہ میں رہتا تھا۔ میرے والد کا نام فتح محمد تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تحریک پاکستان شباب پر تھی اور ہر طرف سے ایک ہی آواز آتی تھی "لے کے رہیں گے پاکستان" 31 اگست 1947ء کو سکھ مسلم فساد میں ایک سکھ مارا گیا جس پر مقامی ہندوؤں اور سکھوں میں اشتعال پھیل گیا جب سکھوں کا ایک جم غفیر مقتول سکھ کی ارتھی لاہوری دروازے سے لے کر گزرا تو اہل جلوس نے جو کچھ بھی راستے میں آیا، اسے تباہ و برباد کر دیا۔ مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگادی اگر کوئی مسلمان سامنے آیا تو اسے بھی وہیں ڈھیر کر دیا۔ شہر میں چاروں طرف خوف و ہراس کا عالم تھا۔ اسی خوف کی فضا میں ہم لوگ اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر اپنی جانیں بچانے کے لئے گھر کے پچھلے دروازے سے نکل پڑے۔ میں نے اپنی بیوی کو کندھے پر بٹھا کر اپنے بھائی حاجی غلام محمد کے مکان پر چھوڑا۔ ان دنوں میری بیوی کے ہاں بیٹی ہوئی تھی۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ کرفیو عملاً مسلمانوں کے لئے تھا۔ مسلح ہندو اور سکھ بازاروں میں سرعام قتل و غارت گری کرتے پھر رہے تھے۔ میرے خوشدامن بھی میرے ساتھ تھیں انہوں نے میری دو بیٹیوں کو اٹھایا ہوا تھا۔ اس محلے میں جتنے بھی لوگ رہتے تھے سب اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر پہلے ہی چلے گئے تھے۔ چند لوگ جو محلے میں رہ گئے تھے۔ وہ عصر کی نماز ادا کر رہے تھے ہمارے مکان کے ایک طرف سے سی آئی ڈی کا دفتر تھا۔ اس

کے ساتھ پولیس ڈویژن نمبر 4اور نمبر 1 تھا۔ابھی ہم التحیات پڑھ رہے تھے کہ ایک بچے نے چیختے ہوئے کہا کہ محلّہ پر حملہ ہو گیا ہے۔ہم لوگ اپنے گھروں کو بھاگے اور حملہ آوروں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد دونوں طرف سے پتھراؤ شروع ہو گیا۔ہمیں پہلے یہ احساس نہیں تھا کہ بے وردی پولیس کچھ فاصلے پر رائفلیں تانے کھڑی ہے۔اتنے میں گولی چلی اور ایک شخص رمضان موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ میں بدحواسی میں اپنے گھر کی طرف لپکا۔میں نے کنڈی کھٹکھٹائی تو کسی نے کنڈی نہ کھولی، پھر میں مسجد میں چلا گیا جسے چاروں طرف سے سکھوں نے گھیرا ہوا تھا۔ میں نے پاس ہی کنویں میں نل لگا ہوا تھا۔میں نل کے ذریعے اس کنویں میں اتر گیا۔اس وقت حملہ آور گالیاں دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ مجھے جب کچھ سکون محسوس ہوا تو میں کنویں سے باہر نکلا۔کیا دیکھتا ہوں کہ میرے والد صاحب کی لاش میری آنکھوں کے سامنے پڑی تھی جب دوسری طرف نظر اٹھائی تو میرے بھائی حاجی غلام محمد کے سینے میں بھالا پیوست تھا جب میں اندر گیا تو میرے گھر میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔سکھوں نے تمام گھر والوں کو شہید کر کے ان کی لاشیں باہر پھینک دی تھیں۔ اتنے میں گھروں میں سے سامان لوٹنے کے لئے ہندو اور سکھ اندر آ گئے یہ رات آٹھ بجے کا واقعہ ہے گھر کے اندر مجھے ایک گنڈاسہ پڑا ملا۔ پھر میں ایک دروازے کے پیچھے لگ کر کھڑا ہو گیا جونہی کوئی حملہ آور اندر آتا میں اس پر گنڈاسے کا وار کر دیتا تھا۔اسی طرح میں نے چار آدمی مارے۔اس کے بعد ایک اور سکھ حملہ آور داخل ہوا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔اس نے پستول چلایا تو گولی سامنے رکھے شیشے کے برتنوں پر لگی جس کا ایک ٹکڑا میرے بازوؤں پر لگا، میں نے اسی اثناء میں گنڈاسے سے اس پستول والے شخص پر حملہ کیا جس سے اس کا بازو کٹ گیا اور پستول گر گیا۔ اس نے شور مچایا کہ اندر مسلمان موجود ہیں۔ دوسرے حملہ آوروں نے مکان کی چھت کے تین بالے نکالے اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ میں اس وقت کھڑکی میں کھڑا تھا۔ان لوگوں کا خیال تھا کہ اندر بہت سے مسلمان موجود ہیں

چنانچہ جب سارا مکان جل گیا تو وہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے اس مکان میں موجود تمام مسلمانوں کو بھسم کر دیا ہے جب وہاں سے چلے گئے تو دوسری طرف سے نکل کر میں مسجد میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد آگ بجھانے والی گاڑی آئی ان لوگوں نے دوسرے مکان کی آگ بجھائی۔ ایک کونے میں نکل کر میں محلہ جھال چلا گیا تو وہاں کے بچے مجھے دیکھ کر رونے لگے۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا وہاں کے ایک گھر میں کچھ مسلمان موجود تھے۔ میں نے ان کے ساتھ رات گزاری۔ سب لوگ اپنی جان بچاتے، ادھر سے ادھر پھر رہے تھے، پھر ہم اکٹھے سردار فضل کریم خاں سی آئی ڈی سپر نٹنڈنٹ کی کوٹھی میں چلے گئے۔ یہاں ہمارے محلے کے کوئی اٹھارہ افراد پہلے سے موجود تھے۔ ہمیں پتہ چلا کہ خاں صاحب کوٹھی چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے گئے ہیں۔ ہم نے یہاں دیر تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا چنانچہ ہم نہر کی پٹڑی پر چل دیئے۔ شمشان بھومی اور ہیرا باغ کراس کر کے ہم نے ندی عبور کی۔ آگے دیکھا کہ مسلح سکھوں کا جتھہ موجود ہے وہ ہمارے گروہ پر حملہ کرنے کے لئے لپکے، ہمارے کچھ ساتھی تیزی سے کھیتوں کی طرف بھاگے۔ حملہ آور سکھوں کے ہمراہ ایک نوجوان مسلمان لڑکا تھا۔ ہم نے اسے دہائی دی کہ ہمیں بچاؤ۔ چنانچہ اس نے سکھوں سے کہا کہ ان کی تلاشی لے کر انہیں چھوڑ دو چنانچہ ہماری جانیں بچ گئیں۔ ہمارے چند ساتھیوں نے کھیتوں کے اندر کچھ دیر آرام کیا، اگلی صبح ہم نے دیکھا کہ مسلح سکھوں کا ایک بڑا جتھہ لوٹ مار کرنے قریبی دیہات کی طرف جا رہا تھا۔ ہم موضع رکھیڑیاں سے ہوتے ہوئے دوسرے گاؤں میں پہنچ گئے۔ کچھ سکھ ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہم نے بھاگ کر ان سے جان بچائی اور گاؤں کے اندر داخل ہو گئے تو اس گاؤں کے مسلمانوں نے ان سکھوں سے کہا کہ اب یہ ہماری پناہ میں ہیں ہم تمہیں ان کو قتل نہیں کرنے دیں گے۔ اگلے روز ہم اس گاؤں سے نکل گئے۔ چلتے چلتے تھک گئے تو شام کے وقت ہم سب گنے کے کھیت میں چھپ گئے۔ وہاں ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ بارش برسا دے اور ہماری مدد فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی

اور موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ بارش کم ہونے پر ہم مسلمانوں کے دوسرے گاؤں جا پہنچے۔ یہ سارا گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ ہمیں بڑی تشویش ہوئی۔ اسی اثناء میں ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز پر چلے تو گاؤں کے کچھ لوگوں کو مورچہ بند پایا۔ اہل دیہہ کو اپنی آپ بیتی سنائی، انہوں نے ہمیں پناہ دے دی۔ دو روز کے بعد ہم لوگ اہل دیہہ کے ساتھ قافلہ کی صورت میں اگلی منزل کے لئے روانہ ہوئے۔ آگے چل کر ہمارا قافلہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ کچھ لوگ دوسرے راستے پر چل پڑے۔ ہمارے قافلہ نے ندی کراس ہی کی تھی کہ سکھوں کا ایک جتھہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا جس کے پاس جو کچھ نقدی زیور تھا، چھین لیا لیکن قتل و غارت نہ ہوئی۔ ہم لوگ موضع مسینگن۔ فرید پور، اودھے پور، بنارسی، گنجا ٹھکا سے ہوتے ہوئے ٹھسکہ میراں جی پہنچ گئے جہاں ایک مہینہ قیام رہا۔ اس کے بعد ہم سب شاہ آباد منتقل ہو گئے جہاں فوجی کیمپ لگا ہوا تھا۔ بقر عید ہم نے وہاں کی اور محرم کی دس تاریخ کے بعد سپیشل ٹرین کے ذریعے لاہور پہنچ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

......☆......

شہر پٹیالہ

ایک کانگرسی مسلمان کا انجام

روایت بنت شیخ ظہور الحسن

شیخ ظہور الحسن ایڈووکیٹ کانگریسی نظریات رکھتے تھے اور ان کے تعلقات شہر کے سکھوں اور ہندوؤں سے مربیانہ تھے۔ شہر پٹیالہ میں چوک انار دانہ پر ایک تین منزلہ خوبصورت عمارت اپنے مکینوں کے شوق و نفاست کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ یہ شیخ ظہور الحسن کا مکان تھا۔

1947ء میں، میں پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اپنی نانی اور ماموں کے ساتھ رہتی تھی۔ زہرہ میری خالہ کی بیٹی تھی۔ ہماری آپس میں گہری دوستی تھی۔ ایک دوسرے کے بغیر کوئی کام نہ کرتیں۔ زہرہ کیوالد زہرہ کی پیدائش سے چھ سات ماہ پہلے انتقال کر چکے تھے۔ زہرہ یہیں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ زہرہ سے بڑے تین بہن بھائی بھی اس کی پیدائش سے پہلے ماں کو داغ مفارقت دے چکے تھے اسی لئے زہرہ ماں کی نور نظر اور سب گھر والوں کی آنکھ کا تارا تھی۔ نانی اور ماموں نے اس کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ اس کا باپ نہیں ہے۔

شیخ ظہور الحسن کے مکان کی نیچے کی منزل میں ان کا دفتر، منشی کا کمرہ، ان کا بیڈروم معہ باتھ اور مہمان خانہ تھا۔ اوپر کی منزل میں گھر کے باقی افراد رہتے تھے۔ زہرہ اس وقت سیکنڈ ایئر میں پڑھتی تھی لیکن لاڈلی ہونے کی وجہ سے اس کی تمام حرکات بچوں کی سی تھیں۔ ہم سب بچے صبح تو سکول چلے جاتے لیکن واپسی پر کھانے سے فارغ ہو کر ہوم ورک کرنے کے لئے بازار کی طرف کھلنے والے برآمدے میں بیٹھ جاتے۔ بازار کی رونق سے محظوظ ہوتے۔ کبھی کوئی میلہ دیکھتے اور کبھی کسی کی بارات نظر سے گزرتی۔ پچیس چھبیس سالہ صحافی محمودہ دودھیا رنگت، نیلی آنکھیں سنہری بال ہنستی مسکراتی ہمیں بہت پسند تھیں اگر کبھی وقت مل جاتا

تو کوئی گیم ہو جاتی تھی۔ ممانی ہمیشہ ہمارے ساتھ کھیلتیں، کبھی چھٹی کے دن گڑیوں کا بیاہ رچانے بیٹھ جاتے، کپڑے سلتے، مٹھائی آتی اور ممانی ہمیں چاول وغیرہ پکا دیتیں۔ شادی کے رسم و رواج کی ہدایت کار بھی تھیں۔ انہیں دنوں نور جہاں کے ایک دوگانے بہت ہی مقبول تھے جو ہم تمام دن بازار کے گراموفون سے سنتے۔

آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا
سمجھے تھے آسرا جسے وہ بھی بچھڑ کے رہ گیا
پوچھو نہ داستان غم اجڑے ہیں اس طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بجھا گھر ہی اجڑ کے رہ گیا......وغیرہ وغیرہ

ہماری ممانی جان کو یہ گانا بہت پسند تھا وہ ہمیں اکثر سناتی تھیں۔

بلبلو مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع

جلسے، جلوس کے دن تھے۔ کانگریس کے جلوس نکلتے، نعرے لگاتے، شور وغل کرتے۔ کبھی مسلم لیگ کے جلوس کی باری ہوتی، وہ بھی نعرے لگاتے "پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد، لے کے رہیں گے پاکستان" ہم سنتے اور سوچتے وہ پاکستان کیا ہوگا۔ جلسے ہوتے، ہمیں تو جانے کی اجازت نہ تھی لیکن دوسرے روز سکول پہنچتے ہی لڑکیاں ہمیں رات کی تقریر کا مفہوم سمجھا دیتیں۔ پاکستان کی محبت روز بروز ہمارے معصوم دلوں میں بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ پاکستان ہمیں اپنی جان سے بھی عزیز محسوس ہونے لگا۔

مارچ 1947ء میں جب پاکستان کا باقاعدہ اعلان ہو گیا تو پنجاب کے سکھوں کی اکثریت ریاست پٹیالہ کا رخ کرنے لگی۔ ڈاک تار کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور پریشانی بڑھتی رہی۔ پاکستان وجود میں آیا۔ ہماری دیرینہ خواہش پوری ہوئی لیکن ہمیں یہ خوشی راس نہ آئی کیونکہ ہم اپنے عزیز و اقرباء سے مکمل طور پر بچھڑ چکے تھے۔

یہ اگست 1947ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ سکھ ننگی کرپانیں ہاتھ میں لئے اکثر گلی کوچوں میں پھرتے، ایک دو مسلمان روز قتل ہو جاتے۔ کوئی کہنے سننے والا نہ تھا۔ ستمبر کے شروع میں کرفیو لگ گیا جو صرف دوپہر ایک دو گھنٹے کے لئے کھلتا، اس میں کوئی نہ کوئی

مسلمان سکھوں کے ظلم کا نشانہ بنجاتا۔ پانچ اور چھ ستمبر کو سکھوں نے مسلمانوں کے محلے صاف کر دیئے، گلیوں میں مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر طرف ایک خوف طاری تھا جب بھی وحشی سکھ نکلتے، ہمارے گھر کے دروازے پر آ کر بے ہودہ قسم کے نعرے لگاتے۔ بندوق، پستول، ریوالور سب ہتھیار آزما چکے تھے لیکن گھر کے آہنی دروازے پر کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ پانی کے پائپ اور بجلی کی تاریں کاٹ دی گئیں۔ ہمارے ساتھ والے ہمسائے بھی تین چار روز سے ہمارے گھر آئے تھے۔ ان کی بیوی کی گردن پر پھوڑا نکلا ہوا تھا جس کی مرہم پٹی کئی روز سے نہ ہوئی تھی۔ پھوڑے کی غلاظت سے کپڑے خراب ہو گئے تو اس نے صبح اٹھ کر اپنے نوجوان نوکر کو کہا کہ چھت پر جاؤ اور منڈیر پھاند کر گھر سے میرے کپڑے اور مرہم لے آؤ۔ نوکر...... چھت پر گیا۔ چند منٹ بعد فائر کی آواز آئی، سب لوگ گھبرا کر زینے پر چڑھ گئے۔ نوکر کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ گولی سینے پر لگی تھی۔ پھیپھڑوں کو چیرتی ہوئی نکل چکی تھی۔ نوجوان نوکر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب قسم کی آواز آ رہی تھی۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ سب کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں لیکن کسی میں بھی ہمت نہ تھی کہ چھت پر سے لاش اٹھالیں، بچے سہمے ہوئے تھے۔

دس بجے فوجی دستہ راؤنڈ کے لئے آیا تو ماموں جان نے کھڑکی سے آواز دے کر بلایا اور چھت سے لاش نیچے اتر والی۔ کپڑوں سمیت ہینڈ پمپ کا پانی ڈال کر غسل کی رسم ادا کی، بستر کی دو سفید چادریں بطور کفن، لاش پر لپیٹ دیں اور لاش بھارتی فوجیوں کے حوالے کر دی۔

اس روز ستمبر کی سات تاریخ تھی۔ یقیناً اتوار کا دن تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا سب گھر والے نچلی منزل میں بڑے ماموں جان کے بیڈ روم میں پریشان بیٹھے تھے۔ آج صبح سے کسی نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ میرے تیس پینتیس سالہ دو ماموں خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش پوش تھے۔ خدا نے انہیں مردانہ حسن سے خوب سنوارا تھا لیکن آج چہروں پر پریشانی کے سائے نظر آ رہے تھے۔ خاموش اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جیسے

پوچھ رہے ہوں، یہ کیا ہو گیا اور اب کیا ہوگا۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

چالیس سالہ بیوہ کمزور، خالہ برکت سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ زہرہ خاموش بیٹھی کبھی ماں اور کبھی دونوں ماموؤں کو دیکھ رہی تھیں۔ چار سالہ اختر جو گلاب کے پھول سے زیادہ خوبصورت اور تروتازہ تھا، اپنی ماں کے گھٹنے پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ چھ سالہ حسین بچی بدر منیر، معصوم چہرہ، چمکتی رنگت، نیلی آنکھیں اپنی ماں کے زانوں پر بوجھ دیئے بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں، کچھ سوچ رہی تھی۔ یکا یک بدر اپنی ماں سے بولی۔

''امی! ریاض (نوکر) کو سکھوں نے گولی کیوں ماردی؟'' ماں چپ رہی۔

بدر، ''امی ریاض نے کیا غلطی کی تھی؟'' ماں پھر بھی چپ رہی۔ بدر مسلسل سوال کر رہی تھی۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔ ''امی کیا وہ مسلمان تھا اس لئے گولی ماردی ہے۔'' ماں چپ رہی۔

بدر۔ ''امی، ہم بھی تو مسلمان ہیں۔ کیا ہمیں بھی گولی ماردیں گے۔''

ماں نے تیزی سے بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں بیٹا ایسی منحوس باتیں نہیں کرتے۔'' پڑوسن اور ان کا شوہر دوسرے کمرے میں بیٹھے نوکر کی زندگی کے حالات دہرا رہے تھے۔ اچانک کہیں دور سے بلوائیوں کا شور ابھرا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے ''گرو گوبند سنگھ کی جے'' سب چونک گئے۔ لحہ بہ لحہ نعروں کی آواز قریب تر ہوتی گئی۔ آج سب کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے حالانکہ ایک ماہ سے نصف رات تک نعرے سنائی دیتے تھے لیکن اتنا خوف کبھی نہ محسوس ہوا تھا۔

بلوائی بالکل قریب آگئے، ہمارے دروازے کے سامنے آکر جوش وخروش سے نعرے لگانے لگے۔ ''گورو گوبند سنگھ کی جے'' پھر دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا ''شیخ جی وکیل صاحب!'' آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ ماموں جان دفتر کی کھڑکی سے دیکھنے چلے گئے۔ یہ دو سکھ ان کے ساتھ کام کرنے والے وکیل تھے، ہنس کر بولے ''واہ شیخ جی تسی ڈر گئے، اسیں تھواڈی مدد لئی آئے ہاں۔ بوہا تے کھولو۔ گرنتھ صاحب دی سوگند تسی ساڈی امان وچ ہو۔''

ماموں جان نے آہنی دروازے کی کنڈی کھولی۔ ابھی آنے والا پوری طرح نظر

بھی نہ آیا تھا کہ کرپان پورے زور سے بلند ہوئی اور ماموں جان کے سینے میں اترتی چلی گئی، خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی طرف مڑے صحن اور ڈیوڑھی کے درمیانی دروازے میں زہرہ کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے چیخ ماری اور اپنے بازو پھیلا کر انہیں تھام لیا۔ ماموں کے سینے اور منہ سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ زمین پر گر پڑے اور آسمان کی طرف انگلی اٹھائی جیسے کہہ رہے ہوں تیرا خدا حافظ، آہستہ آہستہ ان کے ہونٹ لرزے "پاکستان" پاکستان دو مرتبہ کہا زندہ باد کہنے کی طاقت نہ رہی۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا، آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ یہ دیکھ کر زہرہ کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ ساتھ ہی زینہ تھا کوٹھے پر چڑھ کر نیچے کا دردناک منظر دیکھنے لگی۔

اتنے میں آٹھ دس سکھ اس شہید کی لاش کو ٹھوکر مار صحن میں داخل ہوئے اور پنجابی میں بولے "اک تے پاکستان ٹرگیا اے۔ چل ہن تیری واری اے" یہ کہہ کر ماموں منظور کی گردن پر تلوار کا ایک بھرپور وار کیا، آن واحد میں گردن دور جا گری اور تڑپتا ہوا دھڑ بھائی کی سر دلاش پر گر گیا۔ جیسے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا وعدہ نبھا رہے ہوں۔ سکھ کرپان اٹھائے دونوں بچوں کی طرف بڑھے تو ممانی جان نے پاؤں پکڑ لئے اور کہا میرے بچوں کو نہ مارو۔ میں چلی جاؤں گی سب گھر لے لو ہماری جان بخش دو۔ دو سکھ کرپانیں لہراتے آگے بڑھے۔ بچے سہم کر انگور کی بیل میں جا چھپے تھے۔ انہیں بے دردی سے کھینچ کر ان کی ماں کے سامنے کھڑے کر دیا، تلوار فضا میں چمکی۔ بدر نے سوچا بھائی کو مارنے لگے ہیں وہ اختر سے لپیٹ گئی۔ تلوار کا ایک ہی وار دونوں کو زخمی کر گیا۔ دونوں بچے ماں کے سامنے خاک و خون میں تڑپنے لگے۔

ممانی بچوں کی لاشیں دیکھ کر ہی مردہ ہو چکی تھیں۔ ایک سکھ اونچی آواز میں گرج کر بولا۔ "چل ہن تیری واری اے" کرپان کا ایک بھرپور ہاتھ ممانی کے مونڈھے پر پڑا۔ بازو کٹ کر جسم کے ساتھ لٹک گیا۔ ممانی زمین پر کافی دیر تک تڑپتی رہی، پھر سسک سسک کر جان دے دی۔ خالہ برکت دیوار کے سہارے کھڑی سکتے کے عالم میں یہ دلخراش منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایک سکھ نے آگے بڑھ کر کلائی سے پکڑا اور زمین پر گرا دیا۔ دوسرے سکھ نے

اپنے بھاری بوٹ کا وزن سینے پر دیتے ہوئے تلوار پیٹ میں گھونپ دی۔ نہ چیخیں نہ تڑپیں خاموشی سے موت کے گلے لگا لیا۔

یہ سب کچھ زہرہ نے کوٹھے سے جھانک کر دیکھا جب گھر میں کوئی بھی نہ بچا تو جھٹ نیچی پردے کی دیوار پھلانگ کر ساتھ والوں کے کوٹھے پر کود گئی، اس نے ایک مرتبہ گھر کی طرف حسرت سے دیکھا۔ پڑوسیوں کا زینہ کھلا پڑا تھا۔ نیچے صحن میں پہنچی تو ساتھ والی خالہ اور ان کے شوہر اور بچوں کی لاشیں اندر باہر بکھری پڑی تھیں وہاں ایک روز پہلے غم کی آندھیاں چلی تھیں۔ باغ اجڑ چکا تھا۔ ماجرائے غم سننے والا کوئی نہ تھا۔ سنسان گھر میں لاشوں کے چہرے بھیانک لگ رہے تھے۔ ساتھ والی خالہ کی لاش صحن میں پڑی تھی۔ چہرے پر خشک خون جما ہوا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''تمہیں پاکستان مبارک'' پاکستان میں رہنے والوں کو ہماری عظیم قربانی کی روداد سنا دینا'' ان کے صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ زہرہ گلی میں نکل گئی، نہ جانے کہاں تک گئی، پھر گھر یاد آیا۔ اپنے گھر کے بیک سائیڈ دروازے پر پہنچی تو سکھ گھر کا قیمتی سامان اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔ زہرہ کو زندہ دیکھ کر ایک سکھ نے بائیں ہاتھ سے کرپان کا وار کیا۔ زہرہ کے سر سے خون نکلنے لگا لیکن اس کو کچھ احساس نہ ہوا۔ اس کی حس ختم ہو چکی تھی۔ گلی آگے چل کر بازار میں کھلتی تھی وہ بھاگی اور بازار میں تھوڑا موڑ کاٹ کر اپنے صدر دروازے پر آ گئی۔ ادھر بھی سکھ ہاتھوں میں چاندی کے برتن اٹھائے نکل رہے تھے۔ ایک سکھ پنجابی میں بولا ''اوے مسلی! وڈی سخت جان ایں اجے جیوندی ایں'' دوسرا سکھ بولا۔ ''کڑی تے بڑی سوہنی اے تسی ایویں زخمی کر دتی'' تیسرا سکھ کہنے لگا۔ ''میں ایدا علاج کراں گا۔ چل نی کڑیئے میرے نال'' دوسرے سکھ نے جل کر ایک اور کرپان کا وار کر دیا۔ سر پر دو بڑے گہرے زخم آ گئے اور خون اور بھی تیزی سے بہنے لگا۔ تیسرے نے آگے بڑھ کر زہرہ کی مرمریں کلائی تھام لی اور اسے گھسیٹتا ہوا سڑک پر چلنے لگا۔ زہرہ کے سر سے خون نکل کر اس کے جسم اور کپڑوں کو رنگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ دلہن نے اپنے خون سے رنگ کر لباس پہنا ہے۔

......☆......

مسلمانوں کا قتل عام

روایت: راجہ خوش بخت الرحمان

میرا تعلق مشرقی پنجاب کے علاقہ نابھہ پٹیالہ سے ہے۔ سن 46ء کے الیکشن کے زمانے میں، میں باٹا پور میں تھا اور وہاں پر مسلم لیگ کی طرف سے ہندو کانگریس کے مقابلے میں جلسے، جلوس اور گاؤں گاؤں جا کر ووٹوں کے لئے سرگرم عمل رہا، اس زمانے میں ہر بالغ کا ووٹ نہیں ہوتا تھا بلکہ مخصوص اہلیت کا حامل شخص ہی ووٹ ڈال سکتا تھا۔ یہاں پر ہمارا ایک بہت بڑا پاور گروپ ہندوؤں کے مقابلے میں قائم تھا جس کو "لے کے رہیں گے پاکستان اور بن کر رہے گا پاکستان" کا ایک جنون سوار تھا۔

ماہ جون 47ء میں پاکستان کی حدود کا جو اعلان ہوا تھا اس میں گرداس پور اور امرتسر بھی شامل تھے لیکن ریڈکلف نے باؤنڈری بناتے وقت پاکستان سے یہ علاقے نکال دیئے تھے جس کی وجہ پنڈت جواہر لعل نہرو اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی گہری دوستی کا اثر انداز ہونا تھا۔

جولائی 47ء میں برطانوی پارلیمینٹ نے قانون آزادی ہند منظور کیا جس کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو دو خودمختار ریاستوں میں تقسیم کر کے 15 اگست 1947ء کو آزاد کیا جانا تھا۔ ریڈکلف کے باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ کا اعلان ہوتے ہی مشرقی پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے اور مسلمانوں کا قتل عام اور لٹے پٹے قافلوں کا پاکستان آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم لوگ جی ٹی روڈ سے آنے والے قافلوں کی خدمت میں لگ گئے۔ ایک دن باٹا پور کے سامنے جی ٹی روڈ پر مسلم دشمن ماسٹر تارا سنگھ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ہمارا گروپ مشتعل ہو کر اس کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا تھا لیکن ہمارے سینئرز کی دخل اندازی اور مشرقی پنجاب میں مسلم آبادی کی مصلحت کی بناء پر ہمیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ شروع

اگست میں والٹن میں مسلم لیگ کی طرف سے مہاجر کیمپ قائم کیا گیا۔ ہم لوگ علاقہ سے سامان اکٹھا کر کے کیمپ میں پہنچاتے رہے۔ 15 اگست کے دن کا ہم گھنٹہ گھنٹہ کر کے انتظار کرتے رہے۔ آخر 14 اگست شام ہی سے ریڈیو کے گرد اکٹھے ہو کر رات بارہ بجے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آخر اللہ تعالیٰ وہ لمحہ بھی لے آئے جب بارہ بجے کے فوراً بعد مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز میں ''یہ ریڈیو پاکستان ہے'' کے الفاظ ہوا میں گونجے جس کے فوراً بعد تلاوت کلام پاک اور دیگر افکار نشر ہوئے۔ پاکستان کا اعلان سنتے ہی ہم نے سجدہ شکر ادا کیا۔ یہ 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات تھی اور رمضان المبارک کی 27 ویں شب تھی۔ یہ سورج طلوع ہونے کے بعد 15 اگست کو پورے پاکستان میں انتہائی دکھ درد میں ڈوبا ہوا پہلا یوم آزادی منایا گیا۔ اس کے بعد پاکستان بننے کے کاغذات کی تکمیل کی Tehnicality کی وجہ سے یوم آزادی 14 اگست کو منایا جائے گا کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کراچی میں ملک پاکستان Create کرنے کے کاغذات پر 14 اگست کو دستخط کیے تھے اور اسی دن قائداعظم سے بطور گورنر جنرل پاکستان حلف لیا تھا۔ مہاجروں کی خدمت کرتے ہوئے عیدالفطر آ گئی اور میں اپنے دوستوں کے منع کرنے اور ٹرینوں میں قتل وغارت کے واقعات کے باوجود خوش قسمتی سے پٹیالہ پہنچ گیا۔ وہاں مہاراجہ کی سکھ فوج نے اکالی دل سکھوں کے ساتھ مل کر گلیوں، محلوں اور دیہاتوں اور ٹرینوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ وہاں لاشیں اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ مقامات پر مسلمانوں نے سکھوں کا مقابلہ بھی کیا لیکن زیادہ نقصان اپنا ہی اٹھایا کیونکہ فوج کے تربیت یافتہ اسلحہ سے لیس اشخاص کے سامنے نہتے لوگوں کی کوئی پیش نہیں جاتی تھی۔ اسی دوران میرے حقیقی چچا اور ایک حقیقی بہنوئی بھی شہید ہوئے۔ نابھہ سے 13 ٹرکوں کا ایک قافلہ جن میں میرے خاندان و رشتہ داروں کے بیشتر افراد شامل تھے۔ نواب ملیر کوٹلہ کی پناہ حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے جو کہ تمام کا تمام مہاراجہ پٹیالہ کی فوج نے راستے میں شہید کر دیا۔ اس پورے قافلے سے لاشوں کے نیچے دب کر صرف دو شخص بچے تھے۔ اسی قاتل مہاراجہ پٹیالہ کا بیٹا آج کل مشرقی پنجاب کا وزیر اعلیٰ ہے اسی وزیر اعلیٰ کو پچھلے دنوں ہمارے پنجاب کے سرکاری دورے پر بلایا گیا تھا اور ہم نے اس کی خاطر مدارت میں اور سر آنکھوں پر بٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان دنوں میرے اور میرے جیسے چشم دید لوگوں کے جذبات

بھڑکتے رہے۔ وائے ری قسمت کسی نے اس کو یہ باور نہیں کروایا کہ وہ مسلم امہ اور مہاجروں کے قاتل کا بیٹا ہے۔ (یہ پاکستانی پنجاب میں چوہدری پرویز الٰہی کا دورِ حکومت تھا)۔

حکومتوں میں تبادلہ آبادی کا معاہدہ طے پایا، اس کے بعد لاؤڈ سپیکروں پر علاقے میں اعلان ہوا کہ تمام مسلمان پاکستان جانے کے لئے خالی ہاتھ گھروں سے باہر نکل آئیں، جس پر جگہ جگہ مسلمانوں کی آبادی کھلے گھر بار چھوڑ کر میدانوں میں اکٹھی ہو گئی۔ وہاں ان کی تلاشی لی گئی اور جو کچھ پاس تھا، لے لیا گیا اور فوجی لوگ مویشوں کی طرح ہانک کر ان کو آٹھ نو میل کے فاصلے پر بہادر گڑھ نامی ایک قلعہ میں لے گئے جہاں مہاراجہ کے مسلمان فوجی پہلے ہی سے محصور تھے۔ راستے میں عورتوں، بچوں اور زخمیوں کی چیخ و پکار اور لاشیں کوئی پرسان حال نہ تھا۔ بچ کر آنے والے کچھ دن بھوکے پیاسے رہے، اس کے بعد کچھ تھوڑا بہت راشن دیا جانے لگا۔ ماہ اکتوبر میں کیمپ سے چار میل دور ریلوے اسٹیشن سے لمبے لمبے وقفے کے بعد ٹرینوں کے ذریعے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کی حفاظت میں مہاجروں کو پاکستان لے جانا شروع کیا جس ٹرین میں، میں سوار تھا اس کو راستے میں ایک دو جگہ روکا گیا۔ سکھ جتھوں کا آمنا سامنا ہوا لیکن بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کی ہمت حوصلہ اور عزم کے سامنے ان جتھوں کو پسپا ہونا پڑا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے مہاجروں میں سے کچھ کو ساتھ ملا کر اپنی تعداد بڑھائی تھی۔ دریائے بیاس کے کنارے انسانوں اور مویشیوں کے پنجر پڑے تھے جو کہ سکھوں کی بربریت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

جب ہم لوگ ہندوستان میں اٹاری اسٹیشن سے گزرے تو پوری ٹرین کے سہمے ہوئے لوگوں میں ایک ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا اور سب نے پاکستان زندہ باد اور قائداعظمؒ زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ واہگہ پہنچ کر ہم لوگوں نے سجدہ شکر ادا کیا اور ہمارے تمام دکھ درد جیسے کافور ہو گئے وہاں پر لاتعداد مسلم لیگی رضا کار ٹرین کے مہاجروں کی خدمت کے لئے موجود تھے اور ان بھوکے پیاسے لوگوں کو کھلانے پلانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی میجر ایم اے حلیم جو بعد میں کرنل ریٹائرڈ ہوئے ان دنوں سڑک کے ذریعے مہاجروں کو لانے پر مامور تھے۔

(''نوائے وقت'' سنڈے میگزین 20 نومبر 2005ء)

مغویہ خواتین کا مسئلہ

بیگم سلمیٰ تصدیق حسین

اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک حکومتیں افراتفری کے عالم میں تھیں، بالخصوص حکومت پاکستان، کیونکہ ہر کام کی ابتداء ہو رہی تھی اور اس میں شبہ بھی نہیں کہ بھارتی حکومت مغویہ خواتین کے مسئلہ سے زیادہ دلچسپی اس لئے نہیں رکھتی تھی کہ پاکستان میں ہندو سکھ مغویہ خواتین کی تعداد بھارت میں مسلمان مغویہ خواتین کے مقابلے میں ایک تہائی سے بھی کم تھی یعنی بھارت میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد تو نوے ہزار تھی تو پاکستان میں غیر مسلم لڑکیوں کی تعداد 25 سے 26 ہزار تک لیکن حکومت پاکستان کا تساہل میرے فہم سے بعید تھا۔

بہرحال سرکاری سطح پر انتظامات کے بعد مغویہ خواتین کے سلسلہ میں ایک بھارتی وفد بھی پاکستان آیا۔ اس کے ایک رکن مسلمان بزرگ بھی تھے۔ کانگریس کے پجاری، ہندو کے دوست اور مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے بدترین دشمن، مگر وائے افسوس کہ ان کی صاحبزادی نے بھی سکھ نوجوان سے شادی کی۔ کہاں تسبیح ومحراب اور کہاں پنج ککے یعنی کڑا، کنگھی، کرپان، کچھا اور کیس! لیکن آج بھی آزاد فضا اور جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے باوجود ملکی سالمیت اور قومی وقار سے بے بہرہ بعض افراد اس وطن کی عظمت کے منکر اور کانگریسی دام کے اسیر ہیں۔

مغویہ خواتین کی کمیٹی کی رکنیت سے قبل 1948ء میں سب سے پہلے میں سرکاری طور پر اسی مقصد کے لئے دلی گئی اور پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین صاحب کے یہاں

قیام پذیر ہوئی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل، مغویہ خواتین کی کونسل کے چیئر مین اور مہاراجہ پٹیالہ کے علاوہ دیگر متعدد سربراہان ریاست اس کے رکن تھے، خواتین میں مردولا سارا بھائی، مسز ڈاکٹر انصاری اور رانی امرت کور (جو بعد ازاں مشرقی پنجاب وزارت میں رہیں) بھی اس کمیٹی میں شامل تھیں۔

یعنی بھارتی حکومت نے 1948ء میں ہی غیر مسلم مغویہ خواتین کو برآمد کرانے کے لئے تگ ودو کا آغاز کر دیا تھا۔ میں نے زاہد حسین صاحب کے ساتھ دو چار بار کونسل کے اجلاس میں شرکت کی مگر نتائج سخت حوصلہ شکن برآمد ہوئے۔ میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اگر بھارتی وزراء، سربراہان ریاست، ارباب اختیار اور پولیس خلوص دل سے چاہتے تو نوے ہزار مسلمان لڑکیوں میں سے 75 سے 80 ہزار تک یقیناً واپس آسکتی تھیں لیکن ہندو ذہنیت کا محور سود اور سودا بازی ہے۔ اسے علم تھا کہ پاکستان میں ان کی لڑکیوں کی تعداد کئی گنا کم ہے لہٰذا اگر ان میں سے کچھ رہ بھی گئیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کئی گنا زائد مسلمان لڑکیاں تو بہر حال اس کے قبضہ میں تھیں۔ سودا بہر حال نفع کا تھا۔ شاید میری یہ بات مضحکہ خیز سی محسوس ہو لیکن تاریخ کا طالب علم اسے بہتر سمجھتا ہے اور تاریخ کے آئینے میں یہ بات خود اپنا ثبوت ہے، ہندو ذہنیت یہی ہے کہ اگر کھلنا میں ایک ہندو لڑکی کسی مسلمان لڑکے کے ساتھ برضا و رغبت شادی کر لے تو ہزاروں مسلمان عورتیں نذر آتش کر دی جائیں اور ہزاروں مردوں اور بچوں کو خاک میں لوٹا دیا جائے لیکن جب اقتدار مسلمان کے ہاتھ میں ہو تو مسلمان حکمران کے لئے راجپوت ہندو لڑکی کو ڈولی میں بٹھا کر دھوم دھام کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔ غیرت کے تقاضے؟

میں ہندو ذہنیت کے بارے میں جو بات بتانا چاہتی تھی اب ذرا وہ بھی سن لیجئے۔

اول تو کانگریس کے مرد آہن اور ہندوؤں کے مطابق نہایت غیر متعصب سردار ولبھ بھائی پٹیل کا اصرار تھا کہ بھارت میں کوئی مسلمان مغویہ لڑکی ہے ہی نہیں اور اگر چند ایک ہیں بھی تو وہ اپنی مرضی سے اغواء ہوئی ہیں۔ جبراً اغواء ہونے والی لڑکیوں کی تعداد کسی صورت دو چار سو سے زائد نہیں۔ یہ حالت ہندو کانگریس کے ایک ''قابل فخر'' رہنما کی تھی۔

ان سے یہ کون پوچھتا ہے کہ آخر آپ اس کونسل کے چیئر مین کیوں بنے۔ کیوں بنائے گئے۔ یہ کونسل کیوں بنی۔ یہ سارے اخراجات کس مقصد کے لئے کیے گئے اور وقت کیوں ضائع کیا گیا اگر بنیاد ہی نہیں تو آخر یہ تمام کارروائی کس کو دکھانے کے لئے کی جا رہی ہے؟

ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں پر بے حد مظالم ڈھائے گئے اور وہیں سب سے زیادہ مسلمان لڑکیوں کو اغواء کیا گیا۔ مہاراجہ پٹیالہ جس کی رواداری اور فراخ دلی کے گن گائے جاتے تھے، کے اپنے فیل خانے میں 500 مسلمان مغویہ لڑکیاں موجود تھیں۔ اس سلسلہ میں ہماری معلومات نہایت مصدقہ اور ناقابل تردید تھیں مگر مہاراجہ پٹیالہ مصر تھا کہ فیل خانے میں ایک بھی لڑکی موجود نہیں اور جب میرا اصرار بڑھا تو کہنے لگے۔

''اگر آپ کو وشواش نہیں تو خود جا کر دیکھ سکتی ہیں میری ماتا جی آپ کے ساتھ چلی جائیں گی۔''

مہاراجہ پٹیالہ کا اتنا اشارہ ہی ان کی ''نیک نیتی'' کا غماز تھا۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ میرے پہنچنے تک ان بے بس اور مجبور لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ میں نے اس چال کو سمجھ جانے کے باوجود یہ بات بھی قبول کر لی کیونکہ اضطراب تو ان بے بس خواتین کے لئے تھا۔ کچھ نہ سہی بس ایک امید موہوم ہی سہی۔ میں نے پاکستان فون کیا تا کہ مفصل حالات بتا کر اجازت حاصل کر سکوں مگر مجھے روک دیا گیا۔ متعلقہ وزیر کہنے لگے۔

''یہ ہندو سکھ ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا جانا بے کار رہے، آپ خواتین کا اس طرح جانا ہرگز مناسب نہیں۔''

میں نے جواباً کہا۔

''لیکن وہ ہماری بچیاں اور بہنیں ہیں ہم انہیں کیسے نظر انداز کر دیں ان کی بازیابی کے لئے ہر طریقہ استعمال کرنا ضروری ہے۔''

مگر وزیر متعلقہ نے مجھے یقین دلایا اور کہنے لگے۔

''آپ انہیں نہیں جانتیں وہ اتنی آسانی سے لڑکیاں نہ دیں گے۔''

ان کے یہ کہتے ہی اچانک درمیان سے ایک آواز ابھری ''تو پھر ہندوستان پر حملہ کردو۔''

یہ آواز ہندو ٹیلی فون آپریٹر کی تھی۔ اس نے یہ کہہ کر قہقہہ بلند کیا۔ اس کے تحت الشعور میں لازماً تاریخ کا وہ واقعہ تھا جب صرف ایک عورت کی پکار پر مسلمانوں نے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہندو طاقت کا گھمنڈ چکنا چور کردیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد تین دن تک میرا ٹیلیفون کنکشن ہی غائب رہا۔

یہ جانتے ہوئے کہ میں، میں کون ہوں اور میرا مشن کیا ہے اور کس سطح پر ہے، بھارت جاتے ہوئے بھارتی کسٹمز نے میرے سامان کی تلاشی کچھ اس انداز میں لی کہ جیسے میں اسلحہ سمگل کر کے لے جا رہی ہوں۔ (حوالہ کتاب ''آزادی کا سفر'')

......☆......

پٹیالہ میں مسلم لیگیوں کا حشر

بیگم سلمٰی تصدق حسین

پنجاب سب کمیٹی کی خواتین کے علاوہ دیگر صوبوں کی خواتین بھی اپنے اپنے علاقہ کی ریاستوں کے دوروں پر جاتیں۔ وہ رائے عامہ کو مسلم لیگ کے حق میں ہموار کرتیں اور مستورات کو زیادہ سے زیادہ منظم کرتیں۔ ہم نے بھی پنجاب کی تمام ریاستوں کا دورہ کیا اور عام جلسے منعقد کر کے مختلف تحریکوں کی بنیاد ڈالی مگر ہندو والیان ریاست نے 1947ء سے ذرا قبل اور تقسیم ملک کے بعد موقع پاتے ہی مسلم لیگیوں اور مسلمانوں سے بھرپور انتقام لیا اور انتقام بھی محض اس بات کا کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ گھر کیوں چاہتے ہیں؟ تشکیل پاکستان سے دو سال قبل ریاست پٹیالہ کے مسلمان زعماء نے ایک شاندار جلسہ عام کا اہتمام کیا۔ اس جلسہ عام کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کی مسلمان خواتین اپنی رہنماؤں کو سن کر ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں اور جدوجہد آزادی کے لئے پوری طرح منظم ہو سکیں۔

اس جلسہ میں مجھے بھی بحیثیت سیکرٹری پنجاب زنانہ کمیٹی مسلم لیگ مدعو کیا گیا اور ہمارے کہنے پر نواحی ریاستوں کی مسلم خواتین کو بھی جلسہ میں شرکت کے لئے بلایا گیا۔ اس جلسہ میں بیگم کریم دار اور بیگم اسحاق بھی میرے ہمراہ تھیں۔ یہ جلسہ بڑا عظیم الشان تھا۔ ادھر ہماری تقاریر نے خواتین میں ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ جلسہ دو روز تک جاری رہا اور بلا مبالغہ والیان ریاست اس دوران بے حد پریشان ہو گئے۔ وہ توقع بھی نہیں کر سکتے

تھے کہ پٹیالہ اور نواحی پسماندہ ریاستوں کی خواتین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سارا سماں ہی بدل ڈالے گا۔ پہلے ہی دن انہوں نے ہمیں پیغام بھجوایا کہ "مزید اشتعال انگیز تقاریر سے احتراز کیا جائے ورنہ بلوہ کا زبردست خطرہ ہے۔" اس وقت سید جمیل حسین رضوی [1] (بعدازاں جج عدالت عالیہ و چیف سیٹلمنٹ کمشنر) مسٹر سعید حسن اور حاجی عبدالستار فاروقی اس تحریک کے نمایاں رہنما تھے۔ ان کے اسی جرم کی سزا تھی کہ بمشکل تمام جانیں بچا کر پاکستان پہنچ سکے مگر پٹیالہ مسلم لیگ کے صدر غلام محمد اور ریاست مسلم لیگ کے سیکرٹری فسادات کے آغاز ہی میں سکھ حاکم کے غصہ کا شکار ہو گئے۔ ان کی صرف ایک بچی 25 اگست کو کسی نہ کسی طرح بچ کر پاکستان پہنچ سکی اور میں نے فوراً مسلم کیمپ میں اس کے قیام کا بندوبست کیا۔

(بحوالہ کتاب "آزادی کا سفر")

یہ داستان 90 ہزار لڑکیوں میں صرف ایک لڑکی کی داستان ہے۔ ہر لڑکی کا قصہ بجائے خود ایک المیہ ہے۔ چلتے چلتے ریاست پٹیالہ کا بھی ایک واقعہ سنا دوں۔ مسلمانوں نے ہندو سکھوں کے حملہ سے کچھ قبل چند نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو گندم کے ایک (گودام) ذخیرہ میں بند کر دیا۔ ان میں ایک کی گود میں اڑھائی تین ماہ کا پہلوٹھی کا بچہ بھی تھا۔ سکھ لڑکیوں کی تلاش میں تھے۔ بدقسمتی کہ پہلے تو سکھوں کا ایک جتھہ ادھر سے گزر گیا مگر جونہی دوسرا جتھہ آیا تو گرمی کی شدت سے بے تاب ہو کر اس بچے نے رونا شروع کر دیا اور سارے سکھ ذخیرے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ وہ درندوں کی طرح لڑکیوں پر جھپٹے اور ایک سکھ نے ماں کو بچے سے جدا کر دیا۔ مامتا چیخی چلائی، سکھ کو واسطے دیئے کہ بچہ ساتھ لے چلو تو اس نے غصہ میں آ کر ماں کے سامنے بچے کو کھلی گندم کے ڈھیر میں زندہ دفن کر دیا اور ماں کو لے کر چلتا بنا۔ مامتا یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکی۔ سکھ اسے یکے پر بٹھا کر لے جا رہا تھا کہ راستے میں لڑکی نے سکھ کوچ بان کی کرپان بڑی تیزی سے نکالی اور پیچھے بیٹھے ہوئے اغواء کرنے والے سکھ پر ایسا بھرپور وار کیا کہ آنکھ سے پیٹ تک دو نیم کر دیا۔ سکھ کوچ بان یہ جرأت دیکھ کر بھاگ نکلا اور یہ عورت ہزار مصائب برداشت کرتی، کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔ ("آزادی کا سفر")

---

[1] ان کی روداد سفر پاکستان پہلے آ چکی ہے۔

پاکستان کی خاطر لوگوں نے بڑے زخم کھائے ہیں، میرے ایک ملنے والے صاحب ہیں، نام ان کا جعفر حسین پٹیالہ دھوبی گھاٹ کے رہنے والے تھے، وہ 14 اگست کو عموماً بہت غمگین دکھائی دیتے ہیں آخر میں ایک دن پوچھ ہی لیا کہ دوست تم 14 اگست کو اداس کیوں ہو جاتے ہو؟ اس نے ایک لمبا سانس بھر کر کہا اس لئے کہ 14 اگست 1947ء کو ایک قیامت تھی جو ہم پر بیت گئی پہلے ہمارے محلے پر سکھوں نے حملہ کیا ہمارے مکانوں کو جلایا پھر قتل عام شروع کیا جس میں بہت سے لوگ مارے گئے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے مارے گئے۔ کچھ زخمی ہوئے جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ پھر یہاں تک بس نہیں کی، اعلان کیا کہ سب مسلمان دھوبی گھاٹ اکٹھے ہو جائیں آپ کو پاکستان بھجوایا جائے گا لہٰذا تمام مسلمان دھوبی گھاٹ اکٹھے ہو گئے، تقریباً شام کے 71/2 یا 8 بجے کے درمیان انہوں نے نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی، رات کو اندھیرے میں تو کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ صرف چیخ و پکار کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں مگر جب صبح ہوئی جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا نا قابل بیان ہے۔ جگر پھٹ گئے کلیجہ منہ کو آنے لگا، عورتوں کی چیخ و پکار نے قیامت بپا کر دی۔ کسی کا بھائی قتل ہو کر خاک و خون میں پڑا تھا، کسی کا خاوند اور کسی کا بیٹا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے خاک پر پڑے یوں لگ رہا تھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ آزادی اس طرح حاصل کی جاتی ہے؟ دھوبی گھاٹ کی زمین بے گناہ شہیدوں کے خون سے سرخ ہو گئی سینکڑوں جوان اور بچے شہید ہوئے، میرے ماموں سسر بھی شہید ہو گئے۔ خاندان کے دیگر جواں سال محمد شریف، محمد لطیف، امجد حسین اور صفدر حسین بھی پاکستان پر قربان ہو گئے۔ ہم نے اس پاکستان کے لئے بے شمار قربانیاں دی ہیں اور ایک مثال قائم کی ہے آئندہ بھی ہم پاکستان کے لئے قربانی دینے کا عزم رکھتے ہیں مگر یہاں ہمیں بے پناہ قربانیوں کے عوض رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ بہر حال ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہر آفت و بلا سے محفوظ رکھے جس کے لئے لوگوں نے بے شمار قربانیاں دی ہیں۔

مغویہ دوشیزائیں

"بھائی جان اخبار میں پڑھا تھا کہ عورتوں کی بازیابی کے لئے پاک و ہند میں ہفتہ منایا گیا اور ہند میں تقریباً 50 ہزار عورتیں ہیں صرف پٹیالہ میں 40 ہزار عورتیں ہیں اور اس کام کو پایہ تکمیل پر پہنچانے کے لئے باہمت خواتین مثلاً مس طوسی مس اشرف حسن اور بیگم ذکیہ جہانگیر صاحبہ کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔"

"ہاں یہ درست ہے!" بھائی جان نے کہا "یہ خود امرتسر کی مہاجرین اور تعلیم یافتہ تھی۔" مس اشرف حسن صاحبہ نے فرمایا کہ "13 اگست 1947ء کو ہم چوک فرید امرتسر سے نکل کر بذریعہ گاڑی لاہور پہنچ گئے لیکن ایک گجروں کا قافلہ جو 14 اگست کو اپنے مال مویشی لے کر پاکستان کی طرف پیدل چلا تھا وہ راستے ہی میں بمقام چھپا ہرٹہ سکھوں کی بربریت کا شکار ہو کر مارا گیا۔ ان کے مال و مویشی لوٹ لئے گئے۔ ہمارے محلے میں 5 مارچ کے سکھوں کے حملے میں محمد حفیظ دکاندار سکھ کے برچھے سے ہلاک ہو گئے، ہمارے محلے میں ایک استانی بنام سردار بیگم ہوتی تھی، اس کے پاس ہتھیار تو کوئی نہیں تھا جس سے وہ اس جتھے کو پسپا کرتی، اس نے فوراً اپنے کوٹھے کی دیوار سکھوں پر گرا دی جس سے کئی سکھ لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور حملہ استانی سردار بیگم کی دانائی و فراست اور جرأت و بہادری سے پسپا ہو گیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول مال روڈ کا کلرک بھی شہید ہو گیا۔ امرتسر میں کشمیری گھرانے تعلیمی میدان میں بہت آگے تھے اگرچہ میں بھی آگ اور خاک و خون کی ہولی سے بچ کر آئی تھی اور استانی سردار کی طرح ہمارے حوصلے بلند تھے اس لئے ہم نے مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے حکومت پاکستان کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مس طوسی انسپکٹر آف سکول میری خالہ تھیں۔ انہی کے سہارے میں ان کے ساتھ انڈیا گئی۔ فروری 1948ء سے لے کر ستمبر 1948ء تک ہم بھارت میں مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے کام کرتی رہیں۔ ہمارے ساتھ ملٹری تھی۔ ملٹری والے گاؤں گاؤں جاتے آوازے لگاتے کہ کوئی مسلمان لڑکی ہے تو باہر آ جائے ہم آپ کو لینے آئے ہیں اس طرح وہ ہر روز

مسلمان لڑکیاں اکٹھی کر کے لاتے اور ہمارے سپرد کر کے چلے جاتے۔ ہم کیمپ میں ان کی دلجوئی کرتے کوئی جانے کے لئے تیار ہوتی تو کوئی جانے کے لئے ہچکچاتی۔ مگر ہم انہیں تسلیاں دیتے کہ اب پاکستان بن گیا ہے تم وہاں آزادی سے رہ سکو گی مگر ان کی تسلی نہ ہوتی کوئی کہتی شاید ہمارے ماں باپ او بہن بھائی ہمیں اس حالت میں قبول نہ کریں۔ ہم ان کو تسلیاں دیتے اور کہتے کہ اس میں آپ کا کیا قصور! ماں باپ اور بہن بھائی آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ پھر لڑکیاں ہماری تسلی سے مطمئن ہو جاتیں۔ تقریباً تمام کنواری لڑکیاں حاملہ تھیں۔ لڑکیوں کو اکٹھا کرنے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ کسی کو سکھ چھپا لیتے تھے آنے نہ دیتے تھے کوئی خود ہی آنے سے گریزاں تھی کہ اب ہمارے پلے کیا ہے؟ عزت و ناموس تو لٹ گئی، ہم تو صرف پاپ کی گٹھڑی ہیں۔ بہرحال جب 40 لڑکیاں اکٹھی ہو جاتیں تو ہم انہیں ٹرک میں بٹھا کر لاہور روانہ کر دیتے، جالندھر، لدھیانہ، موگا، کپورتھلہ، پٹیالہ، فرید کوٹ، نابھہ اور جیند کی ریاستوں سے اور آس پاس کے علاقوں سے ہم نے تقریباً دس ہزار عورتیں برآمد کیں۔"

"اس کام میں مہارانی پٹیالہ نے رخنہ ڈالا کہ ہم لڑکیاں نہیں دیں گے کیونکہ پاکستان اپنے معاہدے سے منحرف ہو گیا ہے۔ وہ ہندو، سکھ لڑکیوں کو ہندوستان واپس نہیں بھیج رہا، میں نے فوراً ایک پاکستانی اخبار جو میرے پاس تھا۔ مہارانی پٹیالہ کو دکھایا جس کی سرخی یہ تھی کہ "ایک ہندو لڑکی بھارت جانے سے منکر ہے لیکن پاکستان نے اسے زبردست بھارت بھجوا دیا ہے کہ یہ ہمارے معاہدے کے خلاف ہے حالانکہ وہ ملتان سے لے کر لاہور تک روتی رہی۔ اخبار دیکھ کر مہارانی خاموش ہو گئی اور ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ رمضان کا مہینہ تھا ہم روزے سے تھے۔ ہم نے یہ کہہ کر شکریہ ادا کیا کہ ہم روزے سے ہیں۔"

کپورتھلہ میں تقریباً اڑھائی لاکھ مسلمان تھے جن میں سے صرف ایک لاکھ بچ کر پاکستان آئے وہاں سخت قتل عام ہوا۔ مس حسن صاحبہ بھی آپ کے وطن کی ہے۔ آپ کی طرح بہادر، اب میں آپ کا غائبانہ تعارف لاہور کی ایک باہمت خاتون بیگم ذکیہ جہانگیر سے کرواتا ہوں، ذرا سنئے!۔

بیگم ذکیہ نے کہا کہ ’’میں نے کم وبیش تین سال انڈیا میں مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے کام کیا ہے۔ فروری 1948ء سے لے کر 11 ستمبر 1948ء تک مختلف کیمپوں میں کام کیا، پھر قائداعظمؒ کی وفات پر تمام کیمپ بند کر دیئے گئے۔ صرف ایک کیمپ جالندھر میں جاری رہا۔ میں اس کیمپ میں اڑھائی سال کام کرتی رہی۔ ملٹری مسلمان لڑکیوں کو اکٹھا کر کے لاتی اور ان کی دیکھ بھال کرنا ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ علاوہ ازیں ان سے گالیاں اور فضول بکواس سننا بھی ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ سب سے پہلے ہم نے ہتک کیمپ میں کام کیا۔ یہ چھوٹا سا کیمپ تھا اور کوئی سہولت نہیں تھی۔ دہلی کیمپ میں تین ماہ کام کیا۔ پھر دریا گنج کیمپ سے تقریباً سو لڑکیاں برآمد کیں۔ بیس لڑکیاں کشمیر کی تھیں۔ بڑی اچھی اور سلجھی ہوئی، ان لڑکیوں سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں۔ وہ نہایت فرمانبردار تھیں۔ ہم نے انہیں بیگم شیخ عبداللہ کے حوالے کر دیا مگر گوڑ گاؤں کی لڑکیاں بہت تیز اور اجڈ تھیں ان لڑکیوں نے ہمیں بہت تنگ کیا۔ اگر انہیں مشرق کی طرف جانے کے لئے کہا جاتا تو وہ مغرب کی طرف جاتیں۔ وہ اپنے والدین کے پاس جانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے بغاوت کر دی کہ ہمیں پاکستان نہ بھیجا جائے۔ بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا اور ان کو سمجھایا کہ تمہارا ٹھکانہ پاکستان ہی ہے۔ تم ان کافروں کو بھول جاؤ یہ تو اسلام کے دشمن میں بڑی مشکل سے ان پانچیں بھرتی ہرنیوں کو دام میں لا کر پاکستان بھیجا۔‘‘

’’بعد ازاں پٹیالہ کیمپ میں دو ماہ کیا۔ یہاں ہمیں بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ یہاں مہاراجہ پٹیالہ کا قلعہ تھا جو کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ بہت بڑا قلعہ تھا۔ کئی کمرے تھے، کئی ایک راہداریاں تھیں۔ اگر کوئی چھپ جائے تو انہیں آسانی سے ڈھونڈا نہیں جا سکتا تھا، لہٰذا ان لڑکیوں کو بڑی مشکل سے اکٹھا کرنا مگر جب روانگی کا وقت آتا تو یہ چھپ جاتیں۔ کسی طور ہاتھ نہ آتیں۔ پاکستان کو گالیاں دیتیں، قائداعظمؒ کو برا بھلا کہتیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ دریدہ دہن لڑکیاں کس قدر بدتمیزی سے جناحؒ اور پاکستان کے خلاف زہر اگلتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ فاطمہ جناح کو بھی معاف نہ کیا۔ دروازے کے پاس بیٹھ کر کبھی سینہ کوبی کرتیں۔ کبھی رانوں پر ہاتھ مار مار کر کہتیں کہ ہم نے پاکستان نہیں جانا۔ یہ

پاکستان بھوکا ننگا ہے ہماری پٹیالہ سرکار تمام دنیا سے بہتر ہے۔ درخواستیں لکھ کر بھیجتیں کہ مہاراج ہمیں اپنے پاس رکھوا گر کبھی خوشگوار موڈ میں ہوتیں تو تالیاں پیٹ پیٹ کر بھنگڑے کے انداز میں تالی کی تان پر سر ملا کر کہتیں "اوہدی پکین دیاں لاداں لواواں وچ پٹیالے دے" پہلے تو میرے سمجھ میں نہ آیا کہ یہ لاواں کیا بلا ہے؟ پھر معلوم ہوا کہ لاواں کا مطلب ہے شادی کروانا۔"

"مجھے غصہ تو بہت آتا لیکن میں کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔ ہماری ملٹری اور پولیس والے بھی خاموش تماشائی بنے ان کا رچایا ہوا ناٹک دیکھتے رہتے کیونکہ ہم ان پر سختی کر نہیں سکتے تھے اس لئے وہ ہماری اس نرمی سے زیادہ یہ فائدہ اٹھا کر ہمیں گالیاں بھی دیتی تھیں۔ ایک دن ہمارے کیمپ میں سکھ جرنیل آیا اور سختی سے مجھے کہا کہ آپ لڑکیوں کو پاکستان کیوں نہیں بھیجتیں؟"

میں نے عرض کیا کہ میں کوشش کر رہی ہوں لیکن وہ پاکستان جانا نہیں چاہتیں۔ عین وقت پر ادھر ادھر چھپ جاتی ہیں۔ یہ وسیع و عریض قلعہ ہے میں انہیں ڈھونڈ نہیں سکتی اگر یہ لڑکیاں مل بھی جائیں تو میرے کہنے پر عمل نہیں کرتیں۔ ملٹری کو بھی کچھ نہیں مانتیں۔ میں تو ان سے عاجز آ گئی ہوں۔ شاید آپ کے کہنے پر عمل کریں۔ سکھ جرنیل غرایا کہ پاکستان ہمارے گلے پڑتا ہے کہ تم جان بوجھ کر لڑکیاں نہیں بھیج رہے ہو، تم وعدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اس نے چیخ چیخ کر قلعہ سر پر اٹھا لیا۔ ہر طرف ڈنڈا اچھال اچھال کر چھپی ہوئی لڑکیوں کو دس منٹ میں اکٹھا کر لیا اور سخت آواز میں تنبیہ کی کہ خبردار اگر کسی لڑکی نے رخنہ اندازی کی۔ اس ٹرک میں بیٹھو۔"

"لڑکیوں نے اپنی چادروں سے گھونگھٹ نکال لئے اور زار و زار رو رہی تھیں۔ جیسے ان کا ابھی کوئی مر گیا ہو۔"

"ٹرک میں سوار ہوتے ہوئے سلام نہ دعا۔ میں سوچتی رہ گئی کہ ان لڑکیوں کی تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یہ کس ماحول میں پل کر جوان ہوئی ہیں؟ نہ کوئی اسلامی طور طریقہ نہ اسلامی تہذیب ہے۔ یہ زیادہ تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں یا سکھوں نے انہیں

اچھی خوراک اور لباس دیا ہے اس لئے یہ اپنے والدین کے پاس پاکستان جانا نہیں چاہتیں۔ بہر حال وہ سکھ جرنیل کے سخت رویہ کی بناء پر پٹیالہ کیمپ سے جالندھر کیمپ میں پہنچ گئیں۔"

"مجھے دو ماہ کے بعد پٹیالہ کیمپ بھیج دیا گیا۔ میں نے وہاں ابھی ایک ماہ ہی کام کیا تھا کہ قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا اور تمام کیمپ بند کر دیئے گئے، صرف جالندھر کیمپ جاری رہا جس میں مجھے کام کرنا پڑا۔ یہاں بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور پٹیالن لڑکیوں نے بھی بہت تنگ کیا اور میری شکل دیکھ کر نہایت ناگواری سے کہا۔ "تم ابھی زندہ ہو؟ مری نہیں؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ یہ بہت جھگڑالو ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانے والی ہیں ایک بار پٹیالہ کیمپ سے یہ پچاس ساٹھ لڑکیاں فرار ہونا چاہتی تھیں مگر دروازے پر پہریدار نے ان کے فرار ہونے کی کوشش کو ناکام بنا دیا اور ان لڑکیوں نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت پہرے دار پر ہلہ بول دیا کہ اس کی چٹنی بنا کر فرار ہو جائیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔"

"اسی جھگڑے میں ایک لڑکی کے پاؤں پر دروازے کی پتری لگ گئی۔ لڑکی بہت مکار تھی۔ میاں رانجھا کی طرح خود ہی اپنا پیالہ توڑ کر پہریدار کے خلاف محاذ قائم کر لیا کہ شاید اسی بہانے ہم اپنی مراد پالیں۔ ان لڑکیوں نے بڑا ہنگامہ کیا، پہریدار پر الزام عائد کیا کہ اس نے ہمیں سنگین ماری ہے۔"

ایک دن ایک مسلمان لڑکی جو شیرانوالہ گیٹ نواں محلہ لاہور کی رہنے والی تھی، ہندو کے ساتھ ہی انڈیا فرار ہو گئی تھی جب جالندھر کیمپ میں لائی گئی تو وہ بار بار یہی کہے کہ نہ شراب کا گھونٹ ملتا ہے، نہ کوئی مرد ملتا ہے۔ ہمارے کیمپ انچارج راجہ عبدالرحمٰن ڈپٹی ہائی کمشنر تھے نہایت شریف النفس انسان تھے یہ جملے سن کر وہ آنکھیں نیچی کر لیتے، آخر ایک دن ان کا خون کھول اٹھا۔ کیمپ کا دروازہ کھول کر اسے گالیاں دے کہا کہ دفع ہو جاؤ باہر تمہیں شراب اور مرد مل جائے گا۔ یہاں یہ چیزیں نہیں مل سکتیں۔ وہ بڑے مزے سے اٹھی اور اپنے شناسا ہندو کے پاس پہنچ گئی۔"

اسی طرح ایک لڑکی نام اس کا غالباً منور تھا، لاہور کے رہنے والی تھی، وہ بھی اپنے

ہندو شناسا کے ساتھ لاہور چھوڑ گئی تھی۔ اس ہندو کی دکان مال روڈ پر تھی۔ اس لڑکی کے بھائیوں نے اپنی بہن کا نام درج کروایا اور ملٹری نے اس لڑکی کو ہندو کے تسلط سے آزاد کروایا اور جالندھر کیمپ بھیج دیا لیکن لڑکی نے جانے سے انکار کر دیا اور بھائی سے کہا کہ اب تو شرم کرو اس کا مال کھایا اس کی دکان سنبھالی، اب تم مجھے لینے آ گئے ہو؟ یہ اس کا بچہ ہے میں اس کی بیوی بن چکی ہوں تمہارے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔" مگر معاہدے کے مطابق لڑکی کو پاکستان آنا پڑا۔ مگر وہ پھر فرار ہو گئی۔"

اسی طرح ایک لڑکی نے اپنے سگے بھائی کو پہچاننے سے انکار کر دیا مگر اس لڑکے نے مجھے کہا کہ یہ میری بہن ہے اس کی چھاتی پر نشان ہے۔ واقعی چھاتی پر نشان تھا میں نے اس لڑکی کو سمجھایا اور پیار سے پوچھا تو اس لڑکی نے کہا میں نے اس بچے کی خاطر بھائی کو پہچاننے سے انکار کر دیا کیونکہ میں اس بچے کو چھوڑ نہیں سکتی۔ ان کا موقف تھا کہ مسلمانوں کے بچے سکھوں نے مار دیئے، اب ہماری گود میں سکھوں کے بچے ہیں ان کو مسلمان مار دیں گے، ہم کدھر جائیں؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیمپ میں ہر روز بچے پیدا ہوتے اور کئی مر بھی جاتے اور کئی بچوں کو ہندو سکھ اس لئے لے جاتے کہ بچے کی ماں نے پاکستان چلے جانا ہے اس لئے ہم اپنے بچے اپنے پاس رکھیں گے ان کو نہیں جانے دیں گے۔"

"یہ واقعہ بھی حیرت سے کم نہیں ہوگا کہ ایک دن ہمارے کیمپ میں تین مسلمان بہنیں آئیں، ایک چھوٹی بہن جس کی گود میں بچہ تھا خوب زیور سے لدی ہوئی بہترین لباس اور سامان تھا وہ پاکستان جانا نہیں چاہتی تھی، وہ پٹیالہ ریاست کے کئی وزیر کی بیوی بن چکی تھی لیکن دو بہنوں کو ہم نے پاکستان بھجوا دیا تھا اور اس چھوٹی بہن کو بھی ہم پاکستان بھجوانے کے لئے کوششیں کر رہے تھے کہ ہندو کیمپ کی انچارج میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کو بھی بہنوں کے پاس پاکستان بھجوانا ہے جہاں بہنیں ہیں وہاں یہ بھی جائے گی۔ وہ شریر مسکراہٹ لئے مجھے اپنے ساتھ اپنے کیمپ میں لے گئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ دونوں بہنیں وہاں کیمپ میں موجود تھیں، آخر ہمیں تیسری بہن

کو بھی ان کے حوالے کرنا پڑا۔ ان دونوں بہنوں نے بتایا کہ پاکستان میں کیا ہے؟ ہمیں کسی کے گھر نوکرانیاں بنا کر بھیج دیا۔ یہاں تو ہمارے آگے نوکر ہیں ہمیں کیا کسی کتے نے کاٹا ہے کہ ہم اپنا سکھ آرام چھوڑ کر پاکستانی لوگوں کے برتن صاف کریں، پھر مزے کی بات بتاؤں کہ جب ان لڑکیوں کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو میرے پاس آ کر طلب کرتے ہوئے یہ کہتیں کہ ہم پاکستان کے حق میں ہیں لیکن جب جانے کا مرحلہ آتا تو انکار کر دیتیں ہماری جان عذاب میں پھنسی ہوئی تھی۔ قائد اعظمؒ کی وفات پر خوشیاں منائیں۔ میں بھی ایک طرح کی قید ہی تھی نہ کہیں آنا نہ جانا کھانے کے لئے صرف دال اور ترکاری، راشن فی کس 3 چھٹانک آٹا اور ایک چھٹانک دال اور گھی ملتا تھا۔ ملٹری والے جب کبھی اپنے لئے بکرا ذبح کرتے تو مجھے بھی تھوڑا سا گوشت دے جاتے ورنہ دال ترکاری پر گزارہ ہوتا۔

میں نے تین سال کے بعد استعفیٰ دے کر پاکستان آ گئی، اپنے ساتھ ایک بچے کو لائی جسے سکھوں نے کرپان سے گردن کے دونوں اطراف گہرے زخم لگائے ہوئے تھے گویا بچے کو مار چکے تھے۔ بچے کی زندگی تھی کہ وہ صحت یاب ہو گیا۔ میں نے اس کی تربیت کی آج وہ ماشاءاللہ ایم اے پاس ہونہار فرمانبردار لڑکا ہے۔ میری نیک نیت کا ثمر مجھے اس طرح ملا۔

آخر کار میں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ کچھ ہوشیار بھارتی مسلمان پاکستان میں آتے مکان الاٹ کروا کر مالکانہ حقوق حاصل کرتے، پھر واپس اپنے وطن بھارت چلے جاتے۔"

(حمیدہ کاشمیری ایم۔اے کے ناول "47ء کی بیٹی سے")

......☆......

علاقہ بیٹ (دریائے ستلج) کی سرگزشت

راقم الحروف مؤلف کتاب (اخراج اسلام از ہند) دریائے ستلج کے علاقہ بیٹ واقعہ تحصیل نکودر کے ایک گاؤں بھدم تھانہ شاہ کوٹ کا باشندہ تھا۔ میں نے زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں ملک وملت کی صحافتی خدمات بجالاتے ہوئے بسر کیا تھا لیکن خدائے حکیم و خبیر کی اَن دیکھی اور اَن بوجھی مصلحتوں کو منظور تھا کہ میں مسلمانان ہند کی تاریخ کے ان پرآشوب ایام میں قوم پر وارد ہونے مصائب کا شریک حال بنوں، اس لئے ماہ جون کے آخری دنوں میں شدید طور پر علیل ہونے کے باعث میں اپنے گاؤں کو جاچکا تھا۔

جون کے آخر میں شہر لاہور میں عمارتوں اور مکانوں کو آگ لگانے کی وارداتیں کثرت سے ظہور پذیر ہونے لگی تھیں اور شہر کے مختلف اقطاع پر مسلسل 72,72 گھنٹوں کا کرفیو نافذ ہو رہا تھا۔ بیمار آدمی کے لئے وہاں ٹھہرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ گاڑی امرتسر سے گزری تو وہاں بھی شہر کے مختلف حصوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ گاڑی میں بہت سے ہندو خاندان ہم سفر تھے جو لاہور کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کی طرف نقل مکانی کر رہے تھے۔

رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں، میں ابھی بصیغہ عُلالت گاؤں سے باہر ایک مکان میں پڑا صحت یابی کا انتظار کر رہا تھا کہ 15 اگست کو پاکستان اور ہندوستان الگ الگ ہوگئے اور ہمیں جالندھر کے مسلم لیگی کارکنوں کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ خان افتخار حسین خان والئ ممدوٹ صدر صوبہ مسلم لیگ نے یقین دلایا ہے کہ ضلع فیروز پور کی تحصیل

زیرہ اور ضلع جالندھر کی تحصیلیں نکودر اور جالندھر حد بندی کمیشن کے فیصلہ میں پاکستان کی طرف جائیں گی۔

17 اگست کو حد بندی کمیشن کے فیصلہ کا اعلان ہو گیا لیکن ہمارے علاقہ میں کئی دن تک یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ فیصلہ کی نوعیت کیا ہے کیونکہ ڈاک معطل ہو چکی تھی۔ قریب کے دیہات میں جن لوگوں کے پاس ریڈیو کے سیٹ تھے وہ بیٹریاں ختم ہو جانے کے باعث بے کار پڑے تھے۔

تین ماہ بعد لاہور پہنچ کر معلوم ہوا کہ حد بندی کمیشن کے فیصلہ کا حال زعمائے کرام کو 7 اگست کو ہی معلوم ہو چکا تھا اور وہ جان چکے تھے کہ یہ تحصیلیں ہندوستان میں شامل ہو رہی ہیں۔ اس علم کی بناء پر انہوں نے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو پاکستان میں لانے کی کوششیں بھی شروع کر دی تھیں۔ (مؤلف)

18 اگست کی شام کو غروب آفتاب کے قریب دریائے ستلج کے پار سے مسلمان پنہ گزینوں کی ٹولیاں بیٹ کے دیہات میں وارد ہونے لگیں۔ وہ عید کا دن تھا۔ ہمارے گاؤں میں جو لوگ پہنچے، وہ اندگڑھ تحصیل زیرہ کے باشندے تھے۔ انہوں نیب تایا کہ سکھ جتھوں نے موضع اندگڑھ کو تباہ کر دیا ہے۔ مسلمان خانماں برباد ہو چکے ہیں۔ علاقہ بیٹ تحصیل نکودر میں مسلمانوں کی اسی فیصدی اکثریت آباد تھی۔ کہیں کہیں سکھوں کا کوئی گاؤں یا سکھوں اور مسلمانوں کا کوئی مشترکہ گاؤں نظر آتا تھا۔ اس علاقہ کے سکھ مسلمانوں کے سامنے بھیگی بلی کی مانند رہتے تھے اور مسلمانوں کی اکثریت کے باعث بہت خوفزدہ تھے۔ مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ اس سکھ اقلیت اور اکا دکا ہندو بنیوں کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے تاہم عام مسلمان ناگوار حادثات کا مقابلہ کرنے کے لئے گنڈاسے، بھالے، نیزے، تلواریں اور چھرے بنوانے لگے اور بارود کی نالیوں کے تجربے کرنے لگے جو توڑے دار بندوق کی طرح لوہے کے ٹکڑے پھینک سکتی تھیں۔

دور دور سے مسلمانوں کے قتل عام کی اطلاعات پہنچنے لگیں۔ مقابلوں اور مقاتلوں کی خبریں آنے لگیں۔ راستے مسافروں کے لئے پر خطر ہو کر مسدود ہو گئے، افواہیں اور

متضاد خبریں اس کثرت سے پھیلنے لگیں کہ صحیح کیفیت کا جانچنا ناممکن ہوگیا تاہم ایک بات یقین کے درجہ تک پہنچ گئی کہ دریائے کے پار ضلع فیروز پور اور ضلع لدھیانہ کے دیہات میں مسلمان تباہی و بربادی کا شکار ہو رہے ہیں وہاں سے پناہ گزینوں کی جمعیتیں برابر اس علاقہ میں وارد ہو رہی تھیں اور بعض اوقات رات کے وقت دریا کے پار جلتے ہوئے دیہات کے شعلے بھی نظر آنے لگے تھے۔ دریا کے پار گوجروں کے جو بیس بائیس دیہات کی ایک زنجیر سی بنی ہوئی تھی، وہ ٹوٹ گئی اور اس کے باشندے دریا کی گود میں دو نالوں کے درمیان ایک بڑے جزیرے کے جنگل میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

علاقہ بیٹ میں بھی خوف و ہراس پھیلنے لگا۔ گاؤں گاؤں میں حفاظت کی تدابیر سوچی جانے لگیں۔ دیہات نے فیصلہ کیا کہ خطرے کے وقت ایک دوسرے کی امداد کو پہنچیں گے لیکن یہ سب اضطراری کیفیات تھیں۔ حفاظت و مدافعت کے لئے نظم کا ہونا ایک لازمی امر تھا لیکن یہ بات سرے سے مفقود تھی۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہمارا علاقہ ہندوستان میں شامل ہو چکا ہے اس لئے لوگ بددل ہو رہے تھے۔ ان اقطاع کے باشندے پشتوں سے پرامن زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے اس لئے بدنظمی کے دور میں صحیح دفاعی تدابیر کو سوچنے تک کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ چہ جائیکہ ان پر ثابت قدم کے ساتھ عمل کر سکتے۔

اگست کے اواخر میں ایک رات علاقہ بیٹ کے دیہات میں خطرے کے نقارے بجنے لگے۔ لوگ جوق در جوق نکل کھڑے ہوئے کئی میل چل کر لوہ گڈھ کے قریب جمع ہو گئے جہاں پہلے پہل خطرہ کا الرم ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ الارم بے بنیاد تھا اس لئے سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

دریا کے پار اضلاع فیروز پور، لدھیانہ اور جالندھر کی حدیں ملتی تھیں۔ آغاز ستمبر میں قصبہ کشن پور ضلع فیروز پور کے سکھوں نے اردگرد کے سکھ دیہات سے جتھے منگوا کر قصبہ تہاڑہ ضلع لدھیانہ کے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ شدید جنگ وقوع پذیر ہوئی۔ سکھوں نے شکست کھائی۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر ان کے ایک دو گاؤں جلا دیئے اور کئی میل تک سکھوں کا تعاقب کر کے سینکڑوں سکھ جہنم رسید کئے، راستے میلوں تک ان کی لاشوں سے پٹے

پڑے تھے لیکن اس خوف سے کہ اب ہندوستان کی فوج تہاڑہ سے انتقام لے گی۔ تہاڑہ اور گردونواح کے دیہات کے مسلمان دریا کے پار علاقہ بیٹ میں آنے لگے جو باقی رہ گئے، انہیں اگلے دن ملٹری نے آن گھیرا اور سکھ جتھوں نے ان کا قتل عام کر دیا۔ ملٹری چیدہ چیدہ اشخاص کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔

آغاز ستمبر میں علاقہ بیٹ کے مشرقی سرے پر موضع تلون تحصیل پھلور میں معرکے کا رن پڑا۔ اس موضع میں حبیب اللہ خان اور حفیظ اللہ خان دو بھائیوں نے اپنے قلعہ میں حفاظتی تدابیر درست کر رکھی تھیں۔ اپنے طور پر کچھ بندوقیں اور رائفلیں بھی فراہم کر لی تھیں۔ ایک باقاعدہ عسکری جماعت بھی منظم کر لی تھی۔ گردونواح کے دیہات نے حبیب اللہ خان کو اپنا امیر سمجھ رکھا تھا۔ ان دیہات کے جوان خطرے کے وقت ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے تھے۔ تلون اور اس کے نواحی دیہات میں تین دن جنگ جاری رہی۔ سکھوں نے شکست کھائی۔ ملٹری جو سکھوں کی امداد کے لئے آئی تھی اس نے بھی شکست کھائی۔ مسلمانوں نے سکھوں کے تین چار گاؤں جلا دیئے۔ یلغار کو منظم طریق سے جاری رکھنے کا انتظام نہ تھا اس لئے دیہات کے لوگ شام کے وقت گھروں کو لوٹ آئے تھے اور معرکہ کے وقت لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو جاتے تھے تاہم امیر حبیب اللہ خان کی منظم جمعیت سکھوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی۔ یہ جمعیت صحیح اسلامی اصول کے مطابق لڑتی تھی۔ امیر حبیب اللہ خان نے ہدایت کر رکھی تھی کہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ صرف ان لوگوں سے لڑنا جو مقابلہ کے لئے آئے ہوں۔ قصبہ تلون کے ہندوؤں نے سکھوں کی پناہ میں جانے کی بجائے امیر حبیب اللہ خان کی پناہ میں رہنے کی ترجیح دی اور مسلمانوں نے ان کی حفاظت میں کسی قسم کا دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

انہی دنوں میں تلون سے چند میل کے فاصلے پر سکھوں کے گاؤں ہلکہ قریب کے سکھوں نے ایک ریل گاڑی روک کر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اگلے دن ان کا ایک جم غفیر مسلمانوں کے دیہات پر حملہ کرنے کے ارادہ سے جمع ہو رہا تھا کہ بلوچ رجمنٹ کا ایک دستہ اس طرف آ نکلا، اس نے سکھوں پر فیر کر کے اس ہجوم کو منتشر کر دیا۔ تلون کے نواحی

دیہات میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں راقم الحروف کے ایک عم زاد بھائی مولوی جمیل احمد خاں بھی شہید ہو گئے۔ مولوی صاحب مرحوم برج چنیاں کے ایک تکیہ میں بیٹھے تھے، گاؤں کے کچھ لوگ بھی وہیں جمع تھے کہ سرشام سکھوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگے لیکن مولوی صاحب مرحوم نے بھاگنے سے انکار کر دیا۔ معلوم نہیں کہ ان پر لوگوں کے چلے آنے کے بعد کیا گزری۔

اواخر اگست میں علاقہ بیٹ کے چند سرکردہ مسلمان وفد بنا کر تحصیل نکودر کے سکھ تحصیلدار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور التجا کی دریا کے پار ضلع فیروز پور اور ضلع لدھیانہ کے دیہات میں بدامنی پھیل رہی ہے۔ دریا چند دنوں تک پایاب ہو جائے گا اس لئے آپ علاقہ بیٹ کو بدامنی سے بچانے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کریں تاکہ دریا پار کے سکھ جتھے آپ کی تحصیل کے امن کو برباد نہ کر پائیں۔

تحصیلدار نے جواب دیا کہ آپ فکر نہ کریں، میں دریا کو پایاب نہیں ہونے دوں گا۔ وفد اس جواب سے حیرت زدہ ہو گیا لیکن وہ سچ کہہ رہا تھا کہ دریا کے پایا ہونے سے پہلے پہلے اس علاقہ کے مسلمانوں کو اٹھنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔

آغاز ستمبر میں جب تیس میل لمبے اور آٹھ دس میل چوڑے علاقہ بیٹ کے جنوب میں تہاڑہ ضلع لدھیانہ اور مشرق میں تلون تحصیل پھلور میں معرکے ہو رہے تھے، سکھ جتھوں نے اس علاقہ کے شمال میں کانگنہ نامی ایک گاؤں پر بھی جنگ کا محاذ قائم کر لیا۔ کانگنہ کے لوگ تین دن مقابلہ کرتے رہے۔ دو دن انہوں نے حملہ آور جتھوں کو شکست دے کر بھگا بھگا دیا۔ تیسرے دن سکھ ملٹری کی جمعیت لے کر آئے۔ کانگنہ میں تباہی مچا دی۔ لوگ گولیوں کی بے پناہ بارش کے درمیان سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ لاتعداد عورتیں عصمت بچانے کے لئے کنوؤں میں کود گئیں۔ بیسیوں مرد، عورتیں اور بچے کاٹ دیئے گئے۔ بہت گولیوں کا نشانہ بنے، بچے کھچے لوگ علاقہ بیٹ کے دیہات میں پھیل گئے۔

انہی دنوں میں علاقہ بیٹ کے شمال مغربی گوشے کے ایک گاؤں میانوال کے ذیلدار میاں محمد اسلم نے سکھوں کو شمالی دیہات میں تباہی مچاتے ہوئے دیکھ کر مسلمانوں کو

جمع کیا اور قریب کے سکھ دیہات پر ہلہ بول دیا۔ اس لشکر نے سکھوں کے تین چار دیہات یکے بعد دیگرے تاراج کیے۔ سکھ مسلمانوں کو آتا دیکھ کر گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ سرِ شام لشکر تھک گیا، ابھی آگے سکھوں کے دوسرے دیہات پڑے تھے لیکن تھکاوٹ کے باعث لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور جمعیت منتشر ہو گئی۔

اگلے دن 4 ستمبر کو سکھوں کے جمِ غفیر نے میانوال پر حملہ کیا، مسلمان مقابلے کے لئے پھر جمع ہوئے۔ محمد اسلم ذیلدار کو تھانیدار اور ملٹری کے افسروں نے تھانہ میں بلا بھیجا تھا۔ وہ بے خوف و خطر وہاں چلے گئے۔ تھانے سے باہر نکلے ہی تھے کہ کچھ لوگوں نے جوان کی گھات میں بیٹھے تھے ان پر گولی چلا دی اور محمد اسلم شہید ہو گئے۔ مسلمان ان کی شہادت کے باعث بددل ہو گئے اور میانوال کے نواحی دیہات خالی ہونے لگے۔

کانگنہ اور میانوال کے مورچے تین دن کی لڑائی کے بعد بیک وقت 4 ستمبر کو ٹوٹے۔ امیر حبیب اللہ خان نے جو ابھی تک اپنے قلعہ میں ڈٹے ہوئے تھے اس روز نکون کے نواحی دیہات میں چکر لگا کر اعلان کر دیا کہ سب مسلمان اپنے اپنے دیہات خالی کر کے کسی ایک مقام پر جمع ہو جائیں۔ چنانچہ متذکرہ صدر تین مقامات کے اردگرد کے مسلم دیہات اسی روز خالی ہو گئے اور سکھ جتھے ان دیہات کو لوٹنے اور آگ لگانے لگے۔

یہ حال دیکھ کر دریائے ستلج کے کنارے کے مسلم دیہات بھی ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 5 ستمبر کو میرے اپنے گاؤں کی غالب اکثریت اپنا ضروری سامان بیل گاڑیوں پر لاد کر گاؤں سے باہر کنوؤں پر چلی گئی اور جب کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا تو لوگ بال بچوں سمیت اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

6 ستمبر کو علی الصبح روانگی شروع ہو گئی۔ راقم الحروف کے خاندان نے ہجرت کی کوئی تیاری نہ کی تھی۔ گاؤں خالی ہو رہا تھا اس لئے میں ا۔ نے خاندان کی عورتوں، بچوں اور کنبہ کے جوان لڑکوں کو لے کر دریا کی طرف چلا گیا۔ خیال یہ تھا کہ گڑبڑ چند دن رہے گی اور وہ دن ہم دریائے ستلج کی گود میں جھاڑیوں کے جنگل میں چھپ چھپا کر گزار لیں گے اور جب پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت میں امن قائم کر لے گی تو اپنے گھروں میں واپس آ جائیں

گے۔ ہمیں اس بات کا قطعی علم نہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کے آسمانوں میں ہماری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے اور قائداعظم محمد علی جناحؒ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 29 اگست کو لاہور میں کانفرنس کر کے یہ بات طے کر لی ہے کہ قسمت جالندھر تک کے اضلاع کی مسلم آبادی کا تبادلہ مغربی پنجاب کی ہندو اور سکھ آبادی کے ساتھ کیا جائے گا۔

6 ستمبر کی صبح کو ہم دریا کے کنارے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں جا بیٹھے۔ اس مقام کے سامنے ایک میل تک دریا کا ریتلا طاس پھیلا ہوا تھا اور آگے دریا تھا۔ اس ریتلے طاس میں سے دو پگڈنڈیاں شرقاً غرباً گزر رہی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ کے آگے نالہ کے کنارے کے ساتھ ساتھ بڑا راستہ گزرتا تھا اور پیچھے یعنی گاؤں کی طرف ایک اور پگڈنڈی واقع تھی۔ ہم وہاں جا کر بیٹھے تو دیکھا کہ خانماں برباد لوگ قطار در قطار سروں پر بوجھ اٹھائے ان چاروں راستوں سے گزر رہے ہیں اور مغرب سے مشرق کی طرف جانے کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری ہے۔ بڑے راستے پر سے بیل گاڑیوں کے قافلے گزر رہے تھے۔ دریا کے ریتلے طاس کی پگڈنڈیوں پر سے وہ گوجر لوگ جا رہے تھے جو کئی دن سے دریا کی گود میں بیٹھے تھے۔

دوپہر کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر مہاجرین کی رفت و گزشت میں کمی واقع ہو گئی۔ ہمارے گاؤں سے غرب کی طرف کے تمام دیہات خالی ہو گئے۔ ظہر کی نماز کے وقت ہم نے دیکھا کہ مغرب کی جانب سے لوگوں کی ٹولیاں سراسیمگی کے عالم میں بھاگی چلی آ رہی ہیں ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہم لوگ بھمیاں کے رہنے والے ہیں جو ہمارے گاؤں سے مغرب کی طرف تین میل کے فاصلے پر واقع تھا وہاں سے مسلمان نکل رہے تھے۔ کچھ گاؤں سے باہر بیل گاڑیاں لئے دریائی نالہ کے کنارے پر چلنے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بہت سے مسلمانوں کو شہید کر ڈالا۔ کئی ایک عورتوں کو چھین لیں۔ کئی عورتوں نالے میں چھلانگ لگا کر ڈوب گئیں۔

سکھوں کے گھڑ سوار لوگ دریا کے کنارے کنارے اس طرف چلے آ رہے ہیں اور جو مسلمان قافلے سے پیچھے رہ گئے ہیں انہیں قتل کر رہے ہیں۔ یہ سن کر میں نے کنبہ کے

افراد کو درختوں کے جھنڈ سے نکال کر مکئی اور گنے کی فصلوں کے درمیان بٹھادیا۔ ہمارے پاس صرف تلواریں اور بھالے تھے۔ آتشیں ہتھیار کوشش کے باوجود نہیں مل سکے تھے۔

اب وہاں اخی المکرم آغا غلام رسول خان جو گھر میں رہ گئے تھے، پہنچے ان کے ساتھ گاؤں کے دو تین اشخاص بھی تھے جو گاؤں سے دو میل دور نکل کر ہمیں ہجرت پر آمادہ کرنے کی نیت سے واپس لوٹے تھے اخی المکرم نے بتایا کہ سب دیہات خالی ہو چکے ہیں اور سکھ قریب کے گاؤں سانڈ کے خالی گھروں کو جو نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا، لوٹ رہے ہیں۔ اس حال میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ گیا تھا کہ ہم بھی اسی طرف کی راہ لیں، جدھر سب لوگ جا چکے تھے لہٰذا اخی المکرم اور میرے ایک عم زاد بھائی تو گھر کو واپس لوٹ گئے کہ بھینسوں کو ہانک لائیں تا کہ راستے میں بچوں کو دودھ ہی مل سکے۔

میں خاندان کے ذکورواناث کو لے کر وہیں سے پرجیاں کلاں کی طرف روانہ ہوگیا۔ جوان اطراف کے مہاجرین کی پہلی منزل مقصود تھی ۔اس طرح ہم لوگ بے سروسامانی کے عالم میں گاؤں کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوگئے۔

اخی المکرم اور میرے ایک عم زاد بھائی مولوی نجم الدین گھر پہنچے، وہ آگ سلگا کر حقے کے کش لگا رہے تھے کہ سکھ لٹیرے آ کر ہمارے گھروں کا بیرونی پھاٹک توڑنے لگے۔ دونوں بھائی پچھواڑے کے ایک چھوٹے دروازے کی راہ سے نکل کر فصلوں میں سے گزرتے ہوئے پرجیاں کلاں کی طرف چل پڑے اور گاؤں سے باہر قبرستان کے قریب جا کر ہمارے ساتھ مل گئے۔ لٹیرے گاؤں کے مغربی سرے پر ہمارے گھروں کو لوٹ رہے تھے اور ہم گاؤں کی مشرقی سمت میں پرجیاں کلاں کی طرف جا رہے تھے۔ دو میل چلنے کے بعد ہم مہاجرین کے قافلے کے عقبی حصہ میں شامل ہوگئے جو وہاں سستا رہا تھا۔

سارے قافلے نے رات پرجیاں کلاں کے قریب پڑاؤ ڈال کر بسر کی۔ تعداد کوئی دس ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اگلے روز قافلہ وہاں سے روانہ ہوا اور کوئی تین میل چل کر بڈھے دریا کے کنارے پر جا بیٹھا۔ بارشوں کی وجہ سے راستے دلدل ہو رہے تھے اس لئے بیل گاڑیاں چلانے میں بڑی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ لوگ اپنا قیمتی سامان اور گندم کی

بوریاں بوجھ ہلکا کرنے کے لئے راستے میں پھینکتے چلے گئے۔

8 ستمبر کو بڑھے دریا کو عبور کر کے تین چار میل کا سفر طے کیا اور ہم مہت پور پہنچ گئے۔ گاؤں سے لے کر مہت پور تک کے دیہات ایک دو روز قبل اٹھ چکے تھے۔ مہت پور سے نکودر کو جانے والی سڑک پر دونوں طرف کیمپ لگ رہا تھا۔ لوگ آسمان کی نیلی چھت کے نیچے چادریں تان سائے بنا کر بیٹھ گئے۔ نکودر کا کیمپ بھرپور ہو چکا تھا۔ مہت پور کا کیمپ بھی بھر گیا۔ مہت پور سے نکودر تک چھ میل کی مسافت میں سڑک کے آس پاس کوئی دو لاکھ انسانوں کا جم غفیر جمع ہو رہا تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ قافلہ اسی طرح چلتا ہوا پاکستان کی راہ لے گا لیکن نکودر اور مہت پور میں جا کر دن گزرنے لگے۔ دونوں جگہ ملٹری کی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔

مہت پور میں گورکھا گارد متعین تھی جس نے ہمارے جانے سے ایک روز قبل تین سکھوں کو کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے باعث گولی کا نشانہ بنا لیا تھا۔ یہ لاشیں ہم نے وہاں پڑی دیکھیں۔

دن گزرتے گئے۔ ہفتے گزرتے گئے۔ مہینہ گزر گیا لیکن مصائب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کبھی کبھار پاکستان کی ملٹری کے لوگ ٹرک لے کر آتے تھے اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو لے جاتے تھے۔ بعض ہوشیار اشخاص نے آغاز ستمبر ہی میں دیہات میں ٹرک بھیج بھیج کر اپنے اعزاء اور اقرباء کو نکال لیا تھا۔ سیکرٹری جنرل پاکستان کے بھیجے ہوئے ٹرک ستمبر کے ابتدائی دنوں ہی میں جبکہ لوگ ابھی اپنے اپنے گھروں میں امن چین سے بیٹھے تھے ان کے رشتہ داروں کو گاؤں سے نکال لے گئے تھے۔

15 اکتوبر کو میں نے کیمپ مہت پور کی کیفیات پر مشتمل ایک بیان گھسیٹ کر ٹرک میں سوار ہونے والے ایک شخص کو دیا کہ لاہور پہنچ کر کسی روزنامہ میں چھپوا دے۔ یہ بیان نومبر کے آخر ایام میں ڈاک کے ذریعے اپنی منزل مقصود پر پہنچایا گیا جبکہ میں لاہور پہنچ چکا تھا۔

سیکرٹری جنرل پاکستان مسٹر محمد علی علاقہ بیٹ کے ایک گاؤں ننگل انبیا کے رہنے

والے تھے۔ لاہور پہنچ کر معلوم ہوا کہ پاکستان اور مغربی پنجاب کے وزرائے کرام اور مسلم لیگ کے زعمائے عظام اور پاکستان گورنمنٹ کے بڑے چھوٹے عہدیداروں میں سے اکثر نے اپنی پوزیشنوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے رشتہ داروں کو نکال لانے کا بندوبست کیا۔

15 اکتوبر کو یہ چھٹی لکھی گئی، 16 اکتوبر کو مہت پور کیمپ پر حملہ ہوا۔ گھڑ سوار سکھوں نے ان مسلمانوں کو جو کیمپ سے نکل کر میل آدھ میل کے فاصلے پر گھاس کھود رہے تھے، گولیوں کا نشانہ بنالیا۔ گھنٹہ بھر گولیاں چلتی رہیں اٹھارہ مسلمان شہید ہوئے اور کچھ زخمی ہو گئے۔ کیمپ پر بھی گولیاں پھینکی گئیں لیکن حملہ آوروں کو کیمپ کے نزدیک آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ گھنٹہ بھر کے بعد ادھر مہت پور سے ملٹری کی گارد نکلی ادھر نکودر سے ملٹری کا ایک گورا میجر جیپ کار دوڑاتا ہوا آن پہنچا۔ کچھ جوان کیمپ سے مقابلے کے لئے نکلے، سکھ جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ حال دیکھ کر بھاگ گئے۔

اس وقت کے بعد قتل کی وارداتوں میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ ملٹری کی گارد اجرت لے کر گھاس اور چارہ لانے والے گروہوں کے ساتھ جانے لگی۔ اس حفاظت کے باوجود سکھ لوگ چھپ چھپا کر ادھر ادھر بکھرے ہوئے مسلمانوں میں سے دو چار کو قتل کر دیتے تھے۔ مسلمان کیمپ میں قیدیوں کی سی حیثیت میں تھے ان سے تاب مقاومت اور مقابلے کی ہمت یکسر مفقود ہو چکی تھی۔ سکھ مسلمانوں کو اس طرح مار رہے تھے جس طرح جنگل کے جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ اکتوبر کے آخر میں نکودر کیمپ سے پناہ گزینوں کے قافلے جالندھر کی طرف روانہ ہونے لگے اور مہت پور کیمپ کے لوگ وہاں سے اٹھ کر نکودر کیمپ میں آ گئے۔ 2 نومبر کو نکودر سے بہت بڑا قافلہ پیادہ چلایا گیا۔ صرف چند ہزار آدمی جو بیمار اور ناتواں تھے، باقی رہ گئے۔ ان کے لئے بعد میں سپیشل گاڑیاں چلائی گئیں۔

بڑا قافلہ ایک ہی دن میں گیارہ بارہ میل کا سفر طے کر کے پرتاپ پور پہنچا۔ اگلے دن چار میل کا سفر طے کر کے کھرلہ کنگرہ میں قیام پذیر ہوا۔ ان مقامات پر پہلے بھی متعدد قافلے قیام کر کے گزر چکے تھے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بتا رہے تھے کہ بہت سے کاروان اس راہ سے گزر چکے ہیں۔ پرتاپ پورہ اور کھرلہ کنگرہ کی فوجی گاردیں پاکستانی تھیں جن کے

افسر اور سپاہی پناہ گزینوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے تھے۔

کمرلہ کنگرہ میں چند روز ٹھہرنے کے بعد 11 نومبر کو گڑھا کیمپ میں جانے کا حکم ملا جو وہاں سے تیل میل دور تھا۔ یہ کیمپ ریلوے لائن پر واقع تھا۔ دوسرے تیسرے دن اسپیشل گاڑی آتی تھی اور پناہ گزینوں کو لاد کر چلی جاتی تھی۔ 15 نومبر کو جب کیمپ کی آبادی کسی قدر ہلکی ہوگئی، حفاظتی گارد بدل گئی اور ہندو جاٹ رجمنٹ کی گارد متعین ہوگئی۔ اس گارد نے آتے ہی ان ہندو دکانداروں کو بھگا دیا جو کیمپ کی حدوں پر خوردنی اشیاء فروخت کر رہے تھے۔ رات کے وقت ان پہرہ داروں نے کیمپ میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ تلاشی لینے کے بہانے سے لوگوں کے ٹرنک کھلواتے تھے اور نقدی اور زیور ہتھیا لیتے تھے۔ عورتوں پر دراز دستی کرنے کی وارداتیں بھی ہوئیں۔ عشاء کے وقت جو عورتیں کیمپ کی حد کے قریب رفع حاجت کے لئے گئیں۔ جاٹ سپاہیوں نے ان سے چھیڑ چھاڑ کی۔ شور و غل بلند ہوا۔ بعض جگہ مار پیٹ کی نوبت بھی آئی۔ جاٹ سپاہی رات بھر کتوں کی طرح کیمپ میں پھرتے رہے۔

اگلے روز بعض مسلمانوں نے پناہ گزینوں کو دیہات سے نکال نکال کر لانے والے مسلمان فوجیوں سے رات کا ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے چھاؤنی جالندھر پہنچ کر پاکستان کے لیزن آفیسر کو اطلاع دی۔ چھاؤنی سے دو مسلمان کپتان تحقیقات کے لئے آئے انہوں نے جاٹ گارد کی تلاشی لی اور مسلمانوں سے کہا کہ گارد والوں کو تنبیہ کر دی گئی ہے تاہم تمہیں چاہئے کہ بکھر کر بیٹھنے کے بجائے اکٹھے ہو کر بیٹھیں اور تنگی کے ساتھ دو چار دن گزار لیں۔

گڑھا کیمپ سے تیسرے چوتھے روز ایک سپیشل گاڑی چلتی تھی۔ لوگ بدحواس ہو کر اس پر لد جاتے تھے، حشر کی ہی نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر گاڑی کے چلنے کے بعد بڑے ہی دلگداز مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔ لوگ اپنی بیمار اور بوڑھی ماؤں تک کو پیچھے چھوڑ کر سوار ہو گئے جنہوں نے لاوارثی کے عالم میں سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی۔ ماؤں کو گاڑی پر سوار ہونے کی بدحواسی میں بچوں کو سنبھالنے کی ہوش نہ تھی۔ گڑھا کیمپ میں لاوارث مردوں کو سنبھالنا مستقل مسئلہ بن گیا جس سے باقی رہنے والوں میں سے درددل

رکھنے والے لوگ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے۔

17 نومبر کو جو اسپیشل آئی، اس پر راقم الحروف اپنے خاندان کے افراد کو لے کر سوار ہوسکا۔ اس کے بعد کیمپ میں صرف ایک اسپیشل گاڑی کی نفری باقی رہ گئی تھی۔ گاڑی رات بھر مانانوالہ اور اٹاری کے اسٹیشنوں پر کھڑی رہی اور 18 کی صبح کو واہگہ اسٹیشن پر پہنچ گئی۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی ، چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

قضاؤ قدر کو منظور تھا کہ بیگانوں کے ظلم وستم سہنے کے بعد اپنوں کے جور و جفا کی کیفیات بھی دیکھ لیں، اس لئے پاکستان پہنچا دیئے گئے۔

سلطان پور ریاست کپورتھلہ کے ایک مہاجر کا بیان ہے کہ پانچ یا چھ ستمبر کو صبح دس بجے تمام مسلمان آفیسر تبدیل کر دیئے گئے اور سہ پہر کو حملہ کر دیا گیا اور مسلمانوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ سلطانپور اور گرد و نواح کے دیہات کے لوگ بھلانا میں جمع ہونے لگے۔ بارہ دن اس کیمپ میں قافلوں کی آمد آمد رہی۔ آخر ایک لاکھ کا قافلہ جو بیل گاڑیوں اور پیادہ چلنے والوں پر مشتمل تھا۔ کپورتھلہ کی طرف چلا گیا۔ اس سے قبل تلونڈی چودھریاں اور سوال کے کیمپوں سے قافلے چلائے جا چکے تھے۔ ہمارا قافلہ جب کپورتھلہ سے آگے نکل کر سبحان پور کی طرف روانہ ہوا تو سبحان پور سے تین چار میل کے فاصلے سے روک لیا گیا وہاں کپور تھلہ کی افواج کا کمانڈر رجے سنگھ کھڑا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر بئیں سیاہ (گھر اٹاں والی بئیں) کا پل تھا جس پر سے گزر کر قافلے کو آگے جانا تھا جسے سنگھ نے دو دو ہزار کا قافلہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چلایا۔ پل کے پار سکھوں کا جتھا کھڑا تھا جو پل پر سے گزرنے والوں کو قتل کر رہا تھا۔ یہ قصہ تھوڑی دیر تک جاری رہا۔ آخر سبحان پور سے مسلمان ملٹری کی ایک گارڈ موقع پر پہنچ گئی جس نے باقی قافلے کو قتل ہونے سے بچالیا۔ قافلہ سبحان پور پھیرہ ہوتا ہوا دریائے بیاس کو عبور کر کے خلجیاں کے کیمپ میں پہنچا جہاں بھاری سیلاب آگیا اور بڑی تباہی مچی۔ ڈوگرا ملٹری نے خلجیاں سے واہگہ تک پچیس چھبیس میل ایک ہی دن چلا کر

پاکستان پہنچایا۔ راستے میں بہت سی مخلوق خدا جاں بحق تسلیم ہوئی۔

1947ء کے قتل و غارت گری کی داستان بہت لمبی ہے، کم از کم دس لاکھ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد سولہ سے بیس لاکھ تک ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق پٹیالہ، کپورتھلہ، فرید کوٹ، جنڈ اور نابھہ کی ریاستوں میں 8 لاکھ 33 ہزار مسلمان آباد تھے۔ ان میں سے اکثر کو اگست ستمبر 1947ء میں نیست و نابود کر دیا گیا۔ صرف پٹیالہ سے اڑھائی لاکھ مسلمان غائب ہو گئے جن کا کوئی نام و نشان نہیں۔ کپورتھلہ میں شاید ہی کوئی مسلمان زندہ بچا ہو۔ یاد رہے کہ ریاست کپورتھلہ میں مسلمان اکثریت میں تھے اور 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد دو لاکھ تیرہ ہزار سات سو چون تھی۔ 15 ستمبر 1947ء کے روز مسلمان مہاجرین کا ایک قافلہ اڑیسہ سے روانہ ہوا۔ اتنی بڑی تعداد کو ختم کرنا آسان نہ تھا لہٰذا پہلے انہیں بھالوں، کرپانوں اور بندوقوں سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہزاروں مسلمان مارے گئے لیکن پھر بھی ہزاروں زندہ بچ گئے چنانچہ ہندو سکھ فوجیوں کے ٹرک بھیجے گئے جو فوجی انداز میں منظم طریقوں سے ڈیڑھ گھنٹے تک مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔ ایک لاکھ قافلے میں سے صرف چار ہزار زندہ بچ کر پاکستان پہنچ سکے۔ 96 ہزار مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ یہ ہے امت مسلمہ کا وہ عظیم سانحہ (Holocaust) جسے دنیا کی نگاہوں سے ابھی تک چھپایا جا رہا ہے۔ افسوس کہ پاکستان کی نوجوان نسل بھی اس سے پوری طرح واقف نہیں۔

"اخراج اسلام از ہند" (تحریر: مرتضیٰ احمد خان میکش)

......☆......

ریاست پٹیالہ میں خون مسلم کی ارزانی

جناب عبدالعزیز صاحب مسافر تحریر فرماتے ہیں:

میں نے 13 اپریل کو مسلمان ٹوہانہ ضلع حصار کی طرف سے ہز ہائنس مہاراجہ پٹیالہ کی خدمت میں ایک تار بھیجا کہ "ریاست کے مسلمانوں کی حفاظت کیجئے۔" اس تار کا جواب مجھے 15 اپریل کو ڈاک کے ذریعے بھیجا گیا جو 20 تاریخ کو مجھے ملا۔ جواب حسب ذیل تھا:

"آپ کے تار مورخہ 13 اپریل کے ضمن میں جو آپ نے ہز ہائی نس مہاراج ادھیراج کی خدمت میں بھیجا۔ میں لکھتا ہوں کہ آپ نے جس خطرے کا اظہار کیا ہے اس میں ذرہ بھر صداقت نہیں۔ ہز ہائی نس اور ان کی حکومت ایسے لوگوں سے انتہائی سختی کے ساتھ باز پرس کرنے کا عزم صمیم رکھتی ہے جو ریاست پٹیالہ میں کسی قوم کے جان و مال کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے کوشاں ہوں گے۔ میں اس جواب کے ہمراہ آپ کو ایک مطبوعہ سرکاری اعلان بھیجتا ہوں جس میں ایسے معاملات کے متعلق ہز ہائی نس کی حکومت کی پالیسی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے آپ کا صادق پربت موہن سنگھ برائے وزیر اعظم۔"

سرکاری اعلان میں ریاست کی رعایا کو یقین دلایا گیا تھا کہ ریاست کی حکومت ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لئے مناسب ذرائع اختیار کر رہی ہے لہٰذا اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ بعض لوگ ریاست چھوڑ کر باہر جا رہے ہیں اس سرکاری اعلان میں اپیل کی گئی تھی کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر جمے بیٹھے رہیں۔

اس جواب کے باوجود اپریل کے آخری عشرہ میں ریاست پٹیالہ کے مسلمان ہجرت کے انگریزی علاقہ میں آتے رہے۔ اس لئے 3 اپریل کو مسلمانان ٹوہانہ کی طرف سے مہاراجہ صاحب کو ایک تار بھیجا گیا کہ "برنالہ، مانسہ، اوجانہ منڈی اور بڈایہ کھڈی کے مسلمان خطرے میں ہیں ان کی حفاظت کیجئے۔" اس تار کا کوئی جواب موصول نہ ہوا لیکن ریاست کے اندر سے برابر اس مضمون کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں کہ ریاست کے تمام چھوٹے بڑے اہلکار، تحصیلدار، ذیلدار، تھانیدار وغیرہ مسلمانوں کو حفاظت کا یقین دلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ سکھوں کو جو مسلمانوں پر حملے کر رہے ہیں، قراری واقعی سزا دی جائے گی۔

حفاظت کے لئے اس تیقن کے خلاف جولائی اور اگست کے مہینوں میں ریاست کے اندر مسلمانوں کے انخلاء کی عام مہم شروع کر دی گئی۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد کئے جانے لگے۔ قتل عام، لوٹ مار، عورتوں کی بے عزتی، وغیرہ کی جو وارداتیں ہونے لگیں وہ احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مہاراجہ اور اس کے اہلکاروں نے مسلمانوں کو طفل تسلیاں دے دے کر ریاست کے اندر رکھا تا کہ وقت آنے پر سب کا قلع قمع کر دیا جائے۔

ریاست پٹیالہ کے جمعدار میجر عزت دین جو تباہ و برباد ہو کر نومبر کے وسط میں پاکستان آئے ہیں اور اب راجہ بازار راولپنڈی میں اقامت گزین ہیں۔ اپنے دردانگیز حالات یوں بتاتے ہیں۔

"میں پٹیالہ فورس میں 1931ء کو بھرتی ہوا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں، میں اپنی یونٹ کا حولدار تھا، چار سال سمندر پار رہا۔ جمعداری کا عہدہ وہیں ملا۔ پٹیالہ میں واپس آیا تو حکومت برطانیہ کی سفارش پر جمعدار میجر ہو گیا۔"

"اختتام جنگ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ پٹیالہ کا جابر حکمران اپنی فوج سے مسلمانوں کی نفری کم کرتا جا رہا ہے چنانچہ معمولی سی باتوں پر مسلم سپاہیوں کو فوجی قسم کی سزا دے کر فارغ کر دیا جاتا۔ اکثر مسلمانوں کو جن کی ملازمت کچھ لمبی ہو گئی تھی قبل از وقت ریٹائرڈ ہونے پر مجبور کیا جاتا اور انہیں پنشن بھی نہ دی جاتی۔ پٹیالہ کے غافل و بے خبر مسلمان ان باتوں کا احساس ضرور رکھتے تھے لیکن انہیں "معمولی" سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔

آخر 1946ء میں راجہ نے خفیہ احکام جاری کئے کہ ہماری فوج سے اسی فیصدی مسلمان فوراً نکال کران کی جگہ سکھ بھرتی کیے جائیں اور بیس فصدی مسلم سپاہی محض دکھاوے کے طور پر رہنے دیئے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دسمبر 1946ء تک پٹیالہ ملٹری میں مسلمانوں کی تعداد اسی کیا، نوے فیصد کم کردی گئی۔ مسلم افسران کو خاص طور پر نکال دیا گیا اور ان کی جگہ بدمعاش اور غنڈہ سکھوں نے پُر کرلی۔ یہ تھی ریاست کے مسلمانوں کو قتل وغارت کرنے کی بنیاد جس کو اگست 1947ء میں جامۂ عمل پہنایا گیا۔

سچ پوچھئے تو ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کا کشت وخون اس وقت ہی جاری ہوگیا تھا جب لاہور اور امرتسر کے سکھوں نے مارچ 1947ء میں فساد شروع کیا تھا۔ اسلامیان پٹیالہ کی ہلاکت وتباہی نہ صرف غنڈوں اور بدمعاشوں کے ذریعے ہوئی بلکہ بڑے بڑے افسروں، وزیروں اور یوں کہیئے کہ خود ظالم راجا کا اس میں بڑا ہاتھ تھا اور انہی کے اشارہ و ایماء پر ستم رانیاں وجود میں لائی جاتی تھیں۔ ان خفیہ ریشہ دوانیوں اور پوشیدہ سازشوں کا بھانڈا 15 اگست کے روز بدکو پھوٹا جبکہ ہنوز دونوڈومینیں تقسیم کے جھولے میں لٹک رہی تھیں۔ اس روز پٹیالہ کی جابر حکومت کے حکام نے قتل مسلم کا کھلم کھلا اعلان کردیا، ریاست کے بدکرداروں اور سفاکوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی۔ ریاست کے فوجی سپاہیوں نے سفید کپڑے پہن لئے۔ غنڈوں میں عظیم المقدار آتشیں اسلحہ اور دوسرے آلات حرب تقسیم کئے۔ افسروں نے پیٹھ ٹھونکی۔ وزیروں نے تھپکی دی، کوئی مبالغہ کی بات نہیں، حقیقت ہے کہ خود راجہ نے فتنہ گروں کی ہمت بڑھائی۔ فسادیوں سے مصافحہ کیا، لڑاکا ''سورماؤں'' کو انعام کے لالچ دیئے، شریروں، لچوں اور غنڈوں کے لئے خزانہ کے منہ کھول دیئے اور خون مسلم کی وہ ارزانی دیکھنے میں آئی جو تاریخ نے اب تک کسی بازار میں نہ دیکھی ہوگی۔

پانچ سے پندرہ اگست تک کس قدر مسلمان تہ تیغ ہوئے؟ حالات اس کے صحیح اعداد وشمار بتانے سے عاجز ہیں۔ سرسری اندازہ تیس ہزار کا ہے لیکن ہنوز روز اول تھا۔ پندرہ اگست کے بعد تو مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ جدھر نگاہ جاتی تھی، لاشوں کے ڈھیر، اعضاء کے انبار نظر آتے تھے۔ خون اسلام نے زمین کو رنگین کردیا۔ شہروں کی نالیاں

لہو بہاتی تھیں۔ بدرووٴں میں خون ابلتا تھا۔ گڑھے اور کنویں نعشوں سے پر تھے۔ بلا مبالغہ آخر اکتوبر تک ہزاروں مسلمان ہلاک اور تباہ ہو گئے۔ یہ ہے ہنگامہ پٹیالہ کا سطحی نقشہ۔

اب میری کہانی سنئے۔ میں پٹیالہ رجمنٹ میں کوارٹر لے کر اہل و عیال کے ساتھ مقیم تھا۔ بہت سے سپاہی وہاں اپنے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ 27 اگست کو ہماری یونٹ پریڈ کر کے آئی تو دیکھتے کیا ہیں، پٹیالہ کا سکھ بریگیڈ غیر مسلم فوجی حکام کے ساتھ کوئی خفیہ گفتگو کر رہا ہے اور "خاص ہدایات" دے کر اشاروں ہی اشاروں میں کچھ سمجھا رہا ہے۔ افسروں کے بدلے ہوئے تیور، ان کا انداز تکلم اور ان کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ آج خیر معلوم نہیں ہوتی چنانچہ اسی شام وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا ایک افسر بڑی تیزی سے ہماری یونٹ میں آیا اور مسلم ملازموں کے نام نوٹ کر کے لے گیا۔ بعد میں معلوم ہوا۔ پٹیالہ کی تمام فوج کے مسلمان ملازمین کی فہرست تیار کی گئی ہے۔ 28 اگست کی صبح کو حکم ملا کہ سب مسلمان فوجی فلاں جگہ اپنے اسلحہ سمیت جمع ہو جائیں۔ ہم چھاوٴنی کے باہر ایک میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ وہاں دیکھا کہ بریگیڈیئر اپنے غیر مسلم سٹاف اور دوسرے افسروں کے ساتھ کھڑا ہے۔ دو برین گنیں میدان میں تیار رکھی ہیں اور تین انچ دہانے کی ایک توپ بھی موجود ہے۔

پٹیالہ فوج کے تمام مسلم سپاہی اور افسر قطار میں کھڑے ہو گئے۔ بریگیڈیئر اور اس کے ساتھی آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ "دیکھو جوانو! ریاست میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں فوج بھی اس کا اثر نہ قبول کر لے۔ اس خطرہ کے پیش نظر کمانڈر انچیف نے حکم دیا ہے کہ مسلمانوں سے "عارضی طور پر" ہتھیار لے لئے جائیں پس تم اپنی رائفلیں اور گولیاں زمین پر رکھ دو۔"

یہ خوفناک حکم سنتے ہی مسلمان سہم گئے۔ منہ پر ہوائیاں چھوٹ گئیں، رنگ زرد ہو گئے، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں آنکھوں میں رائے لی لیکن ہر چشم زار نے بے کسی و بے بسی کا اظہار کیا۔

"سنا نہیں۔ کیا حکم ملا تم کو؟" سکھ میجر کڑک کر بولا۔

اور اس کڑک کے ساتھ ہی ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رائفلیں اور گولیاں ان کے سپرد کر دیں اور نہتے ہو کر بیٹھ گئے۔

سکھ افسروں نے اسلحہ اٹھا کر "اپنے" سپاہیوں کے حوالے کیا جو مگزین میں جمع کر دیا گیا۔

اس من مانی کارروائی کے بعد ہمیں حکم ملا کہ اپنی بارکوں میں چلے جاؤ جونہی ہم نے منہ موڑ کر مارچ کیا۔ ہم پر برین گنوں سے فائرنگ ہو گئی اور آن واحد میں نہتے اور بے بس سپاہی سینکڑوں کی تعداد میں ہلاک ہو گئے جو آدمی بچ کر اپنے کوارٹر میں گیا اس کو اہل و اطفال کے ساتھ وہیں جنت رسید کر دیا گیا۔ مسلمان افسروں اور سپاہیوں کی بیویاں اور لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ میری بیوی بھی گولی کا شکار ہوئی۔ نوجوان لڑکی کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ تمام بچے کوارٹر ہی میں شہید ہو گئے۔ میں اپنا بال بچہ کٹوا کر مال اسباب لٹا کر بچ گیا۔ زخم ضرور آئے لیکن جھاڑیوں کی پناہ لے کر اپنے اکیس ہمراہیوں کے ساتھ چھپتا چھپاتا پاکستان آ گیا۔ راستے میں ایک ہمراہی نے بتایا کہ ڈیڑھ ہزار مسلمان فوجیوں میں سے صرف دو تین سو بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔"

(مرسلہ: حکیم سید محمود گیلانی)

سید اشرف علی صاحب فاضل جے پوری رقمطراز ہیں:

"میں نارنول ریاست پٹیالہ کے حالات لکھتا ہوں۔ 16 ستمبر کو کوئی پچاس ہزار جاٹوں اور آہیروں نے قصبہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ نارنول کے بہادر مسلمانوں نے 24 گھنٹے شدید مقابلہ جاری رکھا حالانکہ حملہ آوروں کی تعداد ان سے تین گنا زیادہ تھی۔ اتنے میں سکھ ملٹری نے ہندوؤں کی خالی دکانوں پر مشین گنیں اور دو انچ دہانے والی توپیں نصب کر لیں۔ مقامی ہندوؤں کو پہلے ہی محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اڑتالیس گھنٹہ کے مسلسل فائرنگ کے بعد سارے شہر میں آگ ہی آگ نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کی لاشوں کے پشتے لگ گئے۔ ابھی کچھ مسلمان اپنے پختہ مکانوں میں محفوظ بیٹھے تھے۔ 10 ستمبر کو ہندو اور سکھ ایک گائے لائے اور اس کی دم کو منہ میں لے کر قسمیں کھانے لگے کہ مسلمان

ڈریں نہیں بلکہ جے ہند، بھارت ماتا کی جے وغیرہ کے نعرے لگاتے ہوئے نکل آئیں اور مندر میں جمع ہو جائیں جہاں انہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ بھوکے پیاسے مسلمان ان کے چکمہ میں آگئے۔ آٹھ ہزار کے قریب مرد، عورت اور بچے مندر کے قریب پہنچے تو سکھوں، آہیروں اور جاٹوں نے ان پر پھر حملہ کر دیا اور انہیں قتل کرنے لگے۔ کچھ مسلمانوں نے سمٹ کر مقابلہ کیا اور کچھ بھاگ نکلے۔ زخمی عورتوں، بچوں اور مردوں کی ایک خاصی تعداد راتوں رات ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی جہاں مسٹر ویلڈر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مسٹر ایس پی سنگھا ریلوے لائنیں کی حفاظت کے لئے پولیس اور فوج کی کچھ جمعیت لے کر آئے ہوئے تھے۔ سکھوں نے اسٹیشن کی حدود میں بھی مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اس پر سنگھا صاحب نے بلوائیوں پر فائر کرائے۔ اس جھڑپ میں ریاست پٹیالہ کا ایک سکھ فوجی افسر مارا گیا۔ شام کو پٹیالہ فوج کے افسر نے مسٹر ویلڈر اور مسٹر سنگھا کو چیلنج دے دیا کہ وہ نارنول اسٹیشن سے فوج اور پولیس ہٹالیں ورنہ ہم حملہ کر دیں گے۔ ایک ہندوستانی افسر نے صلح کروا دی اور اس طرح مسٹر ویلڈر اور ایس پی سنگھا صاحب نارنول کے چار پانچ ہزار مسلمانوں کو جن میں ایک بڑی تعداد زخمیوں کی بھی تھی، بچا کر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے ایک ہندو افسر نے بتایا کہ نارنول میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کسی حالت میں بھی پچیس ہزار سے کم نہ تھی۔ حضرت شہید ترکمانؒ کے مزار والے حوض میں ایک ہزار سے زیادہ عورتوں نے ڈوب کر عصمت بچائی۔ مزار کی حفاظت کرنے والے پانچ ہزار مسلمانوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ اس تباہی کے بعد سکھوں نے بچی کھچی عورتوں اور لڑکیوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا اور ان سب کو مال غنیمت کے طور پر بانٹ لیا۔

نیمرانہ کے راجپوت ٹھاکر صاحب جو اپنی جیپ کار میں جاٹوں کے گاؤں سے گزر رہے تھے۔ 16 مسلمان لڑکیاں جاٹوں سے چھڑا لائے جو انہوں نے جے پور کے مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

نارنول کے قتل عام سے فارغ ہو کر جاٹوں اور سکھوں کا گروہ بھلیرہ جنکشن، اجمیر اور باندی کوئی کی طرف متوجہ ہوا۔ نیز ریل گاڑیوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع

کر دیا گیا۔ 20 اکتوبر کو اجمیر شریف سے پچیس میل کے فاصلے پر کھر دے اسٹیشن کے قریب پاکستان کی طرف جانے والے پناہ گزینوں کی ایک ٹرین پر حملہ ہوا پندرہ سو میں سے ایک ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے اور تین سو سے زائد زخمی ہوئے۔ کھر دے کے زخمی مسلمان اپنے تازہ زخم اور خون آلود کپڑے لے کر حیدر آباد سندھ پہنچے تو مہاجرین میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انہوں نے اپنے مظلوم شہیدوں کا بدلا لینے کے لئے ایک گاڑی کو روکنا چاہا تو ہمارے پاکستان کی فوج آڑے آ گئی۔ مہاجرین پر فیر کر کے ایک مسلمان کو ہلاک دو کو زخمی کر دیا اور سندھی ہندوؤں کو بچا لیا۔

حافظ محمد اسحاق خاں صاحب لکھتے ہیں:

''28 اگست کو اطراف و جوانب میں یہ خبر گشت کرتی ہوئی سنائی دی کہ مہندر گڑھ پر 3 ستمبر کو حملہ کیا جائے گا بلکہ گردونواح کے دیہات میں دور دور تک اس مضمون کے اشتہار تقسیم کیے گئے کہ جو ہندو بچہ اس حملہ میں شریک نہ ہو وہ گؤ کھائے۔ مہندر گڑھ کے مسلمانوں کو یکم ستمبر ہی سے محصور کر لیا گیا جو مسلمان شہر سے باہر نکلتا وہ ختم کر دیا جاتا تھا۔ ریل گاڑی کا سفر بھی محفوظ نہ تھا کیونکہ راستے میں تمام مسلمان مسافر موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے۔ شہر میں کرفیو لگا کر مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا تاہم مسلمانوں نے محلہ بیوپاریاں اور محلہ رائیوراں میں جمع ہو کر دو جگہ اپنی پناہ گاہیں بنالیں اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ 3 ستمبر کو غیر مسلم بلوائیوں کا ایک جم غفیر قصبہ کے اردگرد جمع ہو گیا اور ریاست کی ملٹری نے موٹروں اور جیپ کاروں میں بیٹھ کر قصبہ کے چاروں طرف چکر لگایا۔ اس روز حملے کا شدید خطرہ تھا لیکن حملہ نہ ہوا۔ 6 ستمبر کو سنا کہ ضلع نارنول کے مسلمانوں پر حملہ شروع ہو گیا۔ اس حملہ میں جے پور، بیکانیر، نابھہ، جیند، الور، بھرت پور اور ضلع نارنول کے اسی نوے ہزار بلوائی شریک تھے اور ریاست پٹیالہ کی ملٹری بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ شہر نارنول میں تین دن تک مسلمانوں کا قتل عام جاری رہا۔ حملہ آوروں نے مشین گنیں، برین گنیں اور توپیں استعمال کیں اور شہر کے چاروں طرف آگ لگا دی۔ شہر

نارنول میں پندرہ ہزار مسلمان آباد تھے۔ دس ہزار باہر سے آکر اس شہر میں جمع ہو گئے تھے، کل پچیس ہزار مسلمانوں میں سے صرف تین چار ہزار اپنی جانیں بچا کر بھاگ سکے۔ ہزاروں جوان عورتیں اور لڑکیاں حملہ آوروں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ ریاست کی ملٹری نے ان عورتوں کو مادرزاد برہنہ کر کے جلوس نکالا۔ 9 ستمبر تک شہر نارنول کا قصہ تمام کر دیا گیا اور ازاں بعد گردونواح کے مسلم دیہات کو جلایا گیا۔

11 ستمبر کو تھانیدار مہندر سنگھ نے شہر مہندر گڑھ کی شمالی جائے پناہ یعنی محلہ بیوپاریاں پر فائرنگ شروع کرادی۔ اس کے بعد بلوائیوں اور ریاست کی باقاعدہ فوج کے جوانوں نے محلہ پر یورش کر دی اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنے لگے۔ مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بلاامتیاز موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ شام کو فائرنگ بند ہوئی تو محلہ بیوپاریاں کے بچے کھچے مسلمانوں میں سے چار سو کا ایک قافلہ جمعدار نصیر احمد خان جاگیردار کے ہمراہ موضع یوانہ کی طرف چل دیا، باقی ماندہ دو تین سو مسلمان محلہ راٹھوراں میں چلے گئے جہاں پہلے بھی بہت سے مسلمان جمع تھے۔ جو لوگ موضع یوانہ کی طرف گئے تھے انہیں بلوائیوں اور فوجیوں نے راستے میں گھیر لیا اور ان میں سے دو تین سو آدمی ختم کر دیئے اور موضع مالڑی کو جہاں یہ واردات ہوئی، آگ لگا دی۔

12 اور 13 ستمبر کو ایک جنگی طیارے نے محلہ راٹھوراں کے پناہ گزینوں پر گولیاں برسائیں، لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپے بیٹھے رہے۔ شام کو ملٹری کے دو ٹرک آئے اور محلہ کے دو سرکردہ بزرگوار اشخاص کو بلا کر کہنے لگے کہ لوگ آرام سے رات گزاریں، ملٹری کے دو سو جوان حفاظت کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اس یقین دلانے کے باوجود رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ اگلے دن صبح کو حکام نے دو مسلمان لڑکیوں کو محلہ راٹھوراں میں بھیجا جو محلہ بیوپاریاں سے انہوں نے پکڑی تھیں ان لڑکیوں نے کہا کہ ملٹری کے آفیسر مسلمانوں کے لیڈروں کو بلا رہے ہیں۔ لیڈر گئے ان سے کہا گیا کہ مسلمان

کسی قسم کا سامان لئے بغیر جس حال میں ہیں اسی حال میں ایک گھنٹہ کے اندر اندر شہر خالی کر دیں ہم ان سب کو ریلوے اسٹیشن تک بحفاظت پہنچا کر پاکستان کی طرف بھیج دیں گے۔ غرض مسلمانوں کو نہایت گندے راستے سے اسٹیشن کی طرف چلایا نہیں بلکہ ہانکا گیا۔ اوپر سے بارش ہو رہی تھی۔ راستہ کیچڑ کے مارے دلدل بنا ہوا تھا۔ شام کے پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک سب لوگ ریلوے اسٹیشن کے باہر بارش میں بھیگے پڑے رہے۔ گاڑی آئی تو اس میں آدھے آدمی سوار کرائے جا سکے۔ یہ گاڑی جب مہندر گڑھ سے تیسرے اسٹیشن ستنالی کے سگنل پر پہنچی تو یکدم گاڑی رک گئی۔ صدر مسلم لیگ رسالدار محمد حنیف کو آواز دی گئی وہ گاڑی سے اترے تو انہیں گولی مار دی گئی، ازاں بعد مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں کیونکہ وہاں ہزاروں بلوائی اور پولیس اور فوج جمع تھی۔ تین گھنٹے تک مسلمانوں کے قتل کا سلسلہ جاری رہا اور بلوائی سامان لوٹتے رہے جب گاڑی لوہارو کے اسٹیشن پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ دو ہزار میں سے صرف تین سو کے قریب مسلمان بچے ہیں اور 75 زخمی ہیں۔ بہت سی عورتوں کو گاڑی سے اتار لیا گیا تھا۔ 14 ستمبر کو شام کے سات بجے یہ گاڑی جے پور پہنچی۔

مہندر گڑھ کے جو مسلمان پناہ گزین نصف کے قریب باقی رہ گئے تھے ان کو تیسرے دن یعنی 15 ستمبر کو گاڑی پر سوار کرایا گیا۔ اس قافلے پر بھی حملہ ہوا۔ پہلے لیفٹیننٹ احمد علی خان کو گولی مار کر شہید کیا گیا اور پھر قتل عام شروع کر دیا گیا۔ اس گاڑی میں سے صرف ایک مرد اور چار عورتیں بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکیں۔"

مہندر گڑھ کے اردگرد بہت سے دیہات تباہ کر دیئے گئے اور مسلمان ختم کر دیئے گئے۔ کئی دیہات کے مسلمانوں نے مذہب تبدیل کر کے جان بچائی۔ ہزاروں عورتیں ابھی تک ظالموں کے پنجے میں پھنسی ہوئی ہیں۔

لیفٹیننٹ ولی محمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"موضع کمبالی تھانہ نند پور کلوڈ تحصیل سرہند ریاست پٹیالہ کا ایک گاؤں ہے جس

میں نوسو کے قریب مسلمان آباد تھے۔ اس گاؤں میں اردگرد کے دیہات سے بھی مسلمان آ گئے تھے اور کل تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ سب لوگ 4 ستمبر کو گاڑوں چھوڑ کر کرالی کیمپ میں جانے کے لئے تیار ہو گئے اور قافلہ چل پڑا۔ اتنے میں ریاستی فوج کا ایک دستہ آیا جس نے حکم دیا کہ سب لوگ گاؤں کو واپس چلے جائیں چنانچہ سب واپس چلے گئے۔ تین روز گزرنے پر مورخہ 8 ستمبر کو پانچ ہزار سکھوں کے ایک مسلح جتھے نے کمبال کے قریب باڑہ نامی ایک گاؤں پر حملہ کر دیا۔ ایک گھنٹہ تک لڑائی ہوتی رہی اس پر سکھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم گھروں سے نکل آؤ ہم تمہیں کیمپ میں حفاظت سے پہنچا دیں گے۔ جب سب مسلمان گاؤں سے نکل کر ایک کھلے میدان میں جمع ہوئے تو سکھوں نے جن کے ساتھ ریاست کی فوج اور پولیس بھی تھی انہیں گھیر لیا اور قتل عام شروع کر دیا۔ چودہ سو مسلمان شہید کر دیئے گئے ایک سو جوان عورتوں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے کپڑے اتروا کر انہیں برہنہ کیا گیا۔ ان کے سر کے بال کھول دیئے گئے۔ ایک دن ان کو بالکل برہنہ رکھا گیا اور سکھ وحشیانہ طریقے سے ان سب کی عصمت ریزی کرتے رہے۔ تا آنکہ وہ بے ہوش ہو گئیں، شام کو سکھ انہیں اپنے ساتھ لے گئے، بہت سی عورتیں وحشیانہ سلوک کی وجہ سے مر گئیں۔ اس گاؤں کے چھ سات آدمی جو باہر ملازمت پر تھے، بچ سکے ہیں یہ دردناک قصہ ایک عورت نے سنایا ہے جو پندرہ دن کے بعد بھاگ کر سرہند شریف کے روضہ پر پہنچ سکی۔''

قاضی محمد صدیق قریشی صاحب رقم طراز ہیں:

''میں سرہند شریف کے قریب ایک گاؤں باڑہ کا باشندہ ہوں۔ پندرہ اگست کے بعد جب ضلع لدھیانہ کے دیہات میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو ریاست کے حکام ہمیں یقین دلاتے رہے کہ ریاست میں ہر طرح کا امن قائم رکھا جائے گا۔ 24 اگست کو علاقہ کھنہ راہوں ماہوں کے دو ہزار مسلمان پناہ گزینوں کا ایک قافلہ موضع باڑہ میں داخل ہوا۔ یہ قافلہ بڑی تباہ حالت میں تھا۔ اس میں بہت سے لوگ زخمی تھے۔ سب کے سب بے

سروسامان تھے۔ تین روز کی مسلسل بارش میں افتاں وخیزاں چل کر آئے تھے۔ باڑہ کی مسلم آبادی نے ان کی خبر گیری کی لیکن ناظم صاحب ضلع بستی پٹھاناں سنت پرتاپ سنگھ نے حکم دیا کہ ان پناہ گزینوں کو فوراً ریاست کی حدود سے نکال دو۔ پولیس نے آکر انہیں باڑہ سے ہانک دیا۔ باڑہ سے دو میل کے فاصلے پر ان پر حملہ کر دیا گیا اور اکثر لوگ شہید کر دیئے گئے، کچھ آدمی بھاگ کر روضہ شریف کے کیمپ میں اور کچھ انبالہ کے کیمپ میں پہنچے۔ عورتوں اور بچوں کو سکھ زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ 4 ستمبر کو ایک ٹرین روپڑ سے لائی گئی جس میں چار ہزار کے قریب مسلمان پناہ گزین تھے۔ رات کے نو بجے اس ٹرین پر حملہ کر دیا گیا اور تمام مسلمان شہید کر دیئے گئے، عورتوں کو برہنہ کر کے ان کی عصمت ریزی کی گئی۔ حالات یکسر ناقابل بیان ہیں۔ باڑہ کے مسلمان کچھ زخمی عورتوں، بچوں اور مردوں کو اٹھا لائے اور ان کی مرہم پٹی کر کے انہیں روضہ شریف کے کیمپ میں پہنچایا۔

اس کے بعد ریلوے اسٹیشن پر ہر روز پندرہ بیس کی تعداد میں مسلمان شہید ہونے لگے اور ریلوے اسٹیشن کا راستہ بند ہو گیا۔ ناظم صاحب ضلع بسی نے بھی پھر یقین دلایا کہ یہ واقعات ریلوے کی حدود میں ہو رہے ہیں ریاستی علاقہ میں امن بحال رکھا جائے گا۔ 8 ستمبر کو میرے ایک ہندو دوست نے کہا کہ حالات بہت مخدوش نظر آرہے ہیں اس لئے تم اپنے بال بچوں کو لے کر روضہ شریف کے کیمپ میں چلے جاؤ۔ راستے پر خطر تھے تاہم میرے ایک جاٹ دوست نے اپنی لاری پر مجھے اور بچوں کو روضہ شریف پہنچا دیا، باقی خاندان اور میرے والد گھر ہی پر رہے۔

11 ستمبر کو صبح آٹھ بجے سنت پرتاپ سنگھ ناظم ضلع بسی پولیس کے چند آدمیوں کے ہمراہ باڑہ پہنچا اور کہا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اس لئے باڑہ اور ہمایوں پور کے مسلمان گاؤں خالی کر دیں۔ ان سب کو بحفاظت سرہند شریف کے کیمپ میں پہنچا دیا جائے گا چنانچہ پولیس اور فوج نے تمام مسلمانوں کو باہر نکال کر ریلوے روڈ اور گرانڈ ٹرنک روڈ کے

درمیان کھڑا کر لیا جس کے پاس نیزہ لاٹھی یا تلوار کسی قسم کا ہتھیار تھا، سب چھین لیا اور چالیس ہزار روپیہ نقد مانگا جب روپیہ ہتھیا لیا تو اس نہتے مجمع پر فائر شروع کر دیئے۔

میرے والد قاضی مظہر الحسنین قریشی نے یہ حال دیکھ کر مسلمانوں سے کہا کہ تیمم کر کے سجدے میں پڑ جائیں، والد صاحب نے مختصر سی تقریر میں مسلمانوں کو اس بات کی بھی تلقین کہ کوئی شخص جان کے خوف سے مذہب تبدیل نہ کرے، سب کلمہ حق پر جانیں قربان کر دیں چنانچہ اکثر مسلمان تیمم کر کے سجدہ ریز ہو گئے۔ سکھوں نے جن کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی، انہیں قتل کر دیا اور عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ کوئی اڑھائی ہزار مسلمان جو خدا کی بارگاہ میں سربسجود تھے، شہید کر دیئے گئے۔ عورتوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تحریر نہیں کر سکتا۔ میرے والد بھی اسی حال میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

دو ماہ کے قریب روضہ شریف کے کیمپ میں بسر کرنے کے بعد مورخہ 7 نومبر کو ایک اسپیشل ٹرین پر سوار ہو کر پاکستان پہنچے، راستے میں پندرہ بیس آدمی چھت پر سے گر کر ہلاک ہوئے۔ دو آدمی فائروں سے شہید ہوئے۔ ہمارے خاندان کے افراد کی کل تعداد دو دو سو اسی کس تھی جن میں سے دو سو تیس ارکان وہیں شہید ہو گئے باقی ماندہ پچاس پاکستان میں کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

......☆......

مغویہ خواتین کی عبرتناک آپ بیتیاں

کچھ عرصہ ہوا کہ ایک پاکستانی جوان کو بارڈر کے اس پار سکھوں نے سمگلر سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ ایک سکھ نے اسے اپنے گھر کی کوٹھڑی میں بند کر دیا تا کہ صبح کے حکومت کے حوالے کر کے انعام حاصل کر سکے۔ شام ہوئی تو سکھ کی عمر سیدہ بیوی اس پاکستانی جوان کو کچھ کھانے پینے کے لئے دینے آئی۔ یہ عورت تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی اگرچہ اس کا خاوند نہایت اجڈ، جاہل اور اکھڑ قسم کا دیہاتی تھا۔ اس عورت نے پاکستانی جوان کو کھانا تو دے دیا مگر ساتھ ہی ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم سمگلنگ جیسا گھٹیا اور ناجائز کام کرتے ہو، کیا ''ہم'' نے پاکستان اس لئے بنایا تھا؟ پاکستانی جوان بہر حال سمگلر تو نہ تھا لیکن اسے خاتون کے لفظ ''ہم'' پر تعجب ہوا۔ بھلا سکھوں نے تو پاکستان نہیں بنایا تھا تو پھر اس ''سکھنی'' نے لفظ ''ہم'' پر کیوں استعمال کیا۔ اس معمے کو حل کرنے کے لئے جوان نے ''سکھنی'' سے پوچھ ہی لیا۔ ''اماں جان آپ تو پڑھی لکھی اعلیٰ خاندان کی خاتون معلوم ہوتی ہیں مگر آپ کے خاوند تو آپ سے بالکل مختلف ہیں اور پھر آپ کی ڈانٹ میں بھی مجھے شفقت اور محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ آخر اس کی وجہ؟'' اس عورت کا خاوند گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھہرو میں کنڈی لگا آؤں۔'' گھر کا دروازہ بند کر کے عورت واپس آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک رہے تھے۔ وہ کہنے لگی کہ ''1947ء میں، میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان خاندان کی نوجوان بیٹی تھی۔ میرے سامنے میرے سارے گھر والوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے قتل کر دیا۔ میں اپنے دس سالہ بھائی کو لے کر بھاگی تو ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے میرے پیچھے بھاگے۔ ایک سکھ نے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تو میرا ننھا سا بھائی مجھے اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک ہندو نے اسے پکڑ کر ایک طرف کھینچا اور پھر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا دی۔ میرے

بھائی کی گردن کاٹ کر ہندو نے کہا کہ لو اتنی آسانی سے مسلے کی گردن کٹ گئی، خوامخواہ میری تلوار اس کے خون سے بھرشٹ (ناپاک) ہوگئی۔ اب کئی سکھوں نے میرے کپڑے نوچ کر اتار دیئے اور میری عصمت دری کی اور پھر میں متعدد ہندو سکھوں کے ہاتھوں آگے آگے فروخت ہوتی رہی۔ آخر اس سکھ نے مجھے گھر ڈال کر میرے ساتھ شادی کر لی۔" پھر وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی کہ "میں نے اپنے خاندان، اپنے معصوم بھائی اور اپنی عصمت کی قربانی دی ہے "اپنے پاکستان کے لئے" پاکستان میرے لئے اس قدر مقدس ہے کہ جب میرے بچے بیمار ہوتے ہیں تو میں لفظ "پاکستان" پڑھ کر ان پر دم کرتی ہوں اور میرا اللہ انہیں شفا بخش دیتا ہے۔"

یہ ہے کہ ایک کہانی میری قوم کی بیٹی کی، ملت اسلامیہ کی لٹی ہوئی ناموس کی۔ 1947ء کی تاریخ وحشت و بربرشت کی ایسی ہزاروں المناک داستانیں تاریخ اپنی کوکھ میں چھپائے ہوئے ہے۔ ایسی لاکھوں عزتیں کفار کی درندگی کی نذر ہو کر بھارت کی خونخوار زمین میں دفن ہو چکی ہیں۔

افسوس کہ ملت اسلامیہ کی بے حسی اور بے غیرتی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اس قدر ذلت، بے عزتی اور رسوائی کے باوجود ہمیں شرم نہیں آرہی۔ ذرا سوچئے کہ کیا ہم اسی دین کے نام لیوا ہیں جس کا ماننے والا محمد بن قاسم چند مسلمان عورتوں کی پکار پر حجاز سے دیبل (کراچی) پہنچ گیا تھا اور جس مذہب کے ماننے والے طارق بن زیاد نے ایک عیسائی لڑکی کو انصاف دلانے کے لئے اندلس (سپین) کے ساحل پر تاریخی جنگ لڑی تھی۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ ہمارے اپنے مسلمان مورخین اور نام نہاد دانشور اپنی ہی تاریخ کو بدل کر حقائق کو جھٹلا کر، بھارت کے مسلم مخالف پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے ہی اسلاف، مشاہیر و اکابرین کو ذلیل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

(اقبالؒ)

مسز پوجا کا مشورہ

(حامد میر)

ہندوستان میں پاکستان کے خلاف سب سے زیادہ فلمیں بنانے والے جیوتی پرکاش دتا کے ساتھ نئی دہلی کے ہوٹل میں گفتگو کے بعد یہ خاکسار کافی شاپ کے ایک کونے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جس ملک میں پاکستان کے خلاف فلمیں بنانے والے کو سونے میں تولا جائے، اس ملک کے ساتھ پاکستان کی دوستی کیسے ممکن ہوگی؟ کافی کے دو کپ پی کر میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ساڑھی میں ملبوس ایک معمر خاتون میرے ساتھ آ بیٹھی اور بڑی بے تکلفی سے پوچھا کہ رات نئی دہلی ٹیلیویژن پر بر کھارت کے پروگرام میں اجے ساہنی کے ساتھ تم ہی الجھ پڑے تھے ناں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو خاتون نے کہا کہ "پہلی بار ہم نے کسی انڈین ٹی وی چینل پر یہ سنا کہ کشمیریوں نے بندوق اس لئے اٹھائی کہ 1987ء کے الیکشن ان سے چرا لئے گئے تھے۔" خاتون نے فوراً ہی سوال کیا کہ "کیا ہندوستان کے خلاف بندوق اٹھانے والے کشمیریوں کو تم بھی دہشت گرد سمجھتے ہو؟ تمہارے ملک میں بھی تو ہندوستان سے نفرت کرنے والوں کے خلاف کریک ڈاؤن ہو رہے ہیں ناں؟" میں نے جواب دینے کی بجائے خاتون سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ سوال سن کر وہ چند لمحے خاموش رہیں۔ انہوں نے آس پاس دیکھا اور تسلی کی کہ کوئی دوسرا انہیں سن نہیں رہا اور پھر بولیں کہ "میرے سفید بالوں سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ستر سال سے اوپر کی ہوں۔ چھپن سال پہلے میں زرینہ تھی اور آج پوجا ہوں، مسز پوجا چوہان میرا پورا نام ہے۔" اس سے پہلے کہ میں اگلا

سوال کرتا، انہوں نے بتایا کہ ’’1947ء میں وہ جموں میں رہتی تھیں اور ان کا تعلق ایک مسلم گھرانے سے تھا۔ ایک دن اباجی گھبرائے ہوئے گھر آئے اور ماں سے کہا کہ کل ہم سب کو لاری میں بیٹھ کر پاکستان جانا ہے اس لئے سامان باندھ لو۔ ساری رات ہم نے سامان باندھا اور اگلی صبح جموں کے ایک بڑے میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں لاریوں میں سوار کرایا گیا لیکن جیسے ہی یہ لاریاں شہر سے نکلیں تو حملہ ہو گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے اباجی کو ایک سکھ نے برچھی ماری، ماموں نے انہیں بچانا چاہا تو ماموں کے سر پر کلہاڑا مارا گیا۔ ماموں پر میری ماں گر گئیں تو ان کے سینے میں بھی برچھی اتر گئی۔ میں نے اپنے تین سالہ بھائی کو گود میں اٹھا رکھا تھا، میں اسے اٹھا کر بھاگی تو دور جا کر گر گئی۔ پھر مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں ایک کیمپ میں پڑی تھی اور میرا سر پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک ڈوگرا فوجی مجھے اودھم پور لایا اور ایک ہندو تاجر کے پاس چار سو روپے میں فروخت کر دیا۔ کچھ عرصہ میں نے اس کے گھر میں کام کیا، پھر اس کی بیوی ایک دن مجھے دہلی لے آئی اور کہا کہ تمہارا بیاہ میرے بھائی سے ہونے والا ہے۔ اس کے بھائی کے دو بچے تھے اور اس کی بھابی بیمار ہو کر مر چکی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں مجھے دو بچوں کے باپ کے سپرد کر دیا گیا اور جس دن پنڈت نے ہمارے پھیرے لگوائے اس صبح مجھے کہا گیا کہ آج سے تم زرینہ نہیں بلکہ ’’پوجا‘‘ ہو۔ پھر میں نے پوجا بن کر اپنے شوہر اور اس کے بچوں کی خدمت کی اور مجھ سے تین بچوں نے جنم لیا۔ تینوں ہندو ہیں۔ خاتون نے بتایا کہ بیس برس پہلے ان کے شوہر فوت ہو گئے ہیں، بچوں کی شادیاں ہو چکیں اور اب وہ دہلی میں اپنی بیوہ بیٹی کے ساتھ رہتی ہے۔‘‘

مسز پوجا کہہ رہی تھیں کہ ’’1947ء میں جموں اور کٹھوعہ سے ایک زرینہ نہیں بلکہ سینکڑوں مسلمان لڑکیاں اغوا ہوئیں جنہیں بعد میں ہندو اور سکھ بنایا گیا۔ کچھ کو وہ جانتی بھی تھیں اور کچھ اگلے جہان کو سدھار چکیں لیکن انہوں نے صالحہ کا خاص طور پر ذکر کیا۔ صالحہ کے خاندان نے 1965ء کے اپریشن جبرالٹر کے دوران پاکستانی کمانڈوز کی میزبانی کی تھی۔ ان کمانڈوز نے گاؤں کی مسجد پر پاکستانی پرچم لگایا اور گاؤں والوں سے کہا کہ اب وہ واپس نہیں جائیں گے لیکن سیز فائر کے بعد کمانڈوز چلے گئے۔ صالحہ کے باپ کو انڈین آرمی

نے گرفتار کرلیا اور چند دن بعد اس کی ماں کو بھی گرفتار کر کے اس کے ہاتھ جلائے گئے کیونکہ ان ہاتھوں سے اس نے پاکستانیوں کے لئے روٹیاں پکائی تھیں اور جب صالحہ اپنی ماں کو دیکھنے آرمی کیمپ گئی تو اسے ایک حوالدار نے اغوا کر کے اس کے ساتھ شادی کرلی۔ یہ حوالدار اسے دہلی لایا اور یہیں اس کی ملاقات مسز پوجا سے ہوئی۔ خاتون بتارہی تھی کہ جب کبھی اذان کی آواز آتی تو صالحہ رونے لگتی اور پوچھتی کہ "پاکستانیوں نے مسجد میں ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم سے بے وفائی نہیں کریں گے پھر وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟" مسز پوجا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ ایک دن صالحہ کے ہندو خاوند نے بیوی کو چھپ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور موقع پر ہی اسے قتل کر دیا۔ خاتون نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ "اذان کی آواز سن کر مجھے بھی کچھ ہوتا ہے لیکن میں نماز بھول چکی ہوں البتہ کسی کو نماز پڑھتے دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ اب میں اپنا وقت پورا کر چکی ہوں اس لئے تمہارے ساتھ یہ باتیں کرتے ہوئے کوئی خوف نہیں آرہا لیکن میں نے یہ باتیں اس لئے شروع کی ہیں کہ پاکستان کی وجہ سے تباہ ہوئی، پاکستان کی وجہ سے صالحہ تباہ ہوئی لیکن پھر بھی ہم پاکستان کا بھلا چاہتے ہیں اور تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ ہماری ہندو اولاد پر بھروسہ نہ کرنا، انہیں جب موقع ملا تمہیں کھا جائیں گے۔"

گفتگو جاری رکھنے کے لئے میں نے کہا کہ "اگر ہم نے بھروسہ نہ کیا تو دوستی نہیں ہوگی، دوستی نہیں ہوگی تو معاملہ خراب رہے گا، کیا آپ چاہتی ہیں کہ دشمنی قائم رہے؟" یہ سن کر خاتون غصے میں آگئیں اور کوسنے کے انداز میں کہنے لگیں کہ "تم پاکستانیوں کی سمجھ نہیں آتی کہ تم کیا چاہتے ہو، دوستی چاہتے ہو یا دشمنی؟ تمہارے ملک میں ہندوستان کی نفرت میں بندوق اٹھانے والے کو پکڑ لیا جاتا ہے، انتہا پسند کہا جاتا ہے اور ہندوستان سے دوستی کی بات کرنے والے کو غدار کا خطاب ملتا ہے۔ یہ کیا پالیسی ہے؟ ذرا مجھے بھی سمجھاؤ" ایک عام سی خاتون نے بڑا مشکل سوال کر دیا تھا۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس خاتون نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کپکپاتے ہونٹوں سے کہنے لگیں کہ "میری بیٹی اس کافی شاپ کی مینجر ہے۔ شام کو وقت گزارنے کے لئے کبھی کبھی یہاں آتی ہوں اور کئی پاکستانیوں سے مل چکی ہوں۔ مجھے

پریشانی اس بات کی ہے کہ تم پاکستانی یہاں جس دوستی اور محبت کو ڈھونڈنے آتے ہو، وہ تمہیں مل تو سکتی ہے لیکن اس کی قیمت یہ ہے کہ ''کشمیر کو بھول جاؤ، غیرت کو چھوڑ دو لیکن بیٹا تم نے بے غیرتی کی تو تمہیں اوپر والا نہیں چھوڑے گا۔ تمہیں صالحہ کی آہ لگے گی۔ میں جنگ نہیں چاہتی، کشمیر کا مسئلہ تم امن سے حل کرو لیکن ہندوستان سے نظریں جھکا کر بات کرو گے تو وہ تمہاری گردن نہیں چھوڑے گا اس لئے نظریں اٹھا کر بات کرو اور کسی دھوکے میں نہ آنا۔''

معمر خاتون پرنم آنکھوں سے رخصت ہوئیں۔ اگلے دن میں نے بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا سے ''جیو'' کے لئے انٹرویو لیا۔ موصوف نے فرمایا کہ ''کشمیر کوئی مسئلہ نہیں، مسئلہ ہے تو آزاد کشمیر پر پاکستان کا قبضہ ایک مسئلہ ہے'' انہوں نے کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا۔ ان فرمودات کے جواب میں حکومت پاکستان نے لائن آف کنٹرول پر سیز فائر کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان نے کہا کہ سیاچن پر بھی سیز فائر کرو۔ پاکستان نے سیاچن پر بھی سیز فائر کر دیا جس کے بعد یونت سنہا فرماتے ہیں کہ ''مشرف واجپائی ملاقات کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں'' ملاقات ضرور کیجئے لیکن کل کی زرینہ اور آج کی پوجا کا مشورہ نہ بھولئے جس نے بار بار کہا کہ میری ہندو اولاد سے دھوکہ مت کھانا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا۔

(حامد میر...... جنگ)

(ڈاکٹر سعید احمد ملک کی کتاب ''1947ء کا مسلم قتل عام'' سے اقتباس)

......☆......

بلقیس بنتو کیسے بنی؟

(تحریر: میاں محمد ابراہیم طاہر)

یہ ایک ایسی مظلوم عورت کی سچی داستان ہے جسے آزادی وطن کے وقت پٹیالہ سے پاکستان آتے ہوئے ان کے افراد خاندان سمیت پورے قافلے کو راستے میں قتل کر کے سکھوں نے سینکڑوں دیگر مسلمان نوجوان عورتوں اور معصوم دوشیزاؤں سمیت اغواء کر لیا تھا۔ 1990ء میں جب یہ خاتون مجھے ملی تو پانچ نوجوان سکھ بچوں کی ماں بن کر بڑھاپے کی دلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ بال چاندی کی طرح سفید ہو چکے تھے، دانت مصنوعی تھے اور چہرے پر جھریاں نمایاں ہو چکی تھیں۔ اس کے پانچوں بچے دو لڑکیاں اور تین لڑکے شادی شدہ ہو چکے تھے اور وہ اپنی انتہائی ضعیف العمر ''ماں'' کے ساتھ سکھوں کی مذہبی تقریبات میں شرکت کے لئے ننکانہ صاحب آئی ہوئی تھیں۔ میری اتفاقاً ہی ان سے ملاقات گوردوارہ ''جنم استھان'' کے ایک کمرے میں ہو گئی تھی جہاں بھارت سے آئے ہوئے میرے کچھ واقف کار بھی ٹھہرے ہوئے تھے اور جن سے ملنے کے لئے میں لاہور سے خاص طور پر ننکانہ صاحب گیا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد ننکانہ صاحب جانے کا یہ میرا تیسرا اتفاق تھا جب پاکستان بنا تو میں اور میرا آدھے سے زیادہ خاندان کپورتھلہ شہر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ کپورتھلہ جالندھر سے دس گیارہ میل کے فاصلے پر ایک سکھ ریاست تھی جس کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور یہ اکثریت کل آبادی کا 68 فیصد تھی۔ ایک سازش کے تحت اس

ریاست کے مسلمانوں کو دھوکے سے ایک ایسی ٹرین میں سوار کرا دیا گیا تھا جس کے بارے میں ریاستی حکام نے اعلان کیا تھا کہ ملٹری کی حفاظت میں پاکستان پہنچائی جائے گی لیکن ''کھو جے والی'' کے مقام پر ٹرین روک کر تمام مسلمانوں کو مسلح سکھ بلوائیوں اور ریاستی فوج کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا گیا تھا، اس میں میرے دادا، دادی اور ایک پھوپھی سمیت خاندان کے چودہ افراد بھی شامل تھے۔ کپورتھلہ شہر میں جو لوگ ٹرین میں سوار ہونے سے رہ گئے تھے وہ تقریباً تین ماہ تک محصور رہے۔ عیدالاضحیٰ کے بعد بمشکل تمام یہ لوگ جالندھر کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے جہاں سے انہیں ایک ٹرین میں بھر کر شیخوپورہ پہنچا دیا گیا تھا۔

شیخوپورہ میں ہمیں رہائش کے لئے جو جگہ ملی وہ شہر کے ریلوے سٹیشن کے پار ایک رائس فیکٹری تھی کیونکہ شہر میں کوئی مکان اور بلڈنگ سلامت نہ تھی۔ سب مکان جلے ہوئے اور ملبے کا ڈھیر تھے۔ اس رائس فیکٹری کے اندر پانی کے لئے جو کنواں تھا، وہ لاشوں سے پٹا ہوا تھا جس سے بے پناہ تعفن اٹھ رہا تھا، اس لئے فیکٹری میں ٹھہرنا ناممکنات میں سے تھا۔ ہمیں پینے اور نہانے دھونے کی ضروریات کے لئے پانی ریلوے سٹیشن سے لانا پڑتا تھا ہم نے رائس فیکٹری کی ناگفتہ بہ حالت کے بارے میں تحصیلدار کے پاس جا کر داد فریاد کی تو اس نے ہمیں ننکانہ صاحب میں ایک کشادہ دو منزلہ مکان الاٹ کر دیا اور اس طرح ننکانہ صاحب سے ہمارا پہلا تعارف ہوا۔

ننکانہ صاحب پہنچ کر ہم نے نئے مکان میں رہائش اختیار کی تو معلوم ہوا کہ ہمارے گھر کے پچھواڑے ایک گوردوارہ ہے جہاں اب بھی سکھ رہتے ہیں جب ہم دوسری منزل سے یا چھت سے گوردوارے کی طرف نظر دوڑاتے تو گوردوارے کے صحن اور برآمدوں میں جا بجا سکھ نظر آتے اور ان کی گوربانی کی آوازیں تو ہر وقت کانوں میں پڑتی رہتیں چونکہ ہم اپنے خاندان کے چودہ پیاروں کو سکھوں کے ہاتھوں شہید کروا کر پاکستان آئے تھے اور ہمارے زخم تازہ تھے لہٰذا سکھوں کو نظروں کے سامنے دیکھ کر میرے والد میاں محمد علی مرحوم کا خون کھولنے لگتا اور آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ وہ رات بھر سو نہیں سکتے تھے اور

سکھوں سے انتقام لینے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ یہ صورتحال ہمارے لئے بڑی پریشان کن تھی لہٰذا ہم جلد ہی ننکانہ صاحب کو خیر باد کہہ کر لائل پور (فیصل آباد) منتقل ہو گئے۔

بہت سال بعد دوسری دفعہ مجھے ننکانہ صاحب جانے کا اتفاق اس وقت ہوا جب سابقہ مرکزی وزیر ریلوے میاں شمیم حیدر کی انتخابی مہم کے سلسلے میں وہاں مقامی دوستوں نے میاں محمد منشی بانی منشی ہسپتال بندر روڈ، چودھری سردار محمد، صدر انجمن فلاح ارائیاں پنجاب اور راقم کو، جو اس وقت انجمن کا سیکرٹری جنرل تھا، مدعو کیا تھا۔ ہماری کوششوں سے میاں شمیم حیدر کامیاب ہو گئے تھے۔

تیسری بار میں اس وقت ننکانہ صاحب گیا جب میرے دوست شمشیر نگھ اور ان کی پتنی گلشن یاترا کے لئے ننکانہ صاحب آئے ہوئے تھے۔ میں نے گوردوارے میں ان کی رہائش کا کمرہ تو تلاش کر لیا تھا لیکن وہ دونوں میاں بیوی کمرے میں موجود نہ تھے۔ میں نے استقبالیہ پر جا کر اپنی آمد اور اپنے میزبانوں کے ناموں کا اعلان کرایا اور واپس کمرے میں آ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت کمرے میں صرف ایک ادھیڑ عمر خاتون موجود تھیں۔ دو چار منٹ بعد خاتون نے خود ہی مجھ سے گفتگو کا آغاز کر دیا، وہ پوچھنے لگیں۔ "بھائی صاحب! آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"لاہور سے، بہن جی!" میں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ لاہور کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور پھر اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

کچھ دیر وہ منہ دوسری طرف کر کے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہیں اور کمرے میں سناٹا چھایا رہا۔ پھر خود ہی کہنے لگیں۔

"بھائی صاحب! آپ میرا ایک کام کر دیں گے۔"

"اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا، فرمائیے" میں نے پہلے کی طرح ملائمت سے جواب دیا۔

"آپ پرانی انارکلی جین مندر کے علاقے سے واقف ہیں؟" اس خاتون

نے پوچھا۔

''میں چوبیس پچیس سال پہلے کچھ عرصہ وہاں رہا ہوں اس لئے علاقہ میرا جانا پہچانا ہے۔ آپ کام بتایئے۔'' میں نے کہا۔

وہ پھر کچھ دیر خلاؤں میں گھورتی رہی۔ پھر اس نے مجھے دو نام بتائے اور درخواست کی کہ میں ان تک یہ پیغام پہنچادوں کہ ''پٹیالہ سے بنتو آئی ہوئی ہے۔ وہ فلاں دن بادامی باغ سٹیشن پر آ کر اسے مل جائیں۔'' اس نے گلی یا مکان نمبر کچھ نہیں بتایا، نہ اسے معلوم تھا۔

میں نے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں، لہجے میں لڑکھڑاہٹ اور چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے اندازہ لگایا کہ خاتون کے دل پر کوئی گہرا گھاؤ ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ اس کا پیغام پہنچ جائے گا۔ پھر کچھ توقف کے بعد اس سے کہا۔ ''اگر آپ مجھے اپنا اصلی نام بتانا پسند کریں تو مجھے آپ کا پیغام آپ کے بھائیوں تک پہنچانے میں آسانی رہے گی۔''

بھائیوں کا لفظ میں نے خود ہی گھڑ لیا تھا ورنہ اس نے تو صرف دو نام ہی بتائے تھے (وہ نام میں جان بوجھ کر لکھ نہیں رہا ہوں تاکہ اس راز پر پردہ ہی پڑا رہے)

''بلقیس'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

اب تو وہ باقاعدہ سسکیاں بھرنے لگی۔ کمرے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو میں نے کینٹین سے دو پیپسی کی بوتلیں لا کر ایک اسے پیش کی اور دوسری خود پینے لگا۔ اب میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنی کہانی تفصیل سے سنائے تاکہ میں اسے اپنی نئی کتاب ''آزادی کی قیمت'' کے لئے قلمبند کرسکوں۔ اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

''بھائی صاحب! میں ہزاروں بدنصیب عورتوں میں سے ایک ہوں جو تقسیم ملک کے وقت عزیز رشتہ داروں کو قتل کر کے سکھوں نے اغواء کرلی تھیں۔ میرے والدین کا تعلق انبالہ شہر سے تھا۔ میرے والد کورٹ کچہری میں منشی تھے۔ ان کی شہر میں بڑی عزت تھی،

کیونکہ وہ کورٹ کچہری کے معاملات میں ہر کسی کی بے لوث خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ میں نے انبالے میں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر میری شادی میرے خالہ زاد سے پٹیالہ میں کردی گئی۔ میرے خالو پٹیالہ کے راجہ کی پولیس میں حوالدار تھے اور میرے میاں کسی دفتر میں کلرک، اچھی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ میری خالہ، خالو اور میرے شوہر، جو والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، سب مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ اللہ نے فروری 1947ء میں مجھے ایک چاند سا بیٹا عطا کردیا جس سے گھر کی رونقیں اور بھی دوبالا ہوگئیں اور خاندان میں میری قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی۔

تقسیم کا اعلان ہوتے ہی تمام ریاستی مسلمان نوکریوں سے فارغ کردیئے گئے۔ میرے خالو سے سرکاری رائفل اور پستول کے علاوہ اس کا ذاتی لائسنس یافتہ ریوالور بھی جمع کرالیا گیا۔ شہر کے گردونواح اور پنجاب بھر سے فسادات کی خبریں آنی شروع ہوگئیں۔ جس سے ریاست بھر کے مسلمانوں میں خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیلنا شروع ہوگئی۔ پھر آہستہ آہستہ فسادات کی یہ آگ پٹیالہ شہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

ایک روز میرے خالو کے ساتھ کام کرنے والوں میں سے ایک سکھ حوالدار ہمارے گھر اور بتایا کہ پورا شہر فسادات کی زد میں آچکا ہے۔ مہاراجہ نے مسلمانوں کو بحفاظت پاکستان پہنچانے کے لئے بہادر گڑھ کے قلعے میں کیمپ قائم کیا ہے، سب مسلمان وہاں منتقل ہورہے ہیں، بہتر ہے آپ بھی وہاں چلے جائیں چنانچہ ہم نے جلدی جلدی مختصر سا سامان اٹھایا اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ ہوگئے۔ پولیس کے چند سپاہی بظاہر قافلے کی حفاظت کے لئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان پولیس والوں میں وہ حوالدار بھی شامل تھا جو ہمیں قافلے میں شامل ہونے کی ترغیب دینے ہمارے گھر آیا تھا۔

ابھی قافلہ شہر سے کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک جگہ پہلے سے موجود مسلح سکھوں نے قافلے پر حملہ کردیا۔ پولیس صرف تماشائی بنی ہوئی تھی۔ ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ نہتے اور غیر مسلح مسلمان بے دریغ قتل کئے جارہے تھے، مال و اسباب لوٹا جارہا تھا اور نوجوان مسلمان لڑکیاں گھسیٹ گھسیٹ کر اور بالوں سے پکڑ کر اغواء کی جارہی

تھیں۔ ہر طرف اس قدر شور و غل اور آہ و بکا تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک کرپان سے مسلح ایک نوجوان سکھ نے میرا بازو پکڑا اور مجھے گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنے بچے کو دوپٹے کے اندر چھپا کر کاندھے سے لگایا ہوا تھا تا کہ اسے سورج کی تمازت سے بچا سکوں جب سکھ نے مجھے جھٹکے سے کھینچا تو بچہ میری گرفت سے نکل کر زمین پر گر کر رونے لگا اور سکھ اپنی کرپان بچے کے سینے میں پیوست کرنے کے لئے جیسے ہی جھکا، میرے خاوند نے اس کی گردن دبوچ لی اور اتنے زور سے اس کا گلا دبایا کہ سکھ کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور میں اس کے دوسرے بازو کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور فوراً بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ سکھ اپنے آپ کو میرے میاں کی آہنی گرفت سے آزاد نہ کرا سکا اور اس کی کرپان زمین پر گر گئی۔

میرے خالو نے اپنے بیٹے کو سکھوں سے گتھم گتھا ہوتے ہوئے دیکھا تو سامان کی گٹھڑی پھینک کر کرپان اٹھا لی اور اس سکھ کے سینے سے آر پار کر دی۔ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میرے خالو چونکہ پولیس کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے کئی اور حملہ آوروں کو جہنم رسید کر دیا۔ اتنے میں ایک سنسناتی ہوئی گولی ان کے سر میں آ کر لگی اور ان کا بھیجا باہر نکل آیا اور انہوں نے کلمہ پاک کا ورد کرتے ہوئے شہادت پائی۔ میری خالہ اپنے خاوند کی لاش پر جھک کر بین کرنے لگی کہ ایک حملہ آور کی تلوار کے ایک ہی وار سے ان کی گردن کٹ گئی اور خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ حملہ آور جیسے ہی میری خالہ کے سونے کے کنگن اتارنے کے لئے جھکا، میرے خاوند نے اس کی گردن بھی اپنے ہاتھوں کے آہنی شکنجے میں دبوچ لی اور اس وقت تک نہیں چھوڑی جب تک اسے جہنم رسید نہیں کر دیا۔

اب میرا خاوند مجید مردہ سکھ کی تلوار لے کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے لگا اور مجھے اشارہ کیا کہ میں قریب ہی واقع مکئی کے کھیت میں چھپ جاؤں۔ اتنے میں ایک اور سنسناتی ہوئی گولی آئی جو میرے خاوند مجید کے سینے سے آر پار ہو گئی۔ اس نے گرتے ہوئے پھر مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کیا چنانچہ میں مکئی کے کھیت میں گھس گئی اور اپنے اندازے کے مطابق کھیت کے درمیان پہنچ کر اپنے بچے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ شدید حبس، گرمی اور پیاس سے

میرا اور میرے بچے کا گلا اتنا خشک ہو چکا تھا کہ چیخنا چلانا تو کیا آواز تک حلق سے نہیں نکل رہی تھی، میرے پاس اس وقت جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں، سونے کی چھ چوڑیوں اور کانوں کے بندوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

خیر شام تک کھیت کے باہر سے چیخ و پکار اور آہ و بکا کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر جیسے جیسے اندھیرا پھیلتا گیا۔ یہ آوازیں بھی ختم ہوتی گئیں۔ رات کو کبھی کبھار کسی زخمی کے کراہنے کی آواز آ جاتی تھی اور کبھی کبھی کھیت کے اندر بھی سرسراہٹ ہونے لگی تھی اور ہلکی ہلکی کھسر پھسر بھی سنائی دے جاتی تھی جس کا مطلب تھا کہ میری طرح کچھ اور لڑکیاں بھی کھیت میں پناہ لئے ہوئے تھیں۔ میرا بچہ، جو میرا اس دنیا میں اب واحد اثاثہ تھا میری گود میں ایسے خاموش تھا جیسے وہ زندہ جاوید بچہ نہ ہو، روئی کا گڈا ہو۔ رات بھر وہ ایک دفعہ بھی نہیں رویا۔ میں اسے دودھ پلانے کی کوشش کرتی تو وہ چند گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا۔ کبھی کبھی مجھے شک ہونے لگتا کہ شاید اس میں جان ہی نہیں ہے لیکن اس کا جسم گرم اور سانس چل رہی تھی۔

ساری رات اسی عالم میں کٹ گئی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے اندازہ ہوا کہ صبح ہوگئی ہے لیکن مکئی کے قدآدم پودوں کے درمیان تو رات جیسی تاریکی تھی جب قدرے اجالا ہوا تو بچے کو زمین پر اپنا دوپٹہ بچھا کر لٹایا اور پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ ایک جگہ نشیب میں بارش کا کچھ پانی جمع تھا۔ چلّو سے خود بھی پیا اور اپنی قمیض کا کنارہ بھگو کر بچے کے حلق میں بھی چند قطرے ٹپکائے۔ گزشتہ ڈیڑھ دن کی مسلسل پیاس سے میرا دودھ بھی خشک ہو رہا تھا اور اپنی زندگی سے زیادہ اپنے بچے کی زندگی کی فکر تھی۔ اگلا پورا دن بھی کھیت میں ہی گزر گیا۔ دن بھر بے پناہ تپش، حبس، گرمی برداشت کی۔ بچہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ کھیت کا گدلا پانی پلانے سے اسے دست آنے شروع ہو گئے تھے اور یہ بات میرے لئے بہت تشویش کا باعث تھی۔ میں دل ہی دل میں گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدایا! میری زندگی بے شک لے لے لیکن میرے بچے کو بچا لے۔

تقریباً اڑتالیس گھنٹے مکئی کے کھیت میں چھپے رہنے کے بعد اور بچے کی حالت بگڑنے کی وجہ سے میری ہمت جواب دے گئی اور شام کے وقت میں اپنے نیم جاں بچے کو

ہاتھوں پر اٹھائے کھیت سے باہر آ گئی۔ بھوک اور پیاس سے برا حال تھا۔ مکئی کے بھٹے کچے کھانے کی کوشش کی تھی لیکن حلق سے نیچے نہ اتار سکی۔ کھیت سے باہر نکل کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو تھوڑی دور ایک رہٹ (کنواں) نظر آیا۔ میں اس خیال سے کنویں کی طرف بڑھی کہ شاید اس کے چوبچے میں تھوڑا بہت پانی ہوگا جس سے میں اپنی پیاس بجھا سکوں گی لیکن قریب جا کر دیکھا تو جو تھوڑا سا پانی چوبچے میں موجود تھا اس کا رنگ سرخ تھا۔ شاید سکھ حملہ آور قافلے کے قتل عام کے بعد اپنی تلواریں اور کرپانیں اس پانی میں دھوتے رہے تھے۔ رہٹ کی ٹنڈوں میں تھوڑا تھوڑا پانی موجود تھا۔ میں نے بچے کو دوپٹہ بچھا کر زمین پر لٹایا اور چلو سے ٹنڈوں سے تھوڑا سا پانی پیا۔ اب میں پریشانی کی حالت میں بچے کے سرہانے بیٹھی تھی اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ بچے کی سانس اکھڑنے لگی۔ میرے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور میرے گلے سے دلدوز چیخ خود بخود نکل گئی اور پھر میں بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میری نظریں اپنے لخت جگر کے چہرے پر مرکوز تھیں کہ مجھے کچھ آہٹ محسوس ہوئی، نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر سکھ ہاتھ میں درانتی پکڑے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ اب میں اپنی اور بچے کی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی، لہٰذا اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہ کی۔

سکھ نے قریب آ کر کہا۔ ''بیٹی کیا بات ہے؟ اس وقت یہاں کیوں بیٹھی ہو اور چیخ کیوں ماری تھی؟'' میں نے جواب دینے کی بجائے اپنی گود میں پڑے ہوئے معصوم بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ سکھ نے بچے کو غور سے دیکھا، کچھ دیر توقف کیا پھر کہنے لگا۔ ''اٹھو! میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے، میں بچے کو کسی وید یا حکیم کو دکھاؤں گا۔''

پھر اس نے لپک کر بچے کو میری گود سے اچک لیا اور دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر تیز تیز قدموں سے اپنے گاؤں کی طرف چلنے لگا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑی، اس کا گھر گاؤں کے باہر کی طرف ایک پکے مکان اور بڑے احاطے پر مشتمل تھا۔ ایک طرف مویشیوں کا باڑہ تھا جہاں ایک بھینس، کٹی، گائے اور بیلوں

کی جوڑی بندھی ہوئی تھی اور ایک گڈا کھڑا تھا چونکہ اس وقت ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہمیں کسی نے گھر میں داخل ہوتے ہوتے نہیں دیکھا۔ گھر پہنچ کر اس نے مجھے ایک چارپائی پر بٹھا کر بچہ میری گود میں ڈال دیا اور خود اپنی ادھیڑ عمر بیوی کی طرف لپکا جو باڑے میں مویشیوں کو چارہ ڈالنے میں مصروف تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے کچھ کھسر پھسر کی او جلدی سے باہر چلا گیا۔ اس کی بیوی نے میری اور بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جلدی سے گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ لا کر مجھے پینے پر اصرار کرنے لگی۔ بھوک سے میری بری حالت تھی اور دوجھ بھی خشک ہو چکا تھا۔ اس کے زور دینے پر میں نے دودھ کے چند گھونٹ پیے تو جسم میں کچھ جان پڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد سردار بھی آ گیا اور اس نے دوائی کی چند پڑیاں میری ہتھیلی پر رکھ دیں اور کہنے لگا۔ "ویدجی نے کہا ہے کہ ایک ایک دو پڑیوں سے بچے کے دست رک جائیں گے اور صبح وہ خود بھی آ کر بچے کو دیکھ لیں گے۔"

میں نے ایک چمچ پانی میں دوائی کی پڑیا ملا کر بچے کے حلق میں انڈیل دی اور اوپر سے اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔ پہلے تو بچے نے دودھ نہیں پیا لیکن دوائی کے آدھے گھنٹے بعد اس نے آہستہ آہستہ دودھ پینا شروع کر دیا۔ صبح تک اسے دو دفعہ کے علاوہ دست بھی نہیں آئے اور اس کی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی اور اس کے چہرے پر کچھ رونق بھی آ گئی تھی۔

مجھے دودھ پلانے کے ایک گھنٹہ بعد سردار کی بیوی نے مجھے ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی کھانے کو دی جو میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کھا لی۔

میرے تمام کپڑے بچے کے دن بھر کے دستوں کی وجہ سے خراب ہو چکے تھے اور ان میں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ سردارنی نے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر مجھے دیا اور احاطے میں موجود کنویں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں اپنے کپڑے بدل کر دھو ڈالوں۔ چنانچہ میں نے ڈول سے کنویں سے پانی نکالا اور بالٹی بھر کر کنویں سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر

اپنے کپڑے دھوئے۔ پھر انہی گیلے کپڑوں سے اپنا جسم صاف کیا اور سردارنی کے دیئے ہوئے کپڑے پہن لئے۔ اس دوران سردارنی نے اپنی میاں بیوی کی چارپائیوں سے ذرا ہٹ کر میرے لئے چارپائی بچھا کر بستر لگا دیا۔ جس پر اپنے بچے کو لے کر لیٹ گئی۔ چونکہ تین دن سے ایک لمحے کے لئے سوئی نہ تھی للہذا بستر پر پڑتے ہی نیند آ گئی اور اس وقت آنکھ کھلی جب سردار مویشیوں کو کھیتوں کی طرف لے جانے کے لئے کھول رہا تھا اور سردارنی بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ رات کو میاں بیوی نے میری روداد بالکل نہیں پوچھی اور نہ ہی میں نے بتانے کی کوشش کی۔

میں نے بچے کو دیکھا۔ وہ پرسکون نیند سو رہا تھا۔ میں نے کنویں سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھوئے اور پھر امریت کور (سردارنی کا نام جو بعد میں مجھے معلوم ہوا) کے ساتھ مل کر باڑے کی صفائی گوبر وغیرہ اکٹھا کرنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اب اس نے مجھے کہنا شروع کیا۔

''بیٹی! کوئی ہمسائی ہمارے گھر آئے تو اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ سردار جی اور میں اپنے رشتہ داروں یا ہمسایوں کو یہی بتائیں گے کہ تم سردار جی کی بھانجی ہو اور لٹ لٹا کر راولپنڈی سے بمشکل اپنی اور بچے کی جان بچا کر ہم تک پہنچی ہو۔ تمہارے خاندان کے سب لوگوں کو ہندوستان آتے ہوئے گوجر خاں کے قریب مسلمانوں نے حملہ کر کے قتل کر دیا ہے۔'' چنانچہ میں نے یہ بات پلے باندھ لی۔

وقت گزرتا رہا۔ میرا بچہ چند دن میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا اور قلقاریاں مارنے لگا۔ وہ سردار جی اور سردارنی کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ دونوں چونکہ بے اولاد تھے اس لئے میرے بچے سے بے پناہ پیار کرنے لگے۔ سردار جی تو اکثر بڑے فخر سے کہتے۔ ''واہ گورو نے ہمیں بڑھاپے کا سہارا دے دیا ہے۔ ہم اسے پڑھائیں لکھائیں گے اور بڑا آدمی بنائیں گے۔''

یہاں میں ایک اور بات بتا دوں کہ میرے سسرالی خاندان کے رسم و رواج کے

مطابق میرے بیٹے کی پیدائش کے ایک ہفتے بعد ہی اس کی ''مسلمانی'' کردی گئی تھی، لہٰذا مجھے دونوں میاں بیوی نے بڑی سختی سے ہدایت کی کہ میں بچے کو ہر وقت لنگوٹ باندھ کر رکھوں تاکہ کسی کو یہ پتہ نہ چل سکے، یہ کسی مسلمان کا بچہ ہے ورنہ اس وقت مسلمانوں کے خلاف سکھوں کے دلوں میں جس قدر نفرت کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ ہم سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی تھیں۔

ان دنوں شدید بارشیں ہو رہی تھیں اور دریاؤں میں بے پناہ طغیانی آ چکی تھی۔ کسی قریبی گاؤں میں سردارنی کا بھائی رہتا تھا جس کا مکان سیلاب میں بہہ گیا تھا۔ کچھ مالی مدد حاصل کرنے کے لئے سردارنی کا ایک بھتیجا اپنی پھوپھی کے گھر آ کر ٹھہرا اور مجھ پر فریفتہ ہو گیا۔ اچھی خوراک، ذہنی سکون اور دونوں میاں بیوی کے پیار سے میرا رنگ روپ بھی قدرے نکھر آیا تھا۔ چند دن بعد سردارنی کا بھائی سردار جی کی ''بھانجی'' کا رشتہ مانگنے آ گیا۔

سردار جی نے مجھے الگ بلا کر میری رائے پوچھی۔ چونکہ میرا سسرالی خاندان تو میری آنکھوں کے سامنے شہید کر دیا گیا تھا۔ میرے سسر اور خاوند کو شہید کرنے والا وہی بدبخت حوالدار تھا جو سالہا سال تک میرے خالو کے ساتھ پولیس میں کام کرتا رہا تھا اور ہمیں قافلے میں شامل ہو کر پاکستان چلے جانے کا مشورہ دینے ہمارے گھر آیا تھا۔ انبالے میں میرے میکے والوں پر کیا گزری؟ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی ہی تاریکی تھی لہٰذا جب سردار جی نے مجھ سے شادی کے بارے میں پوچھا تو میری زبان گنگ ہو گئی لیکن آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا۔ انہوں نے میری خاموشی کو رضامندی خیال کرتے ہوئے ''ہاں'' کر دی لیکن شرط یہ عائد کر دی۔ بچہ وہ اپنے پاس رکھیں گے اور اس کی پرورش خود کریں گے۔

اس طرح دسمبر کے مہینے میں تیجا سنگھ سے میری شادی کر دی گئی۔ میں نے قربانی اپنے بچے کی زندگی کی خاطر دی۔ تیجا مجھے اپنے گاؤں لے گیا۔ چند دن میں اپنے بچے کو بچے

مجھے یاد کر کے روتے رہے لیکن آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ گئے۔ شروع شروع میں میں ہفتہ دس دن کے بعد اپنے بچے کو دیکھنے اپنے ''میکے'' چلی جاتی تھی۔ پھر ان ملاقاتوں میں بھی زیادہ وقفہ آنے لگا۔

تیجا ایک اجڈ اور اکھڑ طبیعت سکھ تھا۔ ان پڑھ تھا اگرچہ مجھ سے پیار بھی بہت کرتا تھا لیکن کبھی کبھی شراب کے نشے میں دھت ہو کر مار پیٹ بھی کر لیتا تھا۔ میں صبر و شکر کے ساتھ وقت گزارتی رہی۔ 1960ء کے اپریل کے مہینے میں کھیتوں میں کام کرنے کے دوران تیجے کو زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور کسی قسم کی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اس نے خون تھوکتے ہوئے دم دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد میرے سسرال نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا چنانچہ میں اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر میکے واپس آ گئی۔ میرے میکے والوں نے میرے بچوں کی بہترین طریقے سے پرورش کی۔

اب میرے تینوں بچے شادی شدہ ہیں۔ میرے محسن روحانی باپ سردار پرتاپ سنگھ سرگباش ہو چکے ہیں۔ میری ''ماں'' کی خواہش تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ ننکانہ صاحب کی یاترا کر لے۔ وہ بہت ضعیف ہو چکی ہیں۔ سہارے کے بغیر چل پھر نہیں سکتیں۔ چنانچہ میں اور میرا بیٹا امیر سنگھ (امیر حسین) اسے لے کر یہاں آئے ہیں۔ مجھ پر ان کے بہت احسانات ہیں۔ میرے بیٹے کو انہوں نے بی اے تک پڑھایا اور اب سرکاری ملازم ہے۔ وہ اپنی ''نانی'' کو ساتھ لے کر مذہبی تقریب میں شرکت اور شبد کیرتن سنانے کے لئے گوردوارے لے کر گیا ہے۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی اللہ اللہ کر کے اپنے پیدا کرنے والے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں۔ میرے سکھ ''ماں باپ'' نے مجھے کبھی مجبور نہیں کیا کہ میں ان کی مذہبی رسومات میں شرکت کروں۔

ہمیں باتیں کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے کہ اتنے میں ایک گبھرو سنگھ ایک انتہائی ضعیف العمر خاتون کو سہارا دیتے ہوئے ہمارے کمرے میں طرف آتے دکھائی دیتے۔ بلقیس (بانو) نے بتایا کہ یہی ان کا بیٹا اور ''ماں جی'' ہیں۔ امیر سنگھ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔

تھوڑی دیر بعد میرے دوست شمشیر سنگھ اور ان کی پتنی گلشن بھی آ گئے اور ہم آپس میں ایک دوسرے کی خیر خیریت معلوم کرنے لگے۔

میں نے لاہور واپس پہنچ کر بہت مشکل سے بلو کے بھائیوں کو ڈھونڈا جب میں نے انہیں بتایا کہ ان کی بہن بلقیس پاکستان، ننکانہ صاحب آئی ہوئی ہے اور بادامی باغ سٹیشن پر انہیں ملنا چاہتی ہے تو بڑا بھائی انور علی اپنی بہن کو یاد کر کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

لاہور میں بہن بھائیوں کی ملاقات ہوئی یا نہیں، مجھے نہیں معلوم کیونکہ بعد ازاں میرا کبھی ان سے رابطہ نہیں ہوا کیونکہ میں فوراً بعد امریکہ چلا گیا تھا۔

نوٹ: ہندوؤں اور سکھوں نے کپورتھلہ اور دوسرے علاقوں میں دنیا کی تاریخ کی جو بدترین خونریزی کی، اس کی تفصیلات بڑی ہی شرمناک اور دردناک ہیں۔ محترم میاں محمد ابراہیم طاہر نے ان تفصیلات پر مبنی ایک کتاب مرتب کی ہے۔ ”آزادی کی قیمت“۔ یہ کتاب مکتبہ داستان سے دستیاب ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ ”حکایت“ اگست 2007ء)

......☆......

دہلی کی لرزہ خیز داستاں

وفیدار بشیر احمد صاحب جو وائسرائے کی باڈی گارڈ میں تھے۔ رقم طراز ہیں:

7 ستمبر کو مجھے اور میرے چند ساتھی جوانوں کو حکم ملا کہ دہلی میں گڑبڑ شروع ہوگئی ہے اس لئے وہاں جاؤ ہمارے جوانوں کی ایک پارٹی پیدل اور ایک جمعیت آرمرڈ کار پر دہلی پہنچی۔ ہماری ڈیوٹی پہاڑ گنج میں لگی۔ اس وقت پہاڑ گنج کے مسلمان بڑی دردناک مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہاؤ ہو کا شور برپا تھا۔ ہندو اور سکھ جتھے مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر رہے تھے۔ مسلمان بدحواس ہو کر بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے سکھ ننگی تلواریں لئے انہیں قتل کرتے آ رہے تھے جب بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو علم ہوا کہ لیڈی ہارڈنگ ہسپتال کے قریب مسلمان فوجیوں کی گارد لگی ہے تو وہ اس طرف آنے لگے اور آدھ گھنٹہ میں وہاں کوئی پندرہ ہزار پناہ گزین جمع ہو گئے۔ سکھوں نے پیچھے سے ان پر بھی حملہ کر دیا۔

گارد نے ان پر گولی چلائی۔ کئی سکھ گرا لئے۔ یہ حال دیکھ کر وہ بھاگ گئے۔ انہوں نے ہندو رجمنٹ کے سکھ کیپٹن کو رپورٹ دی کہ ہسپتال کے قریب مسلمان فوجیوں کی ایک جمعیت ہے جس نے سکھوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس کپتان نے ہمارے اوپر ایک ہندو دستہ متعین کر دیا اور ان کو حکم دے دیا کہ اگر یہ مسلمان کسی سکھ یا ہندو کو گولی کا نشانہ بنائیں تو ان پر برین گن سے فائر کر دینا۔ اسی اثناء میں ہمارا انگریز کمان افسر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ہمیں وہاں سے نکالا اور پناہ گزینوں کو پہاڑ گنج سے باہر لے جا کر ایک کیمپ لگا دیا۔

حفاظت کے لئے گارد متعین کردی۔ اس گارد کا کمانڈر میں تھا۔ رات بھر ہمارے جوان آرمرڈ کار میں بیٹھ کر کیمپ کے گرد چکر لگاتے رہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پہاڑ گنج کے اندر مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر انہیں قتل کر رہے ہیں۔ کرفیو آرڈر کے باعث مسلمان گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے تھے لیکن ہندو اور سکھ کھلے بندوں اپنا کام کر رہے تھے۔ حملہ کرنے والوں کی تین پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی شہید کرنے والوں کی تھی۔ دوسری لوٹنے والوں کی اور تیسری آگ لگانے والوں کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو ایک مسجد کو آگ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ان پر فائرنگ کی، وہ بھاگ گئے لیکن ایک ہندو کیپٹن نے کہا کہ یہ تمہارا علاقہ نہیں اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے مجبوراً واپس آنا پڑا۔

8 ستمبر کو مجھے حکم ملا کہ تم اپنے جوانوں کی ایک مسلح کار اور سکھ جوانوں کی ایک مسلح کار لے کر پٹیل کی کوٹھی پر رپورٹ کرو۔ 9 بجے جا کر رپورٹ کی وہاں سے بلدیو سنگھ اور پٹیل ایک موٹر کار میں بیٹھ کر گشت کے لئے روانہ ہوئے۔ ہماری مسلح کار آگے اور سکھ گارد والی پیچھے تھی وہاں سے ہم سیدھے کناٹ پیلس پہنچے وہاں جا بجا لاشیں پڑی تھیں۔ مسلمانوں کے سروں کی ٹوپیاں اور عورتوں کے برقعے خون میں لت پت ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی دکانیں لوٹی ہوئی تھیں اور ان میں اکثر جلائی جا چکی تھیں۔ بلدیو سنگھ اور پٹیل کار میں بیٹھے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ کناٹ پیلس سے ہم پہاڑ گنج پہنچے وہاں میں نے رات کو جو کیفیات دیکھیں ان سے تین گنا زیادہ دن کو دیکھیں۔ سڑکوں پر لاشیں اس کثرت سے پڑی تھیں کہ گاڑیوں کا گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پولیس اور فوج کے سپاہی بھنگیوں سے لاشیں اٹھوا اٹھوا کر انہیں آگ لگوا رہے تھے۔ میں نے قہقہہ کی زوردار آواز سن کر پیچھے کی طرف دیکھا کہ بلدیو سنگھ نے قہقہہ مار پٹیل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پٹیل نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ یہ کیفیت دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

وہاں سے ہم قرول باغ اور ملتانی ڈھانڈا کی طرف نکلے وہاں زمین کے اوپر ایک ایک گز کے فاصلے پر لاشیں پڑی تھیں۔ کئی جگہ لاشوں کے ڈھیر لگا کر ان پر کوڑا کرکٹ پھینک

رکھا تھا۔گندے پانی کی نالیوں میں خون جم کر رہ گیا تھا۔ادھر سے ہم سبزی منڈی کی طرف گئے وہاں پہاڑ گنج سے بھی زیادہ ہولناک نظارے دیکھنے میں آئے وہاں ہم نے گاڑیوں کو روکا کیونکہ لاشوں کی وجہ سے راستہ نہیں تھا۔ایک سڑک کے داہنے موڑ پر میں نے دیکھا کہ قریباً ایک سو بچوں کی لاشیں یکجا اکٹھی کی ہوئی تھیں ایک سکھ دکاندار قرآن پاک کے اوراق میں سودا ڈال کر بیچ رہا تھا،ایک عورت کی برہنہ لاش اس کی دکان کے سامنے پڑی تھی۔پٹیل اور بلدیو سنگھ یہاں سے واپس چلے گئے۔وہاں سے مجھے حکم ملا کہ تم اپنی آرمرڈ کار لے کر ترکمان دروازہ کو جاؤ وہاں گورکھے متعین تھے اور کرفیو لگا ہوا تھا۔گورکھے شرابیں پی رہے تھے اور گلیوں میں ٹہل رہے تھے۔انگریز افسر کو میں نے حکم دکھایا کہ اس محلہ پر میری ڈیوٹی لگی ہے اس پر اس افسر نے گورکھوں کو رخصت کر دیا۔محلہ کے ہندوؤں نے مجھے ڈوگرا خیال کیا، اس لئے وہ آ آ کر کہنے لگے کہ ہم تمہیں شراب وغیرہ دیتے ہیں ایک کمرے میں بیٹھ کر داد عیش دو۔میں نے انہیں جانے کے لئے کہا وہ نہ ٹلے اس پر میں نے ان پر دو فائر کئے۔وہ سب بھاگ گئے۔مسلمان چار دن سے گھروں میں بند تھے۔میں نے انہیں خورد و نوش کی اشیاء جمع کرنے کی اجازت دے دی۔مسلمانوں نے مسجدوں میں جمع ہو کر نوافل اور اوراد پڑھے۔شام کو انگریز افسر مجھے ساتھ لے کر حوض قاضی کی طرف گیا وہاں ہندوؤں نے ایک بڑا لنگر جاری کیا ہوا تھا۔مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی۔میں نے وہاں سے کچھ نہ کھایا اور ترکمان گیٹ میں واپس آنے پر مسلمانوں نے مجھے اور میرے ساتھی جوانوں کو کھانا کھلایا۔رات وہاں امن سے گزری۔اگلے روز مجھے پہاڑ گنج کے پناہ گزینوں کے کیمپ میں جانے کا حکم ملا۔اس روز پناہ گزینوں کو لاریوں میں بٹھا بٹھا کر ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچایا جا رہا تھا۔ایک ایک لاری میں تین تین سو مرد عورت اور بچے ٹھونسے جا رہے تھے۔لاریوں پر سوار کرانے سے پہلے تلاشی لی جاتی تھی۔لاریاں دو دو گھنٹے دھوپ میں کھڑی رہتی تھیں۔بچے پانی مانگتے تھے تو انہیں جھڑک دیا جاتا تھا۔شام کے قریب سو لاریاں چلائی گئیں اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کے سامنے کھڑی کر دی گئیں۔اس وقت بارش ہو رہی تھی۔اندھیرا چھایا ہوا تھا۔پناہ گزین چیخنے چلانے لگے۔یہ لاریاں واپس لائی گئیں۔میں نے اپنی

آرمرڈ کار کی سرچ لائٹ کی مدد سے ان سب کو کیمپ کی چار دیواری میں داخل کیا، ہم رات کے گیارہ بجے تک یہ کام کرتے رہے۔

اگلے روز ہمیں حکم ملا کہ پرانے قلعہ میں جا کر پناہ گزینوں کے کیمپ کی حفاظت کرو وہاں پہنچ کر میں نے قلعہ کی چار دیواری کے گرد چکر لگایا۔ جنوب کی جانب جنگل میں پناہ گزینوں پر حملہ کرنے کے لئے ہندوؤں اور سکھوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ میں نے اس پر فائر کر کے انہیں ہاں سے منتشر کر دیا۔

اس سے اگلے دن فیض بازار میں میری ڈیوٹی لگی وہاں مسلمانوں کی تلاشیاں ہو رہی تھیں۔ سبزی کاٹنے کی چھریاں، بچوں کے کھیلنے کی ایئر گن یا پانی کے نل کی نالی ملتی تھی تو اسے بھی اسلحہ تصور کیا جاتا تھا۔ اگلے دن اخبروں نے چھاپا کہ فیض بازار کے مسلمانوں کے گھروں سے تلواریں اور رائفلیں برآمد ہوئیں اور 8 انچ دہانہ کی ایک توپ بھی ملی۔ یہ سب جھوٹ تھا وہاں سے کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی تھی۔

اس کے اگلے دن مجھے شاہدرہ جانے کا حکم دیا گیا وہاں میں نے ایک شہید کی ہوئی مسجد دیکھی جس کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا تھا۔ میں نے شہر کا چکر لگایا وہاں مجھے کوئی مسلمان نظر نہیں آتا تھا۔ دکانیں لوٹی ہوئی اور جلائی ہوئی تھیں۔ مسلمان کئی مقامات پر چار دیواری کے اندر بند تھے چار دن سے انہیں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملا تھا۔ میں نے بعض جگہ کے پناہ گزینوں کے لئے راشن حاصل کرنے کا بندوبست کیا۔ پانچ دن کے بعد دہلی میں کچھ امن ہو گیا، پھر ہم لوگ شہر نہ جا سکے۔

پیر عرفان احمد قریشی فہمی اپنے بیان میں لکھتے ہیں:

فتح پوری کی مسجد میں پانچ ستمبر کو نماز جمعہ کے بعد بم پھینکا گیا اس کے بعد شہر بھر میں اسی گھنٹہ کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اس کرفیو کے دوران میں حکومت نے حملہ آوروں اور ملٹری کی مدد سے مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی بستیاں جو شہر سے دور تھیں، خالی کرا لیں۔ سبزی منڈی، قرول باغ، لاری اڈا اور بنی کریم وغیرہ بہت تباہی مچائی۔ صبح کے وقت دو گھنٹہ کے

لئے کرفیو کھلا تھا تو ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قافلوں کی صورت میں فراش خانے سے گزرتے تھے۔ فراش خانہ میں کارکنوں نے مہاجرین کی امداد اور سہولت کے لئے کیمپ قائم رکھا تھا۔

وحشت اور بربریت:

مشرقی پنجاب، دہلی اور شمالی ہند کی ریاستوں میں ہندوستان کے آزاد ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کی جو مہم ایک منظم اور ہمہ گیر سازش کے ساتھ شروع کی گئی۔ اس کی بھیانک اور ہولناک کیفیات کے بہت سے مناظر ان بیانات میں دکھائے جا چکے ہیں جو عینی شاہدوں اور صحیح اطلاعات رکھنے والے لوگوں نے ''آپ بیتیوں'' کے سلسلے میں ارسال کئے تاہم شمالی ہند کے سکھوں اور ہندوؤں کی وحشت و بربریت کا صحیح نقشہ کھینچنے سے یہ بیانات قاصر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں نے آزادی حاصل کر لینے کے نشے سے بدمست ہو کر سفاکی، خونریزی، غارت گری اور درندگی کے جن وحشیانہ جرائم کا ارتکاب کیا، انہیں کسی مورخ یا ادیب کا قلم لکھنے سے عاجز ہے۔ چہ جائیکہ ان کی صحیح صحیح تصویر کھینچ کر دکھائی جا سکے۔ جنگل کے درندے اور کوہستانوں کے بھوکے بھیڑیئے تو اپنے شکار کو محض چیرنے پھاڑنے ہی تک اکتفا کر لیتے ہیں لیکن شمالی ہند کے ان آدم نما حیوانوں نے صنف نازک پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے جو ازمنہ قبل از تاریخ کے وحشی انسانوں کے وہم و گمان بھی نہ آئے ہوں گے۔ دور وحشت کا انسان بھی عورتوں پر بے جا دست درازی کرنے سے طبعاً ہچکچاتا تھا لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے بیسویں صدی مسیحی کے دور تہذیب میں وہ کچھ کر دکھایا جس پر انسانیت قیامت تک اپنا سر پیٹتی رہے گی۔ آئندہ آنے والے ادوار کے لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آیا انسانوں کی کوئی جماعت منظم سازش اور صمیم ارادے کے ساتھ ان ننگ انسانیت افعال کا ارتکاب کر سکتی ہے جو 1947ء کے تین چار مہینوں میں دریائے مواج کی سی روانی اور بحر ذخار کی سی فراوانی کے ساتھ صفحۂ ایام پر ثبت کر کے دکھائے گئے۔ اس سلسلے میں جو تصویر ہم کھینچ رہے

ہیں اسے حقیقت حال کا ایک مجمل ساخاکہ سمجھنا چاہیے۔اس تصور کا ایک ایک خط سینکڑوں بلکہ ہزاروں واقعات کی نمائندگی کرر ہا ہے اوران سچی اور صحیح اطلاعات پرمبنی ہے جو ہزاروں انسانوں نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کی ہیں۔

حکومت کی فوج اور پولیس نے عامتہ الناس کے لشکروں سے مل کر نہتے، بے بس اور بے خبر مسلمانوں کو گھیرے میں لے لے کر بندوقوں، رائفلوں، برین گنوں، سٹین گنوں، بموں، ہتھ گولوں، برچھیوں، نیزوں، تلواروں، کلہاڑیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا، قتل عام کیا اور خاک وخون میں لوٹایا۔

اس قتل عام میں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں تک کو تہ تیغ کرڈالا۔ بلکہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے جنینوں تک کو نیزوں کی انیوں پر لٹکایا۔

مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو زندہ نذر آتش کردیا۔ بچوں کو زندہ اس آگ کے شعلوں میں پھینکا جو ان وحشیوں نے مکانوں اور گھروں کو جلانے کے لئے بھڑکائی تھی۔

زخمیوں کو زندہ دفن کرادیا گیا۔

لاشوں تک کے ٹکڑے کرڈالے۔ اعضا وجوارح کاٹ کاٹ کر الگ الگ پھینک دیئے۔ مردوں کے آلات تناسل کاٹ کر ان کے مونہوں میں ڈال دیئے گئے۔

بچوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت ان کی ماؤں کے مونہوں میں ٹھونسا گیا اور ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا۔

دودھ پیتے بچوں کو کیلیں ٹھونک کر دیواروں سے ٹانک دیا گیا اوران کے تڑپ تڑپ کر جان دینے کا تماشا دیکھا۔

عورتوں کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں اور سکھ درندوں نے ان کٹی ہوئی چھاتیوں کے ہار پرو کر اپنے گلوں میں ڈالے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے اکادکا واقعات کا تذکرہ کیا ہے، نہیں بلکہ ایسے وحشت انگیز اور بربریت خیز جرائم کا ارتکاب مشرقی پنجاب دہلی اور ریاستوں میں جابجا بہت وسیع پیمانہ پر کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفاکوں اور درندوں کو خاص طور پر ایسی ایسی حرکات کے

ارتکاب کی ہدایات دی گئی تھیں۔

اس موقع پر مجھے اس امر کا اعتراف کر لینے میں بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ مشرقی پنجاب کے ان واقعات کی اطلاعیں جب پناہ گزینوں کی زبانی مغربی پنجاب میں پہنچیں تو بعض مقامات پر مسلمان بھی اشتعال میں آگئے اور انہوں نے بھی مغربی پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں پر بعض ایسی ایسی زیادتیاں کیں جو انہیں نہیں کرنی چاہئے تھیں لیکن ان کی زیادتیاں فقط یہ تھیں کہ انہوں نے بعض اقطاع میں سکھوں اور ہندوؤں کے چند افراد قتل کر دیئے اور انہیں اپنے اپنے مسکنوں سے بھاگ کر پناہ گزین بننے پر مجبور کر دیا۔ بعض لوگوں نے ان کی عورتیں بھی چھین لیں لیکن مغربی پنجاب کے مسلمانوں کا دامن وحشت و بربریت کی ان حرکات سے پاک رہا جن کا تذکرہ اس فصل میں مشرقی پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کے بارے میں کیا گیا ہے۔ قتل اور غارت گری کی وارداتیں بھی مغربی پنجاب میں صرف معدودے چند مقامات پر وقوع پذیر ہوئیں۔ عام ہندو اور سکھ تبادلہ آبادی کی اسکیم کے ماتحت سرکاری حفاظت انتظام کے ساتھ اٹھائے گئے اور مشرقی پنجاب میں پہنچا دیئے گئے۔ مغربی پنجاب کے مسلمانوں نے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہیں اٹھائے تاہم جن لوگوں نے بے گناہ سکھوں اور ہندوؤں کو جوش اشتعال میں آکر ناروا طور پر قتل کیا اور ان کی عورتوں کو جبراً گھروں میں ڈال لیا، انہوں نے بہت برا کیا۔ خدائے غفور و رحیم ان کے اس ظلم کو معاف فرمائے۔ (آمین)

نتائج:

ہندوؤں اور سکھوں نے آزاد ہونے کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب کے اضلاع، ریاستوں اور دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام اور اخراج کی جو مہم شروع کی وہ چار ماہ کے قلیل عرصہ میں حسب ذیل نتائج پیدا کرنے کا موجب بنی۔

مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع امرتسر، گورداسپور (ماسوائے تحصیل شکر گڑھ) فیروز پور، جالندھر، ہوشیار پور، کانگڑہ، انبالہ، رہتک، حصار، گڑگانوں، نیز کپورتھلہ، پٹیالہ، جیند نابھہ، کلسیہ، الور، بھرت پور اور کوہستان شملہ کی تمام ریاستوں سے مسلمان بیک بنی و

دو گوش نکال کر باہر پھینک دیئے گئے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والا اور اس حقیقت کبریٰ کا اقرار واعلان کرنے والا ایک متنفس بھی اس وسیع ملک میں جس کا رقبہ سترہ ہزار مربع میل ہے، باقی نہ رہا۔ مخفی نہ رہے کہ بہار کے صوبہ سے مسلمانوں کے اخراج کا کام بہت پہلے پایہ تکمیل کو پہنچایا جا چکا تھا۔ اس قتل عام اور اخراج کے باعث مسجدیں ویران ہو گئیں، بزرگوں کے مزار تباہ کر دیئے گئے ۔ ہزاروں مسلمان عورتیں جبراً وقہراً لونڈیاں بنا کر رکھ لی گئیں۔ ہزاروں بچے چھین لئے گئے اور ہزاروں خاندان ہندو یا سکھ بنا لئے گئے۔

ان اقطاع کی چھپن لاکھ آبادی میں سے لاکھوں کلمہ گویان توحید قتل کر دیئے گئے۔ اکثر گولیوں کا شکار ہوئے، بہت تیز دھار رکھنے والے آلات سے مارے گئے۔ بہت بڑی تعداد زندہ نذر آتش کر دی گئی۔ یہ ساری زمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی۔ کلمہ گویان توحید کی لاشوں سے پٹ گئی۔ چیلوں، کوؤں، گدھوں، کتوں اور گیدڑوں نے ان کا گوشت نوچ نوچ کر اس حد تک کھایا کہ سیر ہو کر منہ موڑ گئے۔

لاکھوں مسلمان حشر تمثال کیمپوں کے زہرہ گداز مصائب اور سفر کی ناقابل برداشت صعوبتوں کا شکار ہو کر مر گئے اور جہاں جہاں سے گزرے اپنے قبرستانوں سے زمین کو آباد کرتے گئے۔

ہزاروں مسلمان بارشوں کے باعث آنے والے سیلابوں اور دریاؤں کی طغیانیوں میں غرقاب ہو کر بہہ گئے، دریائے بیاس کے دونوں طرف کئی کئی میل تک زمین ان کی گلی سڑی لاشوں سے پٹ گئی۔ گرانڈ ٹرنک روڈ پر سے ناک بند کئے بغیر گزرنا مشکل ہو گیا۔

پاکستان میں پہنچنے کے بعد پناہ گزینوں میں اموات کی رفتار تیز تر ہو گئی کیونکہ سفر کے مصائب جھیلنے کے باعث امراض کے مقابلے میں ان کی قوت مدافعت بہت کم ہو گئی تھی اور پاکستان میں ان کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔

دہلی کے ہزاروں مسلمان ان سب کیفیات کا تختہ مشق بن کر تلف ہوئے اور ہندوستان کے دیگر اقطاع سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے کے لئے وارد ہوئے۔

یہ مسلمان کروڑوں روپے کی جائیدادیں، املاک، اموال، اراضی، باغات، مویشی، سامان، گھر، عمارتیں اور کاروبار چھوڑ کر آئے اور پاکستان میں پہنچ کر تباہ حالی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

جان و مال کے اس اتلاف پر یہ مصیبت جھیلنی پڑی کہ بھائی سے بھائی بچھڑ گیا۔ اعزہ و اقرباء ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور جا پڑے۔ گاؤں کے لوگ جو پشتوں سے رنج و راحت کے شریک چلے آ رہے تھے، تتر بتر ہو گئے۔

ان تمام اتلافات اور نقصانات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل بلکہ امر محال ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ حزم و احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ:

قتل ہونے والوں کی تعداد.......... پانچ لاکھ

کیمپوں میں اور سفر کے مصائب سے مرنے والوں کی تعداد.......... پانچ لاکھ

پاکستان میں پہنچنے کے بعد دو ماہ کے اندر اندر مرنے والوں کی تعداد...... پانچ لاکھ

ان عورتوں بچوں اور مردں کی تعداد جو ہندو بنا لئے گئے.......... ایک لاکھ ہو گی۔

قصہ مختصر سولہ لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک مسلمان چھ ماہ کے قلیل عرصے میں ہلاک ہو گئے۔ باقی ماندہ کی خانہ بربادی اس پر مستزاد ہے۔ کل ایک کروڑ سے زائد مسلمان سارے ہندوستان سے اس قیامت صغریٰ کی لپیٹ میں آئے۔

ہندوستان سے مسلمانوں کے جبراً اخراج کا جو ردعمل مغربی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کے ہندوؤں اور سکھوں پر وارد ہوا۔ اس کے نتیجہ میں کوئی ساٹھ لاکھ سکھوں اور ہندوؤں کو ہندوستان جانا پڑا۔ ان میں سے بھی کافی تعداد سفر کے مصائب کا شکار ہوئی اور چند ہزار نفوس مغربی پنجاب میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔

ہمارے آقا و مولا مخبر صادق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت مسلمہ کی ذلت و نکبت کی علت ''حب المال وکراھیۃ الموت'' کے بلیغ الفاظ میں بیان فرمائی تھی۔ آج ہم اپنے اعمال و افعال اور اپنی حسیات و خواہشات کا جائزہ لیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ دور حاضر کا

مسلمان ''وھن'' کی اس بیماری میں بے طرح مبتلا ہو چکا ہے جسے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری ذلت وپستی کی علت قرار دیا تھا۔ حضرت ابوداؤدؓ سے روایت ہے:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ دنیا کی تمام قومیں تم سے لڑنے کے لئے جمع ہو جائیں گی اور ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے بھوکے ایک دوسرے کو کھانے کے لئے بلاتے ہیں۔'' ایک صحابی نے عرض کیا کہ ''کیا ہم اس وقت تعداد میں تھوڑے ہوں گے'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''نہیں تمہاری تعداد تو بہت ہوگی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے تیز سیل کے بہاؤ پر خس وخاشاک ہوتا ہے۔ دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکل جائے گی تمہارے دلوں میں ''وہن'' پیدا ہو جائے گی۔'' عرض کیا گیا ''وہن'' سے کیا مراد ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''حب الدنیا وکراھیۃ الموت'' یعنی مال کی محبت اور موت کا ڈر۔''

ہم نے دیکھا کہ مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے مسلمانوں کے اخراج کا منظر تیز سیل کے سامنے خس وخاشاک کے بہہ نکلنے کے منظر سے کم نہ تھا۔ اس کے ظاہری اسباب جیسا کہ بیان کئے جا چکے ہیں، یہ تھے کہ مسلمانوں کے لیڈر اور عوام دشمن کی ان عیاریوں اور تیاریوں سے یکسر غافل رہے جو مدت سے کی جا رہی تھیں انہوں نے اپنے مذہب کی حفاظت و مدافعت کے لئے کسی قسم کی تدبیر اور تیاری نہ کی۔ اس غفلت کی حقیقی علت یہ تھی کہ ہمارے خواص اور عوام اس دور میں ''حب المال وکراھیۃ الموت'' میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری جملہ سیاسی اور دینوی بلکہ ایک حد تک دینی سرگرمیوں کا محور یہی حب المال بن چکا ہے۔

(''اخراج اسلام از ہند'' مولانا مرتضٰی احمد خاں میکش)

دہلی:

ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام اور اخراج کی مہم ستمبر کے دوسرے ہفتے میں اختیار کی گئی۔ اس شہر میں جس کی خاک کا ذرہ ذرہ مسلمانوں کے شش صد سالہ دور حکمرانی کی سطوت وشوکت اور عدل وامن پر شاہد ودال ہے اڑھائی لاکھ مسلمان آباد تھے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمان تاراج کیے جا چکے تو دہلی کے مسلمانوں کی باری آ گئی۔

جناب محمد ابراہیم صاحب لکھتے ہیں:

5 ستمبر کو جمعہ کی نماز کے وقت ایک سکھ نے گڈوڈیہ مارکیٹ کی چھت پر سے ایک عدد بم فتح پوری مسجد کے صحن میں پھینکا جس کے پھٹنے سے دو مسلمان شہید اور چار زخمی ہوئے۔ اس حادثہ کے بعد شہر بھر میں 72 گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ تین دن کے بعد کرفیو کھلا تو شہر کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے قتل کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ سکھوں او راشٹریہ سیوک سنگھ والوں نے فوجی وردیاں پہن کر رات کے وقت مغلپورہ اور بستی پنجابیاں پر حملہ کیا۔ مسلمان مقابلے پر ڈٹ گئے۔ اس پر حملہ آوروں کی مدد کے لئے ہندوستانی حکومت کی اصلی ملٹری آ گئی جو جاٹ رجمنٹ اور گورکھا رجمنٹ پر مشتمل تھی۔ فوجیوں نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر مسلمانوں کو گولیوں اور سنگینوں سے ہلاک کیا۔ عورتوں او بچوں تک میں امتیاز روا نہ رکھا اور ان بستیوں کے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر پرانے قلعہ کے کیمپ میں چلے جائیں۔ جہاں دوسرے محلوں کے مسلمان پناہ گزین جمع ہو رہے تھے۔ مسلمان خواتین ننگے سر اور ننگے پاؤں پرانے قلعہ کی طرف چلنے پر مجبور کر دی گئیں۔ فوجی سپاہی گولیاں چلا رہے تھے۔ ہندو اور سکھ غنڈے منظم طریق سے مسلمانوں کو لوٹ رہے تھے اور خوبرو عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ باڑہ ہندو رائے کی طرف گیا، رات وہاں بسر کی۔ اگلے دن صبح کے وقت ملٹری نے اسے پھر تنگ کیا اور پرانا قلعہ کی طرف پاپیادہ جانے کے لئے مجبور کر دیا۔

قرول باغ پر حملہ ہوا وہاں بڑی شدت اور بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ قرول باغ میں کوئی دو ہزار مسلمان مرد عورت اور بچے کاٹ دیئے گئے۔ بچوں کے

ٹکڑے ٹکڑے کر کے عورتوں کی گود میں دے دیئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ یہ قربانی کا گوشت کھاؤ۔ عورتوں کے سر کے بال ان کی ٹانگوں سے باندھ کر انہیں چھت کے ساتھ لٹکا دیا گیا اور نیچے آگ جلادی۔ اس کے بعد پہاڑ گنج پر حملہ ہوا۔ جاٹ رجمنٹ کے سپاہیوں نے گھروں میں گھس کر ہلاکت برسائی اور مکانوں کو آگ لگادی۔ جو لوگ نکلے ان کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں کے زیور اتروا لئے گئے۔ بعض صورتوں میں تو عورتوں اور مردوں کے کپڑے تک اتروا کر انہیں مادر زاد برہنگی کے عالم میں پرانے قلعہ کی طرف روانہ کیا گیا۔

اس کے بعد ترمان دروازہ اور بندوق والی گلی پر حملہ ہوا۔ ہندو اور سکھ کوٹھوں پر چڑھ کر مسلمانوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ سڑک پر سکھ اور گورکھے فوجی مسلمانوں کو مار رہے تھے۔

بہادر گڑھ، نزیلہ پنجاب، کھڈرا، فرید آباد، شاہدرہ، سبزی منڈی، مہرولی وغیرہ پر شدید حملے ہوئے اور مسلمانوں کو تاراج کر کے انہیں گھروں سے اٹھادیا۔ ہفتہ 13 ستمبر کو نئی دہلی میں مسلمانوں پر آفت ٹوٹی۔ لودھی روڈ، کہناٹ پیلس، مایا روڈ، راجپوت روڈ، بابر روڈ، بیرن روڈ، ترکمان روڈ اور سرکلر روڈ پر مسلمانوں کے کوارٹر، مکان، دکانیں اور کوٹھیاں لوٹی گئیں۔ عورتوں کی عصمت ریزی کھلے بندوں کی گئی۔ یہاں بھی سفاکی اور درندگی کے بدترین مظاہرے کئے گئے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے جنینوں کو نیزوں پر لٹکایا اور کہا کہ پاکستان کا جھنڈا بن گیا۔ بچوں کے گوشت کے ٹکڑے ان کی ماؤں کے منہ میں ٹھونسے گئے۔ اگلے دن چاندنی چوک پر حملہ اور اور گھنٹہ گھر سے آگے مسلمانوں کی تمام دکانیں لوٹ لی گئیں۔ صرف کوچہ رحمان سے بلی ماراں تک مسلمانوں کی دکانیں بچی رہیں۔ بلی ماراں سے آگے اور کھاری باؤلی میں تمام دکانیں لوٹ لی گئیں۔ اللہ دیئے کے کڑے میں مسجد ڈھادی گئی۔ نیل کے کٹرہ کی دو مسجدیں مندروں میں تبدیل کر لی گئیں۔ پہاڑ گنج کی بڑی مسجد کو دھرم شالا بنایا۔ کوچہ استاد داغ جہاں میرا مکان تھا ہندو پولیس نے مسلمانوں کے مکانوں کی تلاشیاں لیں اور بچوں کو دیواروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ہلاک کیا۔ شہر کے اندر ہندوؤں اور سکھوں کے دو کیمپ تھے وہاں سکھ اور ہندو مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر لے جاتے تھے اور بکروں کی طرح ذبح کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کو خیمے کی میخوں سے باندھ کر اپنے بچوں سے کہتے تھے کہ ان پر تلوار چلاؤ یا ان کو نیزے سے مارو۔

......☆......

تقسیم کے دن، تقسیم کی راتیں

(تحریر: آغا امیر حسین)

آغا امیر حسین معروف صحافی، مصنف، سماجی رہنما اور ممتاز دانشور ہیں، آپ کا پورا نام سید آغا امیر حسین نقوی ہے۔ آپ شاہراہ قائداعظمؒ پر واقع اشاعتی ادارہ ''کلاسیک'' کے مالک اور پبلشرز ٹریڈرز سیل پنجاب کے کنوینر ہیں۔ مختلف موضوعات پر آپ کے مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف اور ماہنامہ ''سپوتنک'' کے مالک و مدیر اعلیٰ ہیں۔ آپ اپنے بچپن کے واقعات یوں بیان کرتے ہیں۔

''میں 1933ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول دہلی سے حاصل کی۔ ہم محلہ عزیز گنج میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی اور ہندو، سکھوں کی آبادی میں واضح فرق ہوتا تھا۔ یعنی محلہ عزیز گنج میں سبھی مکان مسلمانوں کے تھے۔''

''جس وقت ہوش سنبھالا، اپنے اردگرد ایک ہی شور تھا۔ آزادی، آزادی، آزادی...... ان دنوں پورے برصغیر میں سیاسی وغیر سیاسی، مذہبی وغیر مذہبی، پڑھے لکھے اور ان پڑھ...... سب کا یہی موضوع تھا۔ ہندو جے ہند، جے ہند کے نعرے لگاتے تھے تو مسلمان بن کے رہے گا پاکستان، لے کے رہیں گے پاکستان...... ہندو اس کے جواب میں جے ماتا کی اور اکھنڈ بھارت کی حمایت میں نعرہ زنی کرتے۔ مسلمان اللہ اکبر اور نعرۂ حیدری

بلند کرتے۔"

"میں ابھی دس برس کا تھا لیکن ہندو اور مسلمان کی تقسیم بری طرح محسوس کرتا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ تھے۔ عموماً حالات کشیدہ ہو جاتے اور ایک دوسرے سے دست و گریبان بھی ہو جاتے۔ چاقو گھونپنے کی وارداتیں ایک معمول تھیں۔ ہم لوگ دلی میں رہتے تھے۔ دلی جیسے بڑے شہر میں سوائے نئی دہلی کے، باقی سارے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی الگ الگ اور زیادہ تر آمنے سامنے تھیں۔ میں 1946ء کے دنوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشیدگی عروج پر تھی۔ شہر کی مختلف گلیوں اور محلوں میں حملوں کے خوف اور اچانک حملوں سے بچاؤ کے لئے جنگلے لگ چکے تھے۔ اس داخلی کشیدگی اور ایک دوسرے سے نفرت کے باوجود مشترکہ دشمن یعنی انگریز کے خلاف سب ایک تھے۔

ایک روز چاندی چوک کے قریب مسجد فتح پوری سے پہاڑ گنج کی طرف جانے والی سڑک پر ایک اجتماعی جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ میں بھی اس جلوس میں شامل تھا۔ آنسو گیس کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک ہندو گھرانے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک خاتون میری دیکھ بھال کر رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کسی کو آواز دی اور مجھے پینے کے لئے پانی دیا۔ میں بہت حیران ہوا۔ دراصل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کے رویہ میں نہایت شدت اور زبردست تعصب پایا جاتا تھا اور ابھی چند روز پہلے مجھے اس کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔"

"میرے والد صاحب نے مجھے سکول کی چھٹیوں کے دوران ایک ہندو الیکٹریشن لکشمن کے پاس بجلی کا کام سیکھنے کے لئے اس کی شاگردی میں دیا ہوا تھا۔ اس کی دکان ہمارے محلہ کے سامنے اور باڑہ ہندو راؤ کے قریب ایک ہندو محلہ میں تھی۔ کام سیکھنے کا جنون مجھے ذاتی طور پر تھا۔ ان دنوں کام زیادہ تھا چنانچہ میرا زیادہ وقت وہاں "آرمیچر وائنڈنگ" میں گزرتا تھا، کھانا گھر سے آجاتا تھا۔ ایک روز کھانا کھانے کے بعد میں نے ہڈیاں دکان کے باہر سڑک پر پھینک دیں۔ کچھ دیر بعد ایک شخص دکان میں آیا اور اس نے

لکشمن کے کان میں کچھ کہا۔ ہڑ بڑا کر اٹھا اور مجھے اپنے ساتھ بلڈنگ کے اندر آنے کو کہا۔ بلڈنگ کے اندر صحن میں بنے کنویں میں اترے ہوئے اس نے مجھے بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا کہ اس کنویں میں لگی موٹر خراب ہوگئی ہے اور اسے اتارنا یا وہیں ٹھیک کرنا ہے۔ پانی کی سطح سے ذرا اوپر ایک بڑا سا طاق بنا تھا۔ اسی میں موٹر لگی ہوئی تھی۔ کچھ جگہ خالی بھی تھی۔ لکشمن نے مجھے کہا یہاں طاق میں خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور کوئی آواز نہ نکالنا جب تک میں نہ آؤں باہر نہ نکلنا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ میں حیران پریشان موٹر کے ساتھ دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔"

"تھوڑی دیر بعد زبردست نعرے بازی کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ نعرے تو میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن موسلے کو نکالو، زندہ نہیں چھوڑیں گے جیسی باتیں البتہ سمجھ میں آرہی تھیں۔ لکشمن کی تو تکار اور بحث کی آوازیں بھی آرہی تھی۔ مجھے اس بات کا اندازہ تو ہوگیا کہ یہ شور شرابہ میری وجہ سے ہے لیکن کیوں ہے؟ اس کا اندازہ نہیں ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد خاموشی چھاگئی۔ دو تین گھنٹے بعد جب میں خوف اور تھکن سے نڈھال غنودگی کی حالت میں تھا تو لکشمن کنویں میں آیا اور مجھے واپس اوپر لے گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ مجھے ہمارے محلے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔ میں دوڑ کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ میرے والد اور دوسرے لوگوں نے مجھ سے تفصیلات جاننا چاہیں لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ میں نے ہڈیاں سڑک پر پھینکی تھیں جس پر علاقے کے ہندو مشتعل ہوگئے تھے۔ اس واقعہ نے پورے علاقے میں کشیدگی پھیلادی تھی۔"

"لیکن اس زمانے میں ہندو پانی، مسلم پانی، ہندو ہوٹل، مسلمان ہوٹل، ہندو حجام، مسلمان حجام کی تقسیم پورے ملک میں پائی جاتی تھی۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان تعصبات سے بالاتر ہوکر زندگی گزار رہے تھے۔ میں ہوش سنبھال رہا تھا۔ شعور کی آنکھ کھل رہی تھی، اپنے ماحول اور شہر کی فضا کو سمجھنے لگا تھا۔ اسی تقسیم کی کوکھ سے پاکستان کے مطالبہ نے جنم لیا تھا اور یہی تقسیم اور تعصب بعد میں بہت بڑے خون خرابے اور انتقال آبادی کا سبب بنی تھی۔ لاکھوں انسان اس تعصب "درندگی کا شکار ہوئے اور برصغیر کا جسم اور روح ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے زخمی ہو گئے۔"

"آج 70 سال بعد بھی جب مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے تو دلی کی تلخ ترش اور شیریں دونوں طرح کی یادیں مجھے اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ ہندو اکثریت کا تنگ نظر اور متعصبانہ رویہ مجھے آج بھی بدمزہ کر دیتا ہے۔ گزشتہ پون صدی میں مجھے تین چار بار "بھارت یاترا" کا موقع ملا ہے۔ مجھے ہر دفعہ یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ سیکولرازم کے داعی اور جمہوریت کے علمبردار بھارت میں ہر دفعہ پہلے سے زیادہ غربت اور پہلے سے زیادہ نفرت دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ نفرت اور تعصب صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عیسائیوں، سکھوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے لئے بھی پوری شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اصل نشانہ مسلمان ہیں جن کا تشخص مٹانے کی کوشش میں نت نئی راہیں نکالی جاتی ہیں۔ روزگار کا حصول ان کے لئے عذاب بن چکا ہے۔ وہ تمام آبادیاں جن میں مسلمان رہتے ہیں۔ ان کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ پسماندہ ترین علاقے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے تعلیم، صحت اور ترقی کے دروازے بند ہیں۔ ان کا جرم سیکولر بھارت میں مسلمان ہونا ہے۔ آج بھی فسادات ہوتے ہیں اور فرق یہ پڑا ہے کہ اب یہ زیادہ منظم ہوتے ہیں اور مسلح بلوائیوں کی پشت پناہی پولیس اور پیراملٹری فورسز کرتی ہیں۔ مرتے بھی مسلمان ہیں اور گرفتاریاں بھی مسلمانوں کی ہوتی ہیں۔ میں جون 04ء میں بھارتی پنجاب اور دہلی میں چند روز گزار کر آیا ہوں۔ مجھے بے شمار مسلمان نوجوانوں نے بتایا کہ ان کے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ یا تو وہ ہندو بن جائیں یا پھر اپنے تشخص اور اپنی بقاء کے لئے منظم تحریک چلائیں جیسے کہ کشمیر میں چل رہی ہے۔ 70 سال بعد بھی برصغیر آگ اور خون کی لپیٹ میں ہے۔ اب تلواروں، خنجروں، بموں اور دیسی بندوقوں کے ساتھ ساتھ جدید اسلحہ بھی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ احمد آباد اور گجرات کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے قتل عام اور نسل کشی کا منظر ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ پورے بھارت میں مسلمانوں پہ ٹوٹ پڑنے کے لئے ہندو انتہا پسند تنظیمیں ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد چونکہ پاکستان نے بھی اپنے ایٹمی طاقت ہونے کا ثبوت دے دیا ہے چنانچہ برصغیر میں بھارت کی ایٹمی بالادستی

قائم نہ ہونے کا غصہ بھی بھارت کے مسلمانوں پہ نکالا جا رہا ہے مسلمان مارا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اور اظہار حال ہی میں سرکاری سطح پر ہوا ہے۔"

"عراق میں بھارتی باشندے اغواء ہوئے اور بھارت سرکاری نے قطر میں اپنے مسلمان سفیر کو ان مغویوں کی بازیابی کے لئے بغداد بھجوایا تو برسر اقتدار کانگریس کے رہنماؤں نے ملک بھر سے اپیل کہ کہ مسلمان شہریوں سے کوئی ناروا سلوک نہ کیا جائے تا کہ عراق میں مغویوں کی بازیابی میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔ یہ سیکولر بھارت میں مسلمان شہریوں کے ہر وقت خطرے کی حالت میں رہنے کا برملا اعتراف ہے۔ سرکاری وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ پہ "ہندووتا" (ہندو، ہندی اور ہندوستان) کی بات پورے زور وشور سے کی جاتی ہے۔ گویا اس ملک میں اگر کسی کو رہنا ہے تو صرف ہندو بن کر رہ سکتا ہے۔ یہ بال ٹھاکرے ذہنیت اکھنڈ بھارت کے نعرے کے ساتھ پہلے بھی تقسیم کا سبب بنی تھی اور اب پھر بھارتی سماج کی دراڑیں گہری کر رہی ہے۔"

"گزشتہ 70 سالوں میں بھارت کی ہر حکومت نے پاکستان دشمنی کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ سرینگر سے لے کر راس کماری تک کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے اس کا الزام پاکستان کو دیا جاتا ہے۔ پاکستان کو اپنا باجگوار بنانے کے لئے بھارت نے طاقت کی زبان استعمال کی تو جواب میں پاکستان بھی ایٹمی طاقت بن گیا۔ اپنے قیام کے ساتھ ہی پاکستان داخلی اور خارجی خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ بھارت نے برصغیر کی تقسیم کو صدق دل سے قبول نہیں کیا تھا چنانچہ پاکستان کی قیادت جائز طور پر ان خدشات میں مبتلا رہی کہ بھارت، پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ پاکستان نے بھارت کے کسی ممکنہ فوجی حملے کا مقابلہ کرنے اور خطے میں طاقت کا توازن درست رکھنے کے لئے خود کو عسکری اعتبار سے طاقتور بنانے کا فیصلہ کیا اور بھارت کی مسلط کردہ وہ تین جنگوں کے بعد آخری حل کے طور پر خود کو ایٹمی طاقت بنا لیا۔ بھارت اگر طاقت کے زعم میں مبتلا رہے گا، خودسری اور برتری کے نشہ میں مخمور رہے گا اور ماضی کی طرح زور زبردستی سے اپنی بات منوانا چاہے گا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا اور اس کی ذمہ دار بھارت کی ہٹ دھرمی اور حق وانصاف

سے بے نیازی ہوگی۔"

"میں جب ہندو قیادت کا آج کا رویہ دیکھتا ہوں تو مجھے 47-1946ء کا ہندوستان یاد آجاتا ہے جس میں پاکستان کا ذکر سن کر ہندو مہاسبھائیوں کی آنکھوں سے شعلے اور زبانوں سے لفظوں کے کوڑے برسنے لگتے تھے۔"

"میرے والد ریلوے میل سروس (پوسٹ آفس) میں ملازم تھے اور ان دنوں دلی لاہور جایا کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ ضد کر کے لاہور کی سیر کرنے کے لئے چلا آیا۔ سکول کی چھٹیاں تھیں۔ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ دلی شہر میں بھی فضا کشیدہ تھی۔ کسی وقت بھی فساد پھوٹنے کا امکان تھا چنانچہ میرے والد نے مجھے ساتھ لانے میں کسی رد و کد کا اظہار نہ کیا۔ لاہور میں والد صاحب نے آر ایم ایس کے ریسٹ ہاؤس قلعہ گوجر سنگھ میں قیام رکھا۔ یہ سفر ان کی آخری ٹرین سروس ثابت ہوا۔ انہیں حکام نے لاہور میں روک لیا اور وہ لاہور اسٹیشن کے باہر بنے ریلوے پوسٹ آفس میں کام کرنے لگے۔

اچانک پورا پنجاب اور دہلی وغیرہ فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والی ٹرینوں پر حملے ہونے لگے جو ٹرین بھی لاہور پہنچتی وہ خون میں لت پت ہوتی۔ ان خون آلود ٹرینوں کی آمد نے بھی لاہور کو لہولہان کر دیا۔ کرفیو، فائرنگ، چھرا گھونپنے کی وارداتیں بڑھنے لگیں۔ لاہور میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادیاں آمنے سامنے یا پھر کمیونٹی کے اعتبار سے تھیں۔ ہندو آبادیوں میں مسلمان اور مسلمان آبادیوں میں ہندو نہیں رہتے تھے۔ اندرون شہر شاہ عالمی ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ اسی طرح شہر کے باہر کرشن نگر، سنت نگر، گوال منڈی، برانڈرتھ روڈ، نسبت روڈ اور چیمبر لین روڈ ہندوؤں کی آبادیاں تھیں۔ مال روڈ اور انارکلی جیسے تجارتی مراکز بھی ہندوؤں کی گرفت میں تھے۔

لاہور میں مسلمانوں کے تباہ حال قافلے اترنا شروع ہوئے تو لاہور کے ہندو چوکنا ہو گئے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مذکورہ علاقوں سے انخلاء شروع کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پہ سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کی خبروں نے لاہور کا پارہ چڑھا دیا۔

زبردست فائرنگ اور نعرہ زن جلوسوں میں کرفیو بے معنی ہو کر رہ گیا۔ لاہور میں پولیس اور فوج میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی اس لئے غیر مسلموں کیا زیادہ جانی نقصان نہ ہوا۔ صرف وہ لوگ کام آئے جو اپنے مال و متاع، گھر بار چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ شاہ عالمی پہ حملے اور آگ نے لاہور سے ہندوؤں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ وہ پولیس اور گورکھا ڈوگرا رجمنٹوں کی حفاظت میں پہلے کیمپوں میں اور پھر وہاں سے قافلوں کی صورت میں نقل مکانی کر گئے۔

واہگہ چونکہ قریب تھا، اس لئے یہاں سے جانے والے قافلوں کو حملوں کا زیادہ خطرہ نہیں تھا جبکہ مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ سے آنے والوں کو طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ راستے میں حملہ آوروں کے جتھے ہندو فوج اور پولیس کی سرپرستی میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کر رہے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہندوؤں کے برعکس بہت زیادہ تھا۔ چالیس ہزار سے زیادہ مسلمان عورتیں چھین لی گئیں۔ یہ ایک ایسا گھاؤ تھا جو زندہ بچ کر آنے والوں کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ انتقام انتقام کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ مسلمانوں کی آتش انتقام کو ہوا دے رہی تھی۔ شہر پر بربریت راج کر رہی تھی۔

قلعہ گوجر سنگھ سے نکلسن روڈ پہ چلتا ہوا میں روزانہ ریلوے اسٹیشن جایا کرتا تھا۔ لاہور سٹیشن پر پہنچنے والی گاڑیاں روزانہ وحشت و بربریت کی نئی کہانیاں لے کر آتیں۔ ایک روز میں نکلسن روڈ کے فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا کہ تیز رفتاری سے ایک فوجی ٹرک میکلوڈ روڈ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا، اس فوجی ٹرک میں عجیب منظر تھا۔ دو فوجی جوانوں نے اپنے ساتھیوں پر بندوقیں تان رکھی تھیں۔ یہ جوان بلوچ رجمنٹ کے تھے۔ پیچھے کسی مقام پر ہندو ساتھیوں کی طرفداری کے جرم میں گن پوائنٹ پر ہیڈ کوارٹر لے جایا جا رہا تھا۔ لاہور میں یہ شکایت عام تھی کہ ہندو، سکھ اور گورکھا سپاہی جانبداری برتتے اور مقامی ہندوؤں کی حمایت میں بے دریغ گولی چلا دیتے ہیں۔ میں ابھی اس منظر میں گم اپنے خیال میں چلا جا رہا تھا کہ سڑک پار سے ایک گلی کے لوہے کے گیٹ پر کھڑے گورکھا سپاہی نے مجھ پر گولی چلا دی۔ میں یہ سمجھنے سے آج تک قاصر ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں

تھا اور پھر میری عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں کسی ناپسندیدہ سرگرمی میں ملوث ہوتا۔ مجھ سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا اور پھر میں ان سے کافی فاصلہ پر سڑک کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر جا رہا تھا، گلیاں خالی تھیں۔ مکین یا تو چلے گئے تھے یا پھر اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھے تھے۔ گولی میرے پاؤں کے قریب فٹ پاتھ سے ٹکرائی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ میں تیز تیز قدموں سے سٹیشن پر جا پہنچا۔

اسٹیشن پہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں ابھی آر ایم ایس کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس میں کچھ ٹرنک اور ایک بزرگ، ان کی بیوی، دو بیٹے اور ایک جوان بیٹی پر مشتمل ہندو خاندان تھا۔ ابھی وہ تانگے سے اچھی طرح اترنے بھی نہ پائے تھے کہ میرے دیکھتے دیکھتے چند لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ بڑھے بڑھیا کی چیخ و پکار کسی کام نہ آئی۔ ایک بیٹا تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کے پیچھے چند نوجوان تھے۔ وہ گرا تو ان وحشیوں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کا سر کچل دیا۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے چند فٹ کے فاصلہ پر ہوا۔ میں سکتہ کی حالت میں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ یہ 13 اگست کا دن تھا۔ اس کے بعد جو مار دھاڑ شروع ہوئی تو پورے اسٹیشن کے باہر لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایک فوجی ٹرک آیا۔ اس کے لئے گزرنے کا راستہ نہ تھا۔ وہ فسادیوں پر فائرنگ کرتا ہوا لاشوں کے اوپر سے گزر گیا۔ خدا خدا کر کے جب یہ فساد تھما اور میں اسٹیشن کے اندر گیا تو وجہ معلوم ہوئی۔ لوگ ہندوستان سے آنے والی ٹرینوں سے اپنے عزیزوں کو لینے کے لئے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے لیکن وہاں جو دو ٹرینیں اب تک پہنچی تھیں وہ خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ڈرائیوروں کے علاوہ ان میں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ دونوں ٹرینوں کے ڈرائیور بھی زخمی تھے۔ ان ٹرینوں میں سوار سب کے سب مسافر ہندو اور سکھ بلوائیوں نے قتل کر دیئے تھے۔ ٹرینوں کا یہ حال دیکھ کر اسٹیشن پر آنے والے لوگ غم و غصہ میں آگ بگولہ ہو گئے اور پھر اسٹیشن پر قیامت برپا ہو گئی تھی۔

میں بھی روزانہ اسٹیشن پر اسی توقع میں جاتا تھا کہ شاید آج دلی سے آنے والی کسی ٹرین میں میرے بہن بھائی اور دیگر عزیز آ جائیں۔ میں ہندوستان سے آنے والی ہر ٹرین کو

کھنگال ڈالتا کہ شاید کوئی اپنا چہرہ نظر آجائے لیکن خون میں ڈوبی لاشوں اور زخمی انسانوں کو دیکھ دیکھ کر مایوسی کے ساتھ شام کو گھر چلا جاتا۔ پھر ان مناظر نے مجھے حوصلہ دیا۔ میں ڈبوں میں چڑھا جاتا۔ زخمیوں کو باہر لانے میں مدد دیتا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ٹائلٹ میں لوگ زخمی اور مردہ حالت میں ہوتے ہیں۔ میں ایک ایک بوگی کے ٹائلٹ تک پہنچتا وہاں موجود زخمیوں کو باہر نکلنے میں مدد دیتا یا رضا کاروں کو بلا کر ان کی مدد کرتا۔ تھک کر چور ہو جاتا تھا۔ کھانے پینے کو اس ماحول میں کیا جی چاہتا۔ زخمیوں اور لاشوں کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں پتھرا جاتیں۔

کئی روز تک یہی معمول جاری رہا۔ ہندوستان سے آنے والی ٹرینوں میں لاشیں ڈھونڈتے اور رضا کاروں کے ساتھ مل کر انہیں پلیٹ فارم پر لانے میں دن گزر جاتا۔ دن میں کئی ٹرینیں آتی تھیں۔ شام ہو جاتی تو قلعہ گوجر سنگھ کے ہوسٹل میں آجاتا۔ پریشانی، انتظار اور شدت غم کے باوجود تھکن کی وجہ سے بہر حال نیند آجاتی۔ عام حالات میں بھی گھر والوں سے اتنے دن دور رہنا مشکل ہوتا ہے لیکن اب تو صورتحال بھی غیر یقینی اور اذیت ناک تھی۔ پھر اسی آس میں اسٹیشن کا رخ کرتا کہ شاید آج اپنے گھر والے آجائیں۔ میں تو سیر و تفریح کے لئے دلی سے لاہور آیا تھا لیکن لاہور میرے لئے ایک ایسا زنداں بن جائے گا جس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوگا یہ بات میرے تصور میں بھی نہیں تھی۔ والد صاحب روزانہ تسلی دیتے کہ کل گھر والے آجائیں گے یا ان سے رابطہ ہو جائے گا اور میں اگلی صبح کے انتظار میں بستر پر دراز ہو جاتا اور اگلے دن اسٹیشن پر پہنچ جاتا۔

اسٹیشنوں پر سامان بوگیوں تک لانے لے جانے کے لئے ٹھیلے اور ٹرالیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں ان کے پہیے لوہے کے ہوا کرتے تھے۔ آج کل ربڑ کے ٹائر ہوتے ہیں۔ ان ٹھیلوں میں سامان کی طرح ایک دوسرے کے اوپر لاشیں لوڈ کر دی جاتیں۔ پھر انہیں اسٹیشن سے باہر لا کر وہاں کھڑے گڈوں پر لاد دیا جاتا اور یہ گڈا ان لاشوں کو اجتماعی قبروں میں تدفین کے لئے جاتے۔ باقاعدہ تدفین و تکفین بھی قسمت والوں کو ملتی ہے۔ 1947ء کا اگست میرے لئے ایک بھیانک خواب ہے جو اب بھی مجھے بعض اوقات نیند سے جگا دیتا

ہے۔آج بھی خواب میں زخمیوں کی آہ و بکا اور لاشوں سے بھرے ٹھیلوں کی چنگھاڑیں سنتا سنتا ہڑبڑا کر بیدار ہو جاتا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن پر وہ ٹرالر جن سے میں نعشیں نکالا کرتا تھا، آج بھی موجود ہیں۔ جب کبھی ریلوے اسٹیشن جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ان ٹرالرز کو دیکھ کر 47ء کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ایک روز میں حسب معمول آنے والی ٹرین کے انتظار میں آر ایم ایس کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک ٹرین پشاور کی طرف سے آئی جس پر ریلوے اسٹیشن کے اندر حملہ ہو گیا۔ ادھر سے آنے والی ٹرینوں کو کرفیو لگا کر کھڑا کیا جاتا تھا لیکن افراتفری اور نفسانفسی کے اس دور میں انسانی قوانین اور انسانیت سب دم توڑ چکے تھے۔ ٹرین آئی تو درندگی کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اس ٹرین میں سے سب کچھ سکھ مسافر جان بچا کر اس طرف دوڑے چلے آرہے تھے جہاں میں کھڑا تھا۔ اچانک پولیس نے گولی چلادی۔ 3Not3 کی گولی ایک سکھ کی پشت پر لگی اور سینہ پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ یہ بدقسمت سکھ میرے پیروں کے قریب آکر گرا۔ سینے میں چھ انچ کا گھاؤ تھا۔ لمحے بھر میں اس کی جان نکل گئی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پاؤں جیسے زمین گڑ گئے تھے۔ یہ روح فرسا منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تھوڑی دیر بعد لاشیں ڈھونے کا عمل شروع ہو گیا۔ دہلی سے آنے والی ٹرینوں میں سے لاشیں نکال کر اب دہلی جانے والی ٹرینوں میں لاشیں لادی جانے لگیں۔ گویا جواب آں غزل کے طور پر ایک نیا معمول شروع ہو گیا۔

اب میں وقفے وقفے سے اپنے بہن بھائیوں کے لئے رہنے کا ٹھکانہ ڈھونڈنے کا فریضہ بھی سرانجام دے رہا تھا۔ یہ فریضہ میں نے ازخود سنبھال لیا تھا۔ والد صاحب کو اس کی خبر نہیں تھی۔ دراصل بابائے قوم قائداعظمؒ اپنی تقریر میں کہہ چکے تھے کہ مہاجرین کو جو خالی مکان نظر آئے وہ اس کا تالہ کھولیں اور اس میں رہنا شروع کردیں۔

بھارت سے لاکھوں مہاجرین کا سیلاب امڈا چلا آرہا تھا۔ اس کو جذب کرنے کا حکومت کے پاس یہی ایک طریقہ تھا۔ حکومت نے آنے والے مہاجرین کے لئے جو کیمپ بنائے تھے ان میں والٹن کیمپ وسیع و عریض تھا لیکن وہ بھی ناکافی ثابت ہو رہا تھا۔ اسی وجہ

سے قائداعظمؒ نے بھارت کو نقل مکانی کر جانے والے لوگوں کے خالی مکانات مہاجرین کے تصرف میں لانے کا حکم دیا تھا۔ ایک روز میں نے نکلسن روڈ پر جہاں سے میں روزانہ ریلوے اسٹیشن آتا جاتا تھا۔ ایک دو منزلہ خالی مکان دیکھا۔ مجھے اچھا لگا۔ میں تالہ توڑ کر اس پر قابض ہو گیا اور والد صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ انہوں نے اسی سڑک پر سے گزرنا تھا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب وہ مجھے نظر آئے۔ میں نے دوڑ کر ان کا راستہ روکا اور بتایا کہ میں نے ایک بہت اچھے مکان پر قبضہ کر لیا ہے۔ آئیں آپ بھی اسے دیکھ لیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری ابھری اور انہوں نے پوچھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟

میں نے قائداعظمؒ کی تقریر کا حوالہ دیا۔ والد صاحب غصہ میں آگ بگولا ہو گئے اور ایک زبردست تھپڑ رسید کرتے ہوئے انہوں نے مجھے ہے۔ ''ہم مہاجر ہوئے ہیں لٹیرے نہیں بنے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ملک دیا ہے ہم اسے کچھ دیں گے، لیں گے نہیں۔ اسے ترقی دینا ہے۔ ہمیشہ اس کے لئے کام کرنا ہے اس سے کچھ لینا نہیں ہے۔''

میں نے بہت اصرار کیا کہ یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں۔ قائداعظمؒ نے اس بات کی اجازت دی ہے۔ مہاجرین بہت زیادہ ہیں۔ جب والدہ اور بہن بھائی آئیں گے تو پھر کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنے میں مشکل ہو گی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی انتظام کر لینا چاہئے مگر والد صاحب مان ہی نہیں رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کسی کے مال پر قبضہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سب کی قسمت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ محنت کر و حق حلال کی کمائی سے کھانے پینے اور چار دیواری حاصل کرنے کی عادت ڈالو۔ چنانچہ مجھے اس مکان سے دستبردار ہونا پڑا۔ اگست کا پورا مہینہ گھر والوں کے انتظار میں گزر گیا۔ دہلی سے آنے والے کچھ لوگوں سے پتہ چلا کہ وہ دہلی کے پرانے قلعہ والے کیمپ میں ہیں۔ ان کی سر توڑ کوشش کے باوجود انہیں پاکستان آنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔

ستمبر 47ء میں راستے نسبتاً محفوظ ہو گئے تو وہ لوگ لاہور پہنچے۔ اب مکان کی

تلاش شروع ہوئی۔ کرائے کے مکان کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ خالی مکانات بھر چکے تھے۔ امرتسر اور گردونواح کے لوگوں نے گوالمنڈی اور نسبت روڈ پر قبضہ جمالیا تھا۔ صاحب حیثیت لوگوں نے ماڈل ٹاؤن فتح کرلیا تھا۔ یوں ہر علاقے میں مقامی یا مہاجر جس کو موقع ملا اس نے کوئی نہ کوئی عمارت اپنے قبضہ میں لے لی اور پھر جب محکمہ ''بحالیات'' قائم ہوا تو تمام قبضے الاٹ منٹوں کے ذریعے باضابطہ کردیئے گئے۔ ہمارے والد بھی بالآخر کوئی مکان الاٹ کروانے پر راضی ہو گئے اور انہیں شاہ عالمی میں وچھووالی گلی میں ایک پرانا مکان الاٹ ہو گیا جب اس دومنزلہ مکان میں پہنچے تو اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت زمین بوس ہو جائے۔ بہرحال سر چھپانے کو چھت مل گئی تھی، سو رہنا شروع کردیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

......☆......

لہو جو ہم بہا کر آئے

راوی: سید سعید احمد اختر (مرحوم)
تحریر: عنایت اللہ (مرحوم)

بچھتر سنگھ ایک پرانا اور جہاندیدہ انسان تھا۔ اس نے بتایا کہ 1947ء میں وہ اعلیٰ سطح کی میٹنگوں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ وہ اور ست نام سنگھ ایک ایسی میٹنگ میں شریک ہوئے تھے جس میں مہاراجہ پٹیالہ، وزیر خارجہ سردار ولبھ بھائی پٹیل، وزیر دفاع بلدیو سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ بھی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں شیطان کے چیلے ولبھ بھائی پٹیل نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ پیش کیا تھا یہ بھی بتایا تھا کہ اس منصوبے کو مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی پوری پوری تائید اور حمایت حاصل ہے۔ منصوبے کی رو سے مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں خاص کر پٹیالہ کی سکھ ریاست کی فوج اور پولیس کو اہم کردار ادا کرنا تھا اور یہ اسی منظم منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں دس لاکھ مسلمان شہید ہوئے اور ستر لاکھ کے قریب مسلمان پاکستان میں دھکیل دیئے گئے۔

جنگی وقائع نگار کی حیثیت سے پاکستان کی صحافتی تاریخ میں جناب عنایت اللہ مرحوم کا کوئی ثانی نہیں۔ انہوں نے 1965ء کی بھارتی جارحیت اور پاکستان کی مسلح افواج کی داد شجاعت اور دفاع وطن کے چپہ چپہ کے لئے لڑی جانے والی جنگ کی جو تاریخ قلمبند کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف و مرتب پر وہ خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ ذیل کی کہانی اختصار کے ساتھ مرحوم کی کتاب ''لہو جو ہم بہا آئے'' سے لی گئی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے جتنا لہو بہایا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی قوم نے آزادی کے لئے اتنی بڑی قیمت ادا کی ہو۔ پاکستان ایک بڑی ہی طویل داستان خونچکاں کا عنوان ہے، ایسی داستان جسے سننے سنانے لگو تو انسانیت کا وجود کانپ اٹھتا ہے، تہذیب شرما کے منہ چھپانے لگتی ہے۔

پاکستان شہیدوں کا تحفہ ہے۔ پاکستان ان معصوم بچوں کا تحفہ ہے جنہیں ہندو سکھ بلوائیوں نے نیزوں میں پرو کر قہقہے لگائے تھے۔ پاکستان ہماری ان ایک لاکھ سے زیادہ بیٹیوں کا تحفہ ہے جن کی عصمت اس آزادی کی بھینٹ چڑھ گئی جس کے مزے آج ہم لے رہے ہیں۔ پاکستان ان ماؤں کا تحفہ ہے جن کے پیٹ ہندوؤں سکھوں نے چاک کر کے بچے نکال کر مار ڈالے۔ پاکستان تحفہ ہے ان قافلوں کا جو پاپیادہ پاکستان پہنچے اور راستے میں اپنے پیاروں کی لاشیں بکھیرتے اور لہو بہاتے آئے۔

اس کہانی کو ناول یا افسانہ نہ سمجھیں، یہ حصول پاکستان کے لئے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرنے والوں کی سچی اور دلگداز داستان ہے۔ اس داستان کے راوی محترم سید سعید اختر مرحوم نے اپنا بچپن اور نوجوانی کا دور ایک سکھ ریاست پٹیالہ کے ایک چھوٹے سے قصبے دوراہا میں گزارا جو لدھیانہ کے قریب ہے۔

یہ وہ دور تھا جب مسلمان اور سکھ باہمی پیار و محبت سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ پھر پاکستان کے حصول کی تحریک چلی۔ 1947ء میں یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ ہندوستان کے در و دیوار ایک ہی نعرے سے گونجنے لگے۔ "لے کر رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان" اس کے ساتھ ہی خونی فسادات شروع ہو گئے۔ مذہبی منافرت کی باد سموم نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ممبئی، کلکتہ، بہار میں ہونے والے خونی فسادات کے چھینٹے مشرقی پنجاب کی سرزمین پر گرنے لگے۔ وہی سکھ جو مسلمانوں کے ساتھ شیر و شکر کی طرح رہتے تھے، وہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے اور محترم سید سعید اختر اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

وہ کہتے ہیں میرے والد ایک سکھ ریاست پٹیالہ کی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدے پر

فائز تھے اور جس وقت کی یہ کہانی لکھی جا رہی ہے، وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں ریاست کے ایک چھوٹے سے قصبے دوراہا میں تعینات تھے جو لدھیانہ کے قریب ہے۔ ان کی انتظامی عملداری میں دوراہا اور اردگرد کے دیہات بھی شامل تھے۔ والد صاحب نے اپنی رہائش کے لئے دوراہا سے تین میل کے فاصلہ پر سرہند نہر کے کنارے ایک گاؤں رام پور کو منتخب کیا تھا۔ یہ نہر روپڑ کے مقام پر بھاکڑہ ننگل ڈیم سے جو دریائے ستلج پر واقع ہے، نکلتی ہے۔ اس جگہ کو رہائش کے لئے اس لئے منتخب کیا تھا کہ میرے والد سیر اور شکار کے بہت دلدادہ تھے۔ یہ جگہ انتہائی سرسبز، باغات اور جنگلات سے بھری پڑی تھی۔ یہاں پر ہرن، مور، مرغابی اور نیل گائے کا شکار کثرت سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ سرہند نہر جو ہندوستان میں دوسری بڑی نہر ہے۔ اس میں مہاشیر مچھلی کا شکار بھی بکثرت ملتا ہے۔

فسادات شروع ہونے پر ہم اپنے آبائی گھر پٹیالہ پہنچ گئے۔ یہ ریاست کا سب سے بڑا اور مرکزی شہر ہے۔ شہر میں داخل ہونے کے لئے پانچ چھ دروازے ہیں جو مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ ہم جس علاقے میں رہتے تھے۔ یہ شیرانوالہ گیٹ کا علاقہ کہلاتا تھا۔

یہ تقریباً پانچ لاکھ کی آبادی کا کافی بڑا شہر ہے۔ گو ہندو مسلم کشیدگی انتہا کو پہنچ رہی تھی لیکن ابھی شہر کے حالات ٹھیک تھے۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی لیکن شہر میں ایک عجیب و غریب عنصر نظر آرہا تھا۔ یہ صوبہ سرحد سے قبل از وقت ہجرت کر کے آنے والے سکھ ریفیوجی تھے جو پورے شہر میں گھومتے پھرتے تھے۔ ان کا لباس شلوار قمیض پٹھانوں جیسا تھا۔ پٹھانوں کے لہجے میں اردو بولتے تھے۔ پنجابی ان کو بہت کم آتی تھی۔ مسلمانوں سے سخت نفرت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اکثر ریڑھیوں پر اور پھیری لگا کر سودا سلف فروخت کرتے تھے۔ اسی طبقے نے آگے چل کر شہر کے مسلمانوں کے وسیع قتل عام میں کلیدی رول ادا کیا۔ غالباً مہاراجہ پٹیالہ اور اردگرد کی دیگر سکھ ریاستوں نے انہیں اسی مقصد کے لئے اپنی ریاستوں میں پناہ دے کر ان کے کیمپ قائم کئے تھے۔ یہ دن بھر شہر میں گھومتے اور شام کے بعد اپنے کیمپوں میں واپس چلے جاتے جو شہر سے باہر قائم کئے گئے تھے۔ صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے آنے والے ہندو دہلی کا رخ کر رہے تھے۔ سکھ ریاست پٹیالہ مشرقی پنجاب کی

سب سے بڑی ریاست تھی اور ہندوستان بھر میں حیدرآباد دکن اور کشمیر کے بعد رقبے اور آبادی کے لحاظ سے تیسری بڑی ریاست تھی۔ یہ مسلمانوں ہی نے اپنی فیاضی اور دریادلی سے سکھوں کو بخشی ہوئی تھی۔ موجودہ مہاراجہ اپنے آباؤاجداد کی ساتویں پشت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام یادوندر سنگھ تھا۔ اس کا باپ سابقہ راجہ بھوپندر سنگھ قابل اور اعلیٰ منتظم تھا۔ اس کے دور میں ریاست کا نظم ونسق مثالی تھا۔ ریاست کے تمام کلیدی عہدوں پر اس نے مسلمان مقرر کر رکھے تھے۔ وہ ہندو کو سازشی سمجھتا اور ان سے سخت نفرت کرتا تھا۔

موجودہ مہاراجہ یادوندر سنگھ کو حکومت سنبھالے ابھی پانچ سات سال کا عرصہ ہی گزرا تھا۔ اس کے آباؤاجداد کے دور میں ریاست میں نہنگ اور اکالی سکھوں کا داخلہ بند رہا لیکن اس نے اپنی حکمرانی کے دوسرے سال ہی ان دونوں تنظیموں کو ریاست میں داخلے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں کو وزارتی اور اعلیٰ عہدوں سے بھی آہستہ آہستہ ہٹایا جا رہا تھا۔ یہ انتہائی متعصب حکمران تھا۔ آل انڈیا کانگریس اور اکالی دل کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے ساتھ اس کا مکمل اشتراک تھا۔ اردگرد کی دوسری سکھ ریاستیں...... نابھہ، سنگرور، جیند فرید کوٹ اور کپورتھلہ...... بھی مکمل طور پر مہاراجہ پٹیالہ کی ہمنوا تھیں۔ صرف ایک بالکل ننھی سی مسلمان ریاست جس کا کل حدود اربعہ 90 گاؤں اور شہر پر مشتمل تھا، مالیر کوٹلہ تھی۔

مسلم لیگ ہندو کانگریس اور انگریزوں کے ساتھ قیام پاکستان کے لئے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ انگریز کے آخری دور میں متحدہ پنجاب میں قائم مسلمانوں کی یونینسٹ وزارت مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر آنے والی قیامت سے بالکل بے بہرہ تھی۔ سکھ ریاستیں، ہندو کانگریس اور اکالی دل کے ساتھ گٹھ جوڑ کے بعد مسلمانوں کے قتل عام کے لئے منظم منصوبہ بندی کر رہی تھیں۔ اکالی سکھوں کا لیڈر ماسٹر تارا سنگھ پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر ننگی تلوار ہاتھ میں لئے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر چکا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کو چھوڑ کر دیہاتی علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا اور مسلمان انبالہ، لدھیانہ اور جالندھر میں پناہ لے رہے تھے۔

ریاست پٹیالہ کے پاس دس ہزار نفری کی جدید فوج تھی جو دوسری جنگ عظیم سے

فارغ ہو کر واپس ریاست میں آئی تھی۔ جنگ کی وجہ سے انگریزوں نے اسے اس وقت کے جدید ہتھیاروں سے مسلح کیا تھا۔ پہلی پٹیالہ آرمی اور تیسری پٹیالہ آرمی تمام ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ تیسری سیکنڈ پٹیالہ آرمی میں چھ سو کے لگ بھگ مسلمان تھے۔ ان میں مشہور شخصیت کرنل لطیف کی تھی جو بعد میں والئ بہاولپور کے باڈی گارڈز کے کمانڈنٹ بھی مقرر ہوئے تھے۔ اس طاقتور فوج نے دوسری سکھ ریاستوں کی فوج کے ساتھ مل کر پٹیالہ سے لے کر امرتسر تک کے دیہات کو اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا اور بے تحاشا تشدد کرتے تھے۔

اس دور میں عام لوگوں کے پاس آج کی طرح بندوقیں اور سٹین گنیں اتنی نہیں تھیں۔ صرف باحیثیت لوگوں کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں۔ وہ بھی سنگل یا دونالی بارہ بور کی شکاری بندوقیں ہوتی تھیں۔ مشرقی پنجاب کا مسلمان آنے والے خوفناک طوفان سے بالکل بے خبر تھا۔ ان حالات میں وہ تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہندو اور سکھ جتھوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اکا دکا کہیں بندوق میسر تھی۔ ہندو اور سکھ جب مقابلے میں مسلمانوں کو سامنے پاتے تو اپنے فوجیوں کو مدد کے لئے بلا لیتے جو آتے ہی مسلمانوں کی ناکہ بندی کر کے اپنے ہتھیاروں سے مسلمانوں کے دیہات کو ملیامیٹ کر دیتے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان دیہات میں مسلمانوں کی لاشوں اور آگ اور خاک کے ڈھیروں کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا تھا۔

پٹیالہ شہر میں ہم دھر پورہ بازار کے محلہ خراسیاں میں رہتے تھے جو مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ یہ شیرانوالہ گیٹ سے شروع ہو کر انار دانہ بازار تک جاتا تھا۔ ہمارے محلے میں صرف چند گھر ہندوؤں اور سکھوں کے تھے۔

اس محلے کی نامی گرامی شخصیت میرے والد کے سگے پھوپھی زاد بھائی حکیم سید محمد اصغر تھے جو عمر میں والد سے خاصے بڑے تھے۔ خاندانی حکیم تھے۔ محلہ میں ان کا بہت بڑا مطب تھا۔ وسیع جائیداد کے مالک تھے۔ ہمارا گھر دھر پورہ بازار کی نکڑ پر تھا۔ یہیں سے محلہ خراسیاں شروع ہوتا تھا۔ ہمارے گھر کے ساتھ ایک بہت ہی وسیع وعریض احاطے میں ایک شاندار مسجد اور اس میں متعدد عمارتیں تھیں۔ یہ کھجور والی مسجد کہلاتی تھی۔ حکیم سید محمد اصغر

جنہیں ہم تایا جی کہا کرتے تھے۔ان کے والد حکیم سید احسن نے اس کھجور کا پودا مدینہ شریف سے لا کر لگایا تھا۔اب یہ تناور اور بہت اونچی ہو چکی تھی۔اسی حوالے سے یہ کھجور والی مسجد کہلاتی تھی۔ یہ تمام احاطہ اور اس میں عمارتیں سب حکیم صاحب کی ملکیت تھیں۔ محلے کے اندر جا کر جہاں ان کا مطب تھا اس کے اوپر ان کی تین منزلہ اس دور کی عالیشان حویلی تھی۔

اس کے علاوہ ہمارے محلے کی ایک قابل ذکر شخصیت حاجی عبداللطیف صاحب تھے۔بازار کی طرف ہمارے گھر کی نکڑ کے ساتھ ان کی دکان تھی۔ عطر اور پان وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ دکان کے اوپر چوبارے میں تنہا رہا کرتے تھے۔ان کے خاندان کے لوگ دھرمپورہ بازار اور اندرون محلے میں رہتے تھے۔حاجی لطیف صاحب نے نہ معلوم ان سب کو کیوں چھوڑ دیا تھا۔انہوں نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ ہمارے گھر کے عقب میں کھجور والی مسجد دکان کے بعد ان کا ٹھکانہ تھا۔صبح اور شام مسجد میں جھاڑو دیتے اور صفائی کرتے تھے۔ قابل ذکر تو ان کی اذان تھی۔اس زمانے میں مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر نہیں ہوا کرتے تھے۔ ان کی آواز میں بہت سوز تھا۔اذان دیتے تو لگتا تھا جیسے کائنات پر سحر طاری ہو گیا ہو۔

حافظ برکت بھی مسجد میں ہوتے تھے۔ وہ امامت کروایا کرتے تھے، کبھی کبھار حاجی لطیف صاحب کی عدم موجودگی میں وہ اذان بھی دیا کرتے تھے۔والد صاحب ہمیں سکول میں داخل کروا کر اپنی ڈیوٹی پر سنام نامی قصبے میں جا چکے تھے۔

جولائی 1947ء کا مہینہ جا رہا تھا۔ والد کا سنام جا کر کوئی خط نہ آیا۔ باہر کے حالات خراب ہو رہے تھے، لہٰذا بے چینی تھی۔ والدہ اور چچا، والد کو خط پر خط لکھ رہے تھے اور خراب حالات میں انہیں تاکید کر رہے تھے کہ وہ پٹیالہ واپس آ جائیں۔ پاکستان کے قیام کا اعلان انگریز گورنمنٹ کر چکی تھی۔ اس سے سیاسی فضا بے حد کشیدہ ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ ہندو اور سکھ جلوس نکال رہے تھے۔ پٹیالہ شہر میں ابھی تک امن تھا۔صوبہ سرحد سے آئے ہوئے سکھ پناہ گزین شہر کے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر جلوس اور مظاہرے کر رہے تھے۔ اب ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور کرپانیں ہوتی تھیں۔

جولائی کے آخری ہفتے میں والد سنام سے واپس آ گئے۔ وہاں سے بڑی مشکل

سے جان بچا کر نکلے تھے۔ اس علاقے میں خونریزی شروع ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ والد نے بتایا کہ وہ بڑی مشکل سے ایک سکھ ٹرک ڈرائیور کے ساتھ وہاں سے نکلے۔ راستے میں ہندو سکھ بلوائیوں نے ٹرک کئی جگہ روکا لیکن سکھ ڈرائیور نے یہ کہہ کر یہ میرے ہندو ساتھی ہیں، والد کو بچا کر دھوری منڈی تک پہنچا دیا۔ دھوری منڈی پٹیالہ ریاست کی اناج کی بہت بڑی منڈی تھی۔

ایک روز سیکنڈ پٹیالہ آرمی کے کرنل لطیف ملنے کے لئے آئے۔ یہ بھی والد کے پرانے شناساؤں میں سے تھے۔ اس وقت صورتحال کے متعلق کرنل لطیف کا خیال تھا کہ یہ وقتی ہنگامہ آرائی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہنگامے ختم ہو جائیں گے اور مہاراجہ زیادہ دیر تک اپنی ریاست میں یہ خونریزی برداشت نہیں کرے گا۔ پھر جہاں ہم لوگ رہتے ہیں یہ مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں ہندو سکھ کوئی گڑبڑ نہیں کریں گے۔ کرنل لطیف نے یہ بھی کہا کہ اپنے علاقے کے لوگوں کو چوکنا رہنا چاہئے۔ اپنے بچاؤ اور تحفظ کے لئے اجتماعی طور پر کچھ سوچنا چاہئے اور کچھ ہتھیار بھی پاس رکھنے چاہئیں۔

رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہو چکا تھا جوں جوں پاکستان کے قیام کا دن قریب آ رہا تھا۔ مشرقی پنجاب میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی ''جے ہند'' اور ''ست سری اکال'' کے نعرے گونجتے رہتے تھے۔ سکھ ریاستوں کی وجہ سے مسلمان کوئی مظاہرہ نہیں کر رہے تھے، نہ کر سکتے تھے۔ دیہاتی علاقوں میں مسلمانوں کے قتل عام کی وجہ سے ہر مسلمان کے سر پر یہ سوال ننگی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

مشرقی پنجاب میں اکالی فوج کا سیناپتی ماسٹر تارا سنگھ تو جیسے سکھوں سے اعلانیہ کہہ رہا تھا۔ ''خالصتان کی بنیادیں مسلمانوں کی لاشوں کے انبار پر رکھی جائیں گی۔ خالصتان قائم ہونے کی خوشی میں منائے جانے والے جشن کے جلوس میں سب سے آگے مسلمانوں کی بہو بیٹیاں برہنہ مارچ کریں گی۔ امرتسر کے دربار صاحب پر خالصتان کے لہرائے جانے والے پرچم کو مسلمانوں کے خون سے رنگا جائے گا۔ مسلمانوں کی کھوپڑیوں کے انبار لگا کر تم ہلاکو اور چنگیز کی بہادری کو جھٹلا دو۔ انگریز نے تمہیں خالصتان نہیں دیا لیکن

پنڈت نہرو اور سردار پٹیل اور دوسرے کانگریسی لیڈر مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی لاشوں کے انباروں پر ہم تمہیں تمہارا خالصتان بنادیں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑے مسلم کش اور اسلام دشمن ہندو لیڈر پٹیل نے جو ہندوستان کا پہلا وزیر داخلہ بنا تھا، ماسٹر تارا سنگھ کو اس مقصد کے لئے نقد رقم دی تھی کہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو قتل و غارت، آتش زنی، مسلمانوں عورتوں کے اغواء اور آبرو ریزی کے ذریعے بھگایا جائے۔ ماسٹر تارا سنگھ کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ کی پوری فوج سکھوں کے ساتھ ہوگی۔

ادھر ہندوستان کی جنگ آزادی کے سب سے بڑے "ہیرو" مہاتما گاندھی کا "نازک" دل آگ اور خون کے طوفان کو دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو عدم تشدد کا پرچار کر رہا تھا اور اس کے چیلے بنگال بہار اور مشرقی پنجاب میں ان کے پیغام کو عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ مہاتما گاندھی مرن برت (بھوک ہڑتال تا مرگ) کی دھمکیاں دے رہا تھا جو محض ایک فریب تھا، عیاری تھی۔

آخر وہ وقت آ پہنچا۔ 14 اگست 47ء کو صبح آزادی طلوع ہوئی۔ دنیا کے نقشے پر پاکستان کی آزاد مملکت کی سرحدیں مسلمانوں کے خون سے سرخ نشان بن کر ابھر آئیں۔ رام راج کے سورے اکھنڈ بھارت کی گرتی ہوئی عمارت کو مسلمانوں کے قتل عام سے کھڑا رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہندوستان میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کا خواب پورا ہو رہا تھا۔

ہمارے محلے میں مسلمان ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر مبارک دے رہے تھے۔ خوف اور دہشت کی فضا میں بھی ان کے چہروں پر خوشی کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے چہرے مایوسی سے لٹک گئے تھے لیکن وہ اعتراف شکست کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم انگریز کا فیصلہ کبھی نہیں مانیں گے۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے، مسلمانوں کو یہاں رہنے اور حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ پاکستان کی عمارت ڈگمگا کر زمین پر آ رہے گی۔ ہم اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیں گے۔ ہم مسلمانوں کو بتا دیں گے کہ پاکستان کی قیمت کیا ہوگی۔ ان کے آنے والی نسلیں بھی یاد

رکھیں گی۔

29 رمضان المبارک کی شام عید کا چاند نظر نہ آیا۔ مسلمانوں نے تیسواں روزہ رکھا لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ صبح چھ بجے ہی شہر میں افواہ پھیل گئی کہ چاند نظر آ رہا ہے، آج روزہ نہیں۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ اس صبح میں نے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا تھا اور چاند باریک چوڑی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا رنگ تانبے کی طرح سرخی مائل تھا۔ مسلمانوں نے روزے افطار کرنے کو کہا اور ساڑھے آٹھ بجے عیدگاہ کے میدان میں نماز کے لئے جمع ہونے کے لئے کہا گیا۔

عیدگاہ شیرانوالہ گیٹ کے باہر بارہ دری باغ کے بالمقابل ایک کھلی جگہ پر تھی۔ یہ شہر کی سب سے خوبصورت اور تفریحی سڑک پر واقع تھی۔ اس کے بالمقابل بہت بڑی جھیل تھی جس میں سینکڑوں قسم کی بطخیں اور راج ہنس چھوڑے گئے تھے۔ جھیل کے مشرقی جانب پٹیالہ شہر کا سب سے بڑا اور عالی شان راجندرا ہسپتال ہے۔ مسلمانوں نے عید کی نماز ادا کی اور اپنے خدا کے حضور پاکستان کی نئی مملکت اور ہندوستان اور خصوصاً مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔

پٹیالہ کے اردگرد کے دیہات کے مسلمان جو انگریزی علاقوں سے دور تھے۔ قتل و غارت گری سے گزر کر پٹیالہ شہر میں پناہ لے رہے تھے۔ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کی لرزہ خیز داستانیں سنا رہے تھے۔ ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو تنہا بچ کر شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے بیوی بچے، ماں باپ ہندو سکھ درندوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

بالآخر ریاست کی سکھ حکومت کھل کر مسلمانوں کے قتل عام پر اتر آئی۔ تمام سرکاری ملازمین (ہندو اور سکھ) کو ہدایات جاری کر دی گئیں۔ بالخصوص فوج اور پولیس کو 5 ستمبر 1947ء کو پٹیالہ شہر میں کرفیو نافذ کر کے شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ سب سے پہلے ان مسلمانوں کو تہ تیغ کیا گیا جو شہر میں اقلیت کے علاقوں میں رہتے تھے، بچے کھچے مسلمان شیرانوالہ گیٹ کے علاقے میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، پناہ لے رہے تھے۔

تمام مسلمان فراخدلی سے اپنے مظلوم بھائیوں کو اپنے گھروں میں پناہ دے رہے تھے۔

اچانک ایک دن کرفیو اٹھالیا گیا۔ شہر میں سرکاری گاڑیاں لاؤڈ سپیکر لگائے اعلان کررہی تھیں کہ تمام مسلمان کل شام تین بجے تک توپ گھاٹ کے میدان میں پہنچ جائیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں میں معاہدہ ہوگیا ہے۔ تمام مسلمانوں سے قافلے کی صورت میں سرکاری حفاظت میں پاکستان بھیج دیئے جائیں گے۔ مسلمان گھروں سے باہر نکل آئے، جگہ جگہ کھڑے ہوکر شہر کے قتل عام اور پاکستان جانے کے متعلق باتیں ہورہی تھیں۔ لوگ خوش ہورہے تھے کہ قتل وغارت ختم ہوگئی ہے۔ اب اپنے پیارے ملک پاکستان جاکر آباد ہوجائیں گے۔

شام کو ہماری بیٹھک میں محلے کے سرکردہ لوگ جمع تھے۔ ہمارے تایا حکیم اصغر صاحب بھی موجود تھے۔ رتن چند درزی کے ساتھ والے گھر میں پولیس انسپکٹر محمد بشیر رہتے تھے وہ بھی موجود تھے۔ سب کل شام توپ گھاٹ کے میدان میں جانے اور وہاں سے قافلے کی صورت میں پاکستان جانے پر اظہار خیال کررہے تھے۔ سب متفق تھے کہ قافلے کے ساتھ پاکستان چلا جائے لیکن میرے والد کہہ رہے تھے کہ یہ دھوکہ ہے۔ تمام مسلمانوں کو اس لئے ایک جگہ اکٹھا کیا جارہا ہے کہ انہیں ختم کرنے میں آسانی ہو۔ ہر گھر پر حملہ اور مسلمانوں کو قتل کرنا انہیں مہنگا پڑ رہا ہے۔ بعض گھرانوں کے مسلمان اپنی عزت وآبرو کی خاطر مقابلے پر اتر آتے ہیں جس سے ہندوؤں اور سکھوں کا بھی کچھ نہ کچھ جانی نقصان ہورہا ہے۔ والد کی مخالفت میں سب کہتے تھے کہ "آپ یہاں تنہا رہ کر کیا کریں گے جب تمام لوگوں کی متفقہ رائے ہے کہ قافلے میں شامل ہوا جائے۔ سب کے ساتھ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی ہم مجبور اور بے بس ہیں۔ ہم ریاست کی فوج اور پولیس کا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں؟" والد کہہ رہے تھے کہ "جو یہاں ہونا ہے وہی توپ گھاٹ کے میدان میں ہونا ہے، گھر میں رہنے سے کم از کم اتنا تو کرسکتے ہیں کہ اپنی جانیں دینے سے پہلے کم از کم ان کی بھی کچھ جانیں لیں اور پھر کسی انتہائی نازک صورتحال میں ہم اپنی عورتوں کو خود اپنے ہاتھوں ہلاک کردیں۔ ان درندوں کے ہتھے چڑھنے سے تو ہم انہیں بچاسکتے ہیں۔"

والد نے آخر فیصلہ سنا دیا۔ ''ہندو ایک مکار قوم ہے۔ میرا فیصلہ جو ہم نے عورتوں اور بچوں کی بہتری کے لئے کیا ہے، یہ ہے کہ میں کل توپ گھاٹ کے میدان میں نہیں جاؤں گا۔''

سڑک پر فوج کے آدمی گشت کر رہے تھے، گلیوں میں مسلمان ایک دوسرے سے صلاح مشورے کر رہے تھے۔ قافلے کے ساتھ جانے کے لئے خورد ونوش کا سامان اکٹھا کر رہے تھے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ ستمبر کے مہینے کی ان تاریخوں میں کتنی یکسانیت تھی۔ 5 ستمبر 1947ء کو کرفیو لگا کر پٹیالہ شہر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تھا اور 21 ستمبر کو توپ گھاٹ کے میدان میں اکٹھا کر کے ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو ریاست کی فوج اور پولیس نے شہید کیا اور 23 ستمبر کو اس قتل عام کا ڈراپ سین ہوا۔ اٹھارہ برس بعد 6/5 ستمبر 1965ء کی درمیانی رات کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا اور 23 ستمبر 1965ء کو ہزیمت اٹھا کر جنگ بندی کر لی۔

21 ستمبر 1947ء کو سورج آگ اور خون کے گولے کی طرح طلوع ہوا۔ علاقے کے تمام مسلمان اپنا مختصر سامان جو وہ ساتھ لے جا سکتے تھے۔ باندھ کر توپ گھاٹ کے میدان کا رخ کر رہے تھے۔ حکیم صاحب بھی تیار ہو چکے تھے۔ جانے سے پہلے ایک دفعہ پھر والد کے پاس آئے اور انہیں ساتھ چلنے کو کہا لیکن والد صاحب نے کہا۔ ''بھائی جان میں آپ کی سلامتی کے لئے دعا کروں گا اور آپ بھی ہماری سلامتی کے لئے دعا کریں۔'' حکیم صاحب مایوس ہو کر اپنے خاندان کے ہمراہ چلے گئے۔

شام کے تین بج رہے تھے۔ محلے میں ہو کا عالم تھا۔ لگتا تھا تمام محلہ خالی ہو چکا ہے۔ رتن چند کے برابر والے مکان میں پولیس انسپکٹر محمد بشیر بھی توپ گھاٹ کے میدان نہیں گئے تھے۔

والد، چچا احمد اور چچا نذیر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر صحن میں والدہ مجھے اور بڑے بھائی رفیق کو کہہ رہی تھیں کہ ''پانی بند ہے، سیڑھی کے راستے مسجد میں اتر کر کنویں

سے کچھ پانی بھر کر اوپر لاؤ۔ گرمی اور حبس ہو رہا ہے۔ ہم غسل خانے میں نہالیں اور تم لوگ مسجد کے کنویں پر ہی نہالینا۔"

میں اور میرا بھائی صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچے ہی تھے کہ ہمیں شی شی کی آواز سنائی دی۔ ہم نے دیکھا، سامنے اپنی چھت پر رتن چند پیٹ کے بل لیٹا، ہمیں کچھ اشارے کر رہا تھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر اپنے دوسرے ہاتھ پر مارتا اور بازار کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں دوڑ کر نیچے گیا اور والد کو رتن چند کے اشاروں کے متعلق بتایا۔ والد اوپر پہنچے اور گلی کی طرف منڈیر کے ساتھ لگ کر رتن چند سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بھاگ جاؤ" رتن چند کہہ رہا تھا۔ "ہندوؤں سکھوں کا ہجوم بازار کی طرف سے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ وہ میری چھت پر آنا چاہتے ہیں۔ اپنی جانیں بچاؤ اور جلدی بھاگ جاؤ۔ ان کے پاس بندوقیں بھی ہیں" یہ کہہ کر رتن چند چھت سے کھسک کر نیچے چلا گیا۔

والد ہمیں لے کر نیچے اترے اور فوراً چچا احمد اور چچا نذیر سے کہا کہ "بچوں اور عورتوں کو لے کر مسجد کے احاطے میں اترو اور وہاں رکنا نہیں۔ مسجد کے سامنے والے مکان کی چھت تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ جلد کرو" والد دوڑتے اندر گئے۔ بندوق اور کارتوس کی پیٹی اٹھا کر باہر صحن میں آئے۔ ہمیں جلدی جلدی چھت پر جا کر مسجد کے احاطے میں جانے کو کہا۔ ہم سب افراتفری کے عالم میں چھت پر چلے گئے۔ اچانک گلی کی جانب ہمارے گھر کا دروازہ ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کا جم غفیر جے ہند اور ست سری اکال کے نعرے لگا رہا تھا۔ والد بجلی کی طرح سیڑھیاں چڑھ کر بائیں جانب گلی کی طرف چھت پر پہنچے اور بغیر کسی توقف کے منڈیر کے ساتھ لگ کر بندوق نیچے کی اور دونوں کارتوس فائر کر دیئے۔ دو شدید دھماکے ہوئے، فوراً ہی نیچے بیٹھ کر انہوں نے چند ہی سیکنڈ میں دو کارتوس بندوق میں بھرے اور ان کا رخ بھی نیچے گلی کی طرف کر کے یکے بعد دیگرے دونوں فائر کر دیئے۔

ہندو اور سکھ ہمارے گھر کا دروازہ چھوڑ کر سڑک کی جانب بھاگ رہے تھے۔ والدہ، بہن اور مہمان خاتون دائیں طرف کی چھتوں سے ہوتی ہوئی مکان کے پچھواڑے مسجد کے احاطے میں بانس کی سیڑھی کے ذریعے اتر چکی تھیں۔ چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی رفیق بھی اتر چکے تھے۔ میں پلٹا اور دوڑ کر گلی سے ملحقہ چھت پر گیا اور والد کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ چچا احمد اور چچا نذیر بے تحاشا اینٹوں کے ٹکڑے اٹھا کر سڑک پر بلوائیوں پر چلا رہے تھے۔ اچانک والد نے پلٹ کر میری جانب غصے سے دیکھا اور مجھے فوراً والدہ اور بہن بھائیوں کے پاس جانے کو کہا۔

''احمد نذیر!'' والد نے بندوق میں کارتوس لوڈ کرتے ہوئے کہا۔ ''وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، تم فوراً پیچھے مسجد میں جا کر سامنے کسی مکان میں پناہ لینے کی کوشش کرو۔ اگر ہو سکے تو مسجد کے سامنے والے چوبارے پر چڑھ کر نابھے والوں کی بڑی بلڈنگ میں بچوں کو اتار دو۔ میں یہاں پر حملہ آوروں کو روکوں گا۔''

چچا احمد اور چچا نذیر دوڑتے ہوئے مسجد کے احاطے میں لگی سیڑھی سے نیچے اتر گئے اور ہمیں لے کر مسجد کے احاطے میں چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں اور بڑا بھائی سب سے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

''او مسلیو!'' ہمیں ایک للکار سنائی دی۔ ''بچ کے کتھے جاؤ گے۔ چیر کے رکھ دیا گے۔''

ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ رتن چند کے کوٹھے پر ایک سکھ میری طرف بندوق تانے کھڑا تھا۔ بڑے بھائی رفیق اوپر صحن کے دروازے تک پہنچ چکے تھے اور میں بالکل ان کے پیچھے تھا، دھماکہ ہوا اور دوسرے لمحے میں خون میں نہا گیا۔ بڑے بھائی مجھے دروازے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ ان کے بازو اور گال سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ چچا احمد بجلی کی طرح صحن سے پلٹے مجھے اور بھائی کو کھینچ کر اوپر دروازے کی آڑ میں کر لیا۔

والد نے چھت کی منڈیر کے پیچھے چھپے ہوئے اپنے کان کے پیچھے خوفناک دھماکہ سنا۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا جس سکھ نے مجھ پر اور بھائی پر فائر کیا تھا۔ وہ اپنی بندوق میں دوسرا کارتوس ڈال رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس کے پاس بارہ بور کی

سنگل نالی والی بندوق تھی۔ والد نے پھرتی سے اپنی بندوق گھمائی اور صرف دس فٹ کے فاصلے پر گلی کے پار چھت پر کھڑے سکھ پر فائر کر دیا۔ سکھ ایک خوفناک چیخ مار کر دوہرا ہوا اور پکے ہوئے پھل کی طرف دوسری منزل کی چھت سے گلی میں جا پڑا۔

چچا احمد نے دروازے میں کھڑے ہو کر والد کو آواز دے کر کہا کہ بچے زخمی ہو گئے ہیں۔ والد دوسری چھتوں سے اور مسجد کے احاطے سے ہوتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ مجھے دس چھرے لگے تھے۔ میرے سینے، منہ اور گالوں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ چچا احمد اور چچا نذیر زمین پر مجھے لٹا کر میرے جسم میں چھروں کو گوشت دبا دبا کر نکال رہے تھے۔ والد بھی میرے اوپر جھکے، میرے گال تھپتھپائے اور کہا، بیٹا گھبرانے والی بات نہیں۔ تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ چچا احمد بڑے بھائی رفیق کے گال اور بازو سے بندوق کے چھرے نکال چکے تھے۔

یک لخت دھکڑ دھکڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ حملہ آور جس احاطے میں مسجد تھی، اس احاطے کا گلی والا دروازہ توڑنے لگے لیکن اونچی دیواروں اور مضبوط پھاٹک کی وجہ سے وہ جلد کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ والد، چچا احمد اور چچا نذیر نے ہمیں فوراً چوبارے کی چھت پر پہنچایا۔ اس کے ساتھ نابھے والوں کی بہت لمبی چوڑی کئی منزلہ حویلی تھی۔ چوبارے کی چھت سے نابھے والوں کی دوسری منزل کا صحن سات فٹ نیچے تھا۔ چچا احمد اور چچا نذیر کود کر نیچے اترے۔ والد نے ہمیں ہاتھوں کا سہارا دے کر نیچے اترا۔ والدہ اور بہن اور مہمان خاتون کو بھی اسی طرح اتارا گیا۔ آخر میں والد بھی چھلانگ لگا کر نیچے آ گئے۔ حویلی خالی اور سنسان لگتی تھی لیکن صحن کے ایک کونے میں ایک ضعیف العمر بوڑھا ہاتھ میں ڈبل بیرل بندوق لئے پریشانی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب آیا۔ والد کا شناسا تھا۔ والد نے بوڑھے سے پوچھا کہ وہ اکیلا یہاں کیا کر رہا ہے اور باقی لوگ کدھر ہیں۔

''تمام گھر والے توپ گھاٹ کے میدان میں قافلے میں شامل ہونے کے لئے جا چکے ہیں۔'' بوڑھے نے بتایا ''میں گھر کی حفاظت کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔ کچھ دنوں میں امن ہو جائے گا تو مسلمان پھر اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ ٹھہرو میں ان زخمی بچوں کے

لئے کچھ لاتا ہوں۔ گھر میں پٹی اور ٹنکچر موجود ہے۔''

مہمان خاتون اور ہمشیرہ نے ہمیں پانی لا کر پلایا۔ گلی کی جانب سے حملہ آوروں کے نعرے بدستور سنائی دے رہے تھے۔ وہ اونچی آوازوں میں ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے۔ ''چلو چلو توپ گھاٹ کے میدان کی طرف چلو یہ بچے کھچے مسلے کہاں جائیں گے۔ انہیں واپسی پر دیکھیں گے۔''

والد نے ہمارے زخموں کو سادہ پانی سے صاف کیا، دوائی لگائی اور پٹیاں باندھ دیں۔ مرہم پٹی کا سامان بوڑھے نے حویلی میں سے دیا تھا۔ معلوم نہیں انسپکٹر بشیر اور ان کے اہل خانہ کا کیا بنا تھا۔ چچا احمد نے سب سے اوپر کی منزل کی چھت پر چڑھ کر دیکھا اور آ کر بتایا کہ بالکل سناٹا ہے۔ انسپکٹر بشیر کے مکان میں کچھ نظر نہیں آتا۔ تمام محلے پر ہو کا عالم طاری ہے۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ والد اور بوڑھا کبھی کبھی سب سے اونچی چھتوں پر جاتے اور دیکھ کر نیچے آ جاتے۔ دور جنوب کی جانب دھماکے سنائی دینے لگے۔ توپ گھاٹ کا میدان اسی جانب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ گولہ باری کر رہا ہو اور پھر جیسے بے شمار مشین گنیں فائر کر رہی ہوں۔ میرے والد نے کہا ''خدا توپ گھاٹ کے میدان میں جمع ہونے والے مسلمانوں پر رحم کرے۔ معلوم ہوتا ہے توپ گھاٹ کے میدان میں جمع ہونے والے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔''

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ خوفناک سناٹا طاری تھا۔ والد اور بوڑھا محافظ بار بار چوتھی منزل کی چھتوں پر آ جا رہے تھے۔ بوڑھا کسی کمرے سے ایک بڑی دری کھینچ کر باہر صحن میں لے آیا اور کہنے لگا کہ اسے بچھالو، آج کی رات صبر سے یہیں بسر کر لو۔ وہ پھر حویلی میں جا کر گم ہو گیا جب واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کھانے کا کافی سامان موجود تھا۔ کہنے لگا گھر میں یہی کچھ موجود تھا، کھالو۔ کل کا اللہ مالک ہے۔

کسی کو بھوک نہیں تھی۔ والدہ نے سب کو روٹی پر خشک سالن رکھ کر دیا لیکن چھوٹے بھائیوں رشید، حفیظ اور بشیر کے سوا کسی نے کچھ نہ کھایا۔ کچھ دیر بعد بوڑھا دو گلاسوں

میں دودھ بھی لے کر آیا جو مجھے اور بھائی رفیق کو دیا گیا۔

رات کی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ حویلی میں کوئی روشنی نہیں کی گئی تھی۔ ہر سو خوفناک اندھیرا تھا۔ کہیں سے اکا دکا گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ والد اور بوڑھا محافظ بندوقیں تھامے چوتھی منزل کی چھت پر کھڑے مسجد کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کیونکہ یہی راستہ خطرناک تھا۔ حملہ اسی راستے سے ہو سکتا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ہم دری ایک کمرے میں بچھا کر لیٹ گئے۔ والدہ، مہمان خاتون اور بڑی بہن جاگ رہی تھیں اور بیٹھی آنے والے وقت کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ چچا احمد اور چچا نذیر والد اور بوڑھے محافظ کے ساتھ تھے۔ کوئی پتہ نہیں کہ میری کس وقت آنکھ لگ گئی۔

رات کا شاید پچھلا پہر تھا۔ ایک بھیانک خواب سے ڈر کر میری آنکھ کھل گئی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ حویلی میں بہت ساری آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ حویلی میں بے شمار لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بہن نے بتایا کہ یہ لوگ توپ گھاٹ کے میدان سے بچ کر آئے ہیں۔ میں کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ ہر طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ کوئی سسکیوں اور آہوں میں بتا رہا تھا کہ میرا پورا خاندان مارا گیا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا میرے سامنے ماں باپ سب بہن بھائی مارے گئے اور کوئی رو رہا تھا کہ ہندو سکھ میری بیٹیوں اور نوجوان بہنوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کوئی عورت بین کر رہی تھی کہ میرے خاوند اور بیٹوں کو انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا ہے۔ قتل ہونے والوں کا مجھ پر اس قدر خون گرا تھا کہ حملہ آوروں مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔

صبح کاذب کا اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ جوں جوں روشنی پھیل رہی تھی، توپ گھاٹ کی حقیقت عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ بوڑھے حافظ اور حکیم صاحب اور ان کے اہل خانہ بھی آنے والوں میں شامل تھے۔ انسپکٹر پولیس محمد بشیر اور اس کا خاندان بھی حویلی میں موجود تھا۔ سب اپنی اپنی سنا رہے تھے۔ حویلی میں چار پانچ سو کے لگ بھگ مرد اور عورتیں جس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گلی کی طرف سے دروازہ کھلوا کر داخل ہوئے تھے۔ توپ

گھاٹ کے میدان میں ان پر جو گزری، وہ کچھ اس طرح تھی۔

شام پانچ بجے تک ایک لاکھ سے زائد مسلمان توپ گھاٹ کے میدان میں اپنا مختصر سامان جو وہ اٹھا کر چل سکتے تھے، لے کر پہنچ چکے تھے۔ میدان میں عجیب شور برپا تھا۔ ہندو اور سکھ فوجی وردیوں میں میدان کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے، وہ مسلمانوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم تمہاری حفاظت کے لئے سرحد تک تمہارے ساتھ جائیں گے۔ میدان کے جنوب مغرب کی طرف ایک گندا نالہ تھا۔ کچھ فوجی گاڑیاں نالے کے پار کھڑی تھیں۔ فوجی آہستہ آہستہ میدان سے غائب ہونے لگے۔

پانچ بجے میدان کے مشرقی کونے کی جانب سے سکھوں کا ایک جتھا نمودار ہوا اور اس نے پورے زور سے ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ یہ ایک سگنل تھا۔ نعرہ لگتے ہی میدان کے چاروں طرف سے گولیاں چلنے لگیں اور پھر ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ یہ مارٹر گن کا گولہ تھا جو میدان کے وسط میں آ کر پھٹا، پھر مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مارٹر گنوں کے گولے میدان میں قیامت صغریٰ برپا کیے ہوئے تھے۔ میدان کے چاروں جانب سے مشین گنیں بارش کی طرح گولیاں برسا رہی تھیں۔ مسلمانوں کے لئے کوئی جائے امان نہیں تھی جس کا جدھر منہ آیا، بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ بچے ماں باپ سے بچھڑ گئے۔ بیویاں شوہروں سے علیحدہ ہو گئیں، جوان لڑکیاں اپنے بھائیوں اور ماں باپ سے الگ ہو گئیں، حشر کا سماں تھا۔ مشین گنوں کی گولیاں اور مارٹر گنوں کے گولے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اڑا رہے تھے۔ مشین گنیں میدان کے چاروں طرف مکانوں کی چھتوں پر نصب کی گئی تھیں۔ فوجی گاڑیوں سے بھی مشین گنیں آگ اگل رہی تھیں۔ افراتفری میں بھاگنے میں ناکامی کے بعد ہر کوئی زمین پر لیٹ کر لاشوں میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ چیخوں اور شور وغل سے آسمان کانپ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ خالصتان کے سورمے خالصتان کی عمارت کی بنیادیں اسی میدان میں مسلمانوں کی لاشوں کے انبار پر رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

مارٹر گنوں کے پھٹتے گولوں کے خوفناک دھماکوں میں کسی کو کسی کی پکار سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میدان کے شمال کی جانب سے ایک کونے کی بڑی مسجد میں مسلمان بھاگ بھاگ کر

پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیوں کی بوچھاڑ میں ڈھیر ہو رہے تھے۔ سورج اس خونیں منظر کی تاب نہ لا کر گہرے بادلوں میں اپنا منہ چھپا چکا تھا۔

چھ بج گئے تو مارٹر گنوں کا فائر بند ہو گیا۔ اکا دکا اٹھنے اور ہلنے والوں پر مشین گنیں اور رائفلیں اب بھی گولیاں برسا رہی تھیں۔

مشرقی کونے سے سکھوں کا ایک اور جتھا نمودار ہوا اور اس نے زوردار نعرہ لگایا۔ یہ دوسرا سگنل تھا۔ مشین گنوں اور رائفلوں کا فائر بند ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندو اور سکھ تلواریں اور برچھیاں لئے میدان کے چاروں طرف سے میدان میں داخل ہو رہے تھے۔ اب زخمیوں اور زندہ بچ جانے والوں کو تلواروں اور برچھیوں سے شہید کیا جا رہا تھا۔ کسی زخمی کو تڑپتا یا ہلتا دیکھ کر ہندو اور سکھ اس پر لپکتے اور اسے قتل کر دیتے۔ ہزاروں معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں کو جو حشر کے میدان میں اپنے ماں باپ کو پکار رہے تھے، برچھیوں میں پرو کر اور اونچا اٹھا کر میدان میں وحشیانہ قتل و غارت گری میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کا قیمتی سامان اٹھایا جا رہا تھا۔

مغرب کے بعد اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ فوج اپنا مشن مکمل کر کے واپس جا چکی تھی۔ ہندو اور سکھ جتنے بھی مسلمانوں کو قتل کر کے اور سامان لوٹ لوٹ کر اپنے ٹھکانوں کو واپس جا رہے تھے۔ دو ہزار کے قریب مسلمان مسجد میں پناہ لے چکے تھے۔ کئی مسلمان خاندان میدان میں داخل ہونے کی بجائے اپنے گھروں سے چل کر مسجد ہی میں آئے تھے۔ تھوڑے سے مسلمان میدان کے شمالی سرے سے بھاگ کر مسجد میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ باقی بھاگ کر مسجد میں پناہ لینے والے بیشتر فوج کی مشین گنوں اور رائفلوں کا شکار ہو کر میدان ہی میں ڈھیر ہو گئے تھے۔ بچے کھچے مسلمان موسلا دھار بارش کو اپنے لئے خدا کی بھیجی ہوئی امداد سمجھ رہے تھے لیکن مسجد کے سامنے ست سری اکال کا زوردار نعرہ گرجا اور سکھوں کے ایک جتھے نے مسجد پر حملہ کر دیا۔ ہندو اور سکھ مسجد کی چار دیواری پھاند کر اندر آنے لگے لیکن مسجد کے اندر سے چلنے والی گولیوں نے انہیں لاشیں چھوڑ کر باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مسجد کے صحن میں داخل ہونے والے سکھوں سے مسلمان گتھم

گتھا ہو گئے۔ اب اللہ اکبر کے نعرے بھی گرجنے لگے۔ مسجد کے چھت سے بھی سکھوں کو مسلمان گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ہندو اور سکھ بدحواسی کے عالم میں اپنی لاشیں چھوڑتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ یہ صورتحال ان کے لئے خلاف توقع تھی۔ رائفلوں والے جوان خان صاحبوں کے خاندان کے لوگ تھے جو قافلے میں شامل ہونے کے لئے آئے تھے اور انہوں نے بھی مسجد میں آکر پناہ لی تھی۔ دھرمپورہ بازار میں ان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ یہ لوگ پولیس میں ملازم تھے۔ ان کے پاس چار رائفلیں تھیں۔

بارش زوروں پر تھی اور رات گزر رہی تھی۔ توپ گھاٹ کے میدان میں ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ آہ و بکا ختم ہو چکی تھی۔ مسجد میں جو مسلمان تھے انہوں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ایک پل کا بھی بھروسہ نہیں تھا چنانچہ رات کی تاریکی میں جدھر جس کا منہ آیا، نکل گیا۔ مسجد کے صحن میں کچھ مسلمانوں اور سکھوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ باقی مسلمان تو نہ جانے کدھر گلیوں اور محلوں میں گم ہو گئے، چار پانچ سو افراد بوڑھے محافظ کے بیٹوں کے ساتھ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے حویلی کی پچھلی طرف پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ بارش زوروں پر تھی۔ بوڑھے محافظ اور میرے والد نے ایک بالکونی سے باہر گلی میں جھانکا۔ دونوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں لیکن محافظ کے بیٹے دلبر حسین نے اپنے باپ کو آواز دی کہ ہم ہیں، فوراً دروازہ کھولو۔ بوڑھا محافظ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا اور گلی کی جانب کھلنے والا بڑا دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر میں تمام مسلمان اندر آگئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

ایک اور مسئلہ آن پڑا۔ اتنے لوگوں کے لئے کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ توپ گھاٹ کے میدان سے بچ کر آنے والوں نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوری طور پر بیس تیس جوان تیار ہو گئے۔ رائفلوں والے ان کے ہمراہ گئے۔ محلے میں مسلمانوں کی دکانوں کے تالے توڑ کر چاول اور آٹے کی بوریاں اور دیگر اشیائے خورد و نوش لے کر حویلی میں پہنچ گئے۔ محلہ سنسان پڑا تھا۔ ہندو اور سکھ شاید توپ گھاٹ کی فتح کرنے کا جشن منا کر ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

والد اور چچا احمد گھر واپس جا کر ہمارے لئے کچھ کپڑے اٹھا کر لانے کا ارادہ کر رہے تھے کیونکہ ہم گھر سے نہانے کا پروگرام بنا کر نکلے تھے۔ ہمارے جسموں پر صرف نیکر اور بنیان تھی۔ والدہ نے والد کو گھر میں پڑی ایک چھوٹی سی صندوقچی بھی اٹھا لانے کو کہا جس میں والدہ کا زیور اور ہمشیرہ کی شادی کے لئے بنایا ہوا زیور اور مہمان خاتون کا کچھ زیور پڑا تھا۔ چچا نذیر بھی ساتھ جانے کو تیار ہوئے لیکن والد نے انہیں وہیں رکنے کا کہا اور چھتوں سے ہوتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔ جلدی جلدی کپڑے اور زیورات کی صندوقچی اٹھا لائے۔

دن کے دو بج رہے تھے۔ چیدہ چیدہ لوگ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ کوئی مشورہ دے رہا تھا کہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلا جائے، کوئی اسے خودکشی کے مترادف قرار دے رہا تھا۔ سڑکوں پر کرفیو کی وجہ سے فوج پہرہ دے رہی تھی۔ شہر سے نکلنے کے لئے دو تین میل کا فاصلہ طے کرنا تھا جو عورتوں اور بچوں کے ساتھ بالکل ناممکن تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہیں رہ کر حالات کا انتظار کرنا چاہئے۔ شاید اب حکومت اس کشت و خون کو بند کر دے۔

پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ مسلمان اپنے دامن پھیلائے گڑگڑا کر اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ عورتوں نے روٹیاں پکائیں اور چاول ابال لئے تھے۔ بڑوں نے مشکل سے چند نوالے کھائے چھوٹے اور معصوم بچے سوکھی روٹی اور خشک اور پھیکے چاول منہ بسور کر کھا رہے تھے۔

شام کے چار بجے سڑکوں اور گلیوں میں ہندو اور سکھ نعرے لگانے لگے۔ حویلی سے دور دور مکانوں پر کھڑے ہو کر فائرنگ بھی کی۔ مسلمانوں نے حویلی کی چھتوں سے اکا دکا گولیاں چلا کر جواب دیا۔ ہندو اور سکھ حویلی کے نزدیک نہیں آ رہے تھے کیونکہ انہیں اپنی بھی کچھ جانیں بھینٹ چڑھ جانے کا خطرہ تھا، انہوں نے اپنی فوج اور پولیس کے کندھوں پر چڑھ کر مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اب شاید فوج اور پولیس دخل نہیں دے رہی تھی البتہ ان کو روک بھی نہیں رہی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی فائرنگ بند ہو گئی۔ حویلی میں

مرد، عورتیں اور بچے کمروں میں دم سادھے دبکے ہوئے تھے۔ صرف رائفلوں والوں نے حویلی کے چاروں طرف چھتوں پر دیواروں کی آڑ میں مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ پھر رات گہری ہونے لگی، تمام مرد چوکنے رہے اور یہ رات بھی خاموشی سے گزر گئی۔

صبح دس بجے سڑک کی جانب سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ کوئی شخص دلبر حسین کا نام لے کر پکار کر کہہ رہا تھا، دلبر حسین، دروازہ کھولو، تمہارے لئے اچھی خبر ہے۔ بوڑھے محافظ کا بیٹا اپنا نام سن کر سڑک کی جانب والی بالکونی پر احتیاط کے ساتھ آڑ میں کھڑا آنے والے سے پوچھ رہا تھا کہ تم کون ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو۔

''گھبراؤ نہیں دلبر حسین'' ادھر سے جواب آیا۔ ''میں ریاست کی فوج کا ایک عہدیدار ہوں۔ سامنے آ کر بات سنو۔ دیکھو میں بغیر ہتھیار کے تمہارے سامنے سڑک پر کھڑا ہوں۔''

ایک تھری ناٹ تھری رائفل سنبھالے نوجوان نے پیچھے سے دلبر حسین کو کہا کہ ٹھیک ہے، تم آگے ہو کر بات کرو۔ میں نے تمہیں کور کیا ہوا ہے۔

دلبر حسین بالکونی میں گیا۔ اس کے سامنے ایک سکھ فوجی میجر خالی ہاتھ سڑک پر کھڑا تھا۔

''آپ سب لوگوں کے لئے حکم ہے کہ شیرانوالہ گیٹ پر جمع ہو جائیں۔'' سکھ میجر نے کہا۔ ''مہاراج نے کشت و خون فوراً بند کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اب تمہاری جانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ تم محفوظ ہو۔ شیرانوالہ گیٹ پر تم لوگوں کی تلاشی لی جائے گی اور پھر تم سب لوگوں کو بہادر گڑھ قلعے کے ریفوجی کیمپ میں پہنچا دیا جائے گا۔''

''کیا ضمانت ہے کہ ہمارے ساتھ توپ گھاٹ کے میدان والا سلوک نہیں کیا جائے گا۔'' دلبر حسین نے کہا۔ ''وہاں بھی ہم سرکاری حکم پر ہی گئے تھے۔''

''وہاں جو کچھ ہوا وہ مہاراج کی منشا کے خلاف ہوا ہے۔'' سکھ میجر نے کہا۔ ''مہاراج سخت ناراض ہیں۔ یقین رکھیں، اب آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ تم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ شیرانوالہ گیٹ پہنچ جاؤ تا کہ تمہیں وہاں سے کیمپ میں پہنچایا

جا سکے۔ سکھ میجر پلٹا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ جاتے کہہ گیا۔ "اگر دو گھنٹے تک یہ عمارت خالی نہ ہوئی تو اسے ڈائنا میٹ لگا کر تباہ کر دیا جائے گا۔"

تمام مسلمان سر جوڑے صورتحال پر غور کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ توپ گھاٹ کی طرح کا دوسرا دھوکہ ہے۔ ہمیں یہیں رہ کر صورتحال کا سامنا کرنا چاہئے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں۔ بھوک اور پیاس ہمیں یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دے گی لہٰذا مجبوری کی حالت میں اللہ کے بھروسے پر شیرانوالہ گیٹ چلنا چاہئے۔ شہر سے باہر نکلنے کا راستہ بھی یہی ہے۔ حویلی کے ایک کونے میں بڑا گڑھا کھودا گیا اور خان فیملی کی چاروں رائفلیں اس میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈالی اور زمین برابر کر دی گئی۔ والد اور بوڑھے محافظ نے اپنی بندوقیں حویلی ہی میں پھینک دیں۔ سب اپنا مختصر سامان اٹھائے شیرانوالہ گیٹ کی طرف چل پڑے۔ والد نے حکیم صاحب سے کہا کہ بہتر ہے ہم اپنے گھروں کو واپس چلیں جب مرنا ہی تو کیوں نہ اپنے گھر کی چار دیواری میں موت قبول کریں۔ حکیم صاحب نے جو کہ شیرانوالہ کی طرف جانے کی بجائے گھر جانے کے لئے واپس ہوئے۔ ابھی چند قدم بھی نہ اٹھائے تھے کہ ہندو سکھ فوجیوں نے ہماری جانب اپنی رائفلیں سیدھ کر لیں اور کہا کہ "شیرانوالہ گیٹ کی طرف جاؤ گے تو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ کسی اور طرف جاؤ گے، گولی ماردی جائے گی۔"

ناچار ہم سب بھی رخ پلٹ کر شیرانوالہ گیٹ کی جانب چل پڑے۔ شیرانوالہ گیٹ کا فاصلہ ایک میل کے قریب تھا، سڑک پر ہمیں جا بجا لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ لاشوں میں بے تحاشا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ پٹیالہ شہر کا گھاس منڈی کا علاقہ کہلاتا تھا۔

یہ سڑک بیس فٹ چوڑی تھی، یہاں بھی مسلمانوں کا وسیع پیانے پر قتل عام ہوا تھا۔ سڑک اور ملحقہ گلیاں لاشوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ دور سے شیرانوالہ گیٹ نظر آ رہا تھا جو بند تھا۔ یہاں جو کچھ دیکھا اس سے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ بعض جگہ تو لاشیں اس بری طرح سے کاٹی ہوئی تھیں کہ ان کی شناخت مشکل ہو رہی تھی۔ بعض کی گردنیں کٹی ہوئی الگ

پڑی تھیں، کہیں کوئی بازو اور کہیں کوئی ٹانگ کٹی پڑی تھی۔ شدید بارشوں کی وجہ سے سڑک کے اردگرد بہنے والی نالیاں اب نالوں میں تبدیلی ہو چکی تھیں۔ بہت سی لاشیں ان میں پڑی ہوئی تھیں اور پھول چکی تھیں۔ ان سے سخت بدبو اٹھ رہی تھی۔ سڑک پر لاشوں کے انبار اس قدر زیادہ تھے کہ اب گزرنا دشوار ہو رہا تھا ایک جگہ پر لاشیں ایک لائن میں قرینے سے رکھی تھیں اور ان سب کی گردنیں کاٹ کر ایک فٹ پاتھ پر رکھی گئی تھیں۔ شاید رام راج اور خالصتان کے سورماؤں نے یہاں اپنے فوجی ڈسپلن کا نمونہ پیش کیا تھا۔

چند گز اور آگے گئے تو ایک بھیانک منظر دیکھا۔ یہ بالکل برہنہ عورتوں کی لاشیں تھیں۔ یہ بھی سڑک کے عین درمیان ایک ہی لائن میں رکھی گئی تھیں۔ درندگی کا اس سے زیادہ ہولناک اور شرمناک مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ان کی چھاتیاں کٹی تھیں۔ ان لاشوں کے سروں کے پیچھے ایک چھڑی گاڑ کر گتے کے ایک ٹکڑے پر لکھا تھا۔ ''یہ ہے تمہارا پاکستان۔''

شاید یہ بورڈ اور لاشوں کی بے حرمتی کا اہتمام ہمیں ہی دکھانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ہمارے ذہن ماؤف ہو گئے۔ خوف اور دہشت سے ہم بھی زندہ لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ شیرانوالہ گیٹ ابھی بند تھا اور ہم اس سے ابھی دو سو گز دور تھے۔ مسلمان خوف و ہراس اور یاس کے مجسمے بنے سڑک کے کنارے اپنے انجام کے انتظار کھڑے تھے۔ ہم بھی سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ میرا چھوٹا تین سالہ بھائی شبیر رو رہا تھا کہ بھوک لگ رہی ہے، روٹی لا کر دو، ہمیں کچھ کھائے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ چچا احمد ایک گلی کے اندر گئے۔ والد نے منع بھی کیا لیکن چچا یہ کہہ کر چلے گئے کہ کھلے گھر میں دیکھتا ہوں، شاید کوئی چیز کھانے کو مل جائے۔ وہ دس منٹ بعد واپس آئے۔ چچی اور والدہ سے کہا کہ اس گلی میں ایک گھر ہے۔ کچھ عورتیں ایک بڑے توے پر روٹیاں پکا رہی ہیں۔ جلدی چلو اور دو روٹیاں ان بچوں کے لئے پکا لو۔ یہ چپ ہو جائیں گے۔

ہم سب اور حکیم جی کے اہل خانہ بھی چچا کے پیچھے گلی میں گئے۔ چند قدم کے فاصلے پر چچا ایک گھر میں داخل ہوئے۔ صحن میں ایک بڑی پرات میں بہت سا آٹا گوندھا پڑا

تھا اور چند عورتیں ایک بڑے توے پر روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ہمشیرہ اور چچی نے جلدی سے چار روٹیاں پکائیں۔ ہم ایک طرف کھڑے صحن کے اردگرد کمروں میں جھانک رہے تھے۔ کمروں میں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ شاید یہ اس گھر کے مکین تھے جو قتل ہو چکے تھے۔ ایک کمرے میں چارپائی پر ایک ضعیف العمر بوڑھا کھیس اوڑھے پڑا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا۔ تمام بستر پر خون تھا اس کی کھوپڑی کاٹ دی گئی تھی جو سرہانے ہی نیچے پڑی تھی۔

ہماری عورتوں نے چند روٹیاں پکا لیں۔ والد نے ان کے ٹکڑے کئے اور ہم سب کو دیئے۔ ہم میں کوئی نہیں کھا رہا تھا۔ ماحول پر اس قدر دہشت چھائی ہوئی تھی کہ لقمہ منہ میں نہیں جاتا تھا۔ والد نے ہمارے سروں پر ہاتھ رکھ کر ہمیں پیار دیا اور کہا، کھالو، بیٹا شاید یہ زندگی کے آخری نوالے ہیں۔

ہم اس گھر سے نکلے چند قدم دور ایک بزرگ گلی میں کھڑے تھے۔ حیرانی والی بات یہ تھی کہ ان کے ہاتھوں میں سو سو روپے کے نوٹوں کے بہت سے بنڈل تھے۔ بنڈل انہوں نے زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے سامنے سے ہر گزرنے والے کو روکتے اور کچھ نوٹ پیش کرتے تھے لیکن لوگ یوں بدک کر گزر جاتے تھے جیسے یہ نوٹ انہیں کاٹ لیں گے، ''رکھ لو'' یہ بزرگ کہہ رہے تھے۔ ''شاید زندہ رہ جاؤ اور یہ تمہارے کام آئیں گے۔''

کوئی بھی ان نوٹوں کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ میرے والد کو بھی انہوں نے گزرتے ہوئے بازو پکڑ کر روکا اور کہا کہ ''تم مجھے سنجیدہ اور سمجھدار لگتے ہو۔ تمہارے ساتھ بچے بھی ہیں۔ لو یہ رکھ لو اگر تم لوگ بچ گئے تو ان نوٹوں کی ضرورت پڑے گی۔''

''محترم!'' والد نے جواب دیا۔ ''زندگی کی امید باقی نہیں رہی تو ان نوٹوں کی کیا حقیقت رہ گئی ہے۔''

''میں انہیں آگ لگانے جا رہا تھا'' بزرگ نے کہا۔ ''پھر سوچا کیوں نہ انہیں اپنے مسلمان بھائیوں میں بانٹ دوں۔ شاید کسی کے کام آجائیں۔'' انہوں نے بہت سے نوٹ زبردستی والد کی پتلون کی جیب میں ڈال دیئے۔

گلی سے نکلتے ہوئے ایک اور گھر کے پھاٹک پر نظر پڑی۔ یہ بھی ایک بڑی حویلی

تھی، پھاٹک کھلا تھا بے شمار لاشیں نیچے اوپر پھاٹک کے اندر اور باہر ڈھیروں کی صورت میں پڑی تھیں۔ خدا جانے اس حویلی کے اندر کتنی لاشیں پڑی ہوں گی۔

اتنی لاشیں دیکھ کر ہم بے حس ہو چکے تھے۔ ہمارے ذہن ماؤف ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ شیرانوالہ گیٹ کی یہ ملحقہ آبادی توپ گھاٹ کے میدان میں نہیں گئی اور یہیں اس انجام کو پہنچی۔

ہم سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ سامنے شیرانوالہ گیٹ کھل گیا تھا۔ اس کے اندر آگے دو ٹینک کھڑے تھے۔ دونوں طرف ایک ایک آدمی گزر سکتا تھا، گزرنے والوں کی جامہ تلاشی ہو رہی تھی۔ ہم بھی گیٹ کی جانب آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ اف خدا کی پناہ، یہ کس قدر بھیانک منظر تھا۔ دروازے پر بہت سے کٹے ہوئے انسانی سر لٹک رہے تھے۔ نیچے بہت زیادہ لاشیں تھیں، ہم بچ بچ کر لاشوں پر سے گزر رہے تھے۔ دروازے سے تقریباً بیس گز پیچھے ایک جوان برہنہ لڑکی کی لاش ایک مکان کے چبوترے پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رکھی ہوئی تھی جیسے لڑکی بیٹھی ہوئی ہو۔ برہنہ ٹانگیں چبوترے سے نیچے لٹک رہی تھیں اور بازو رانوں کے اوپر رکھے تھے۔ اس کی گردن دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میری والدہ نے اپنے سر سے چادر اتاری، اس کو درمیان سے پھاڑ کر دو ٹکڑے کیا۔ ایک ٹکڑا اپنے سر پر رکھا۔ باقی نصف چادر سے لاش کا سامنے والا حصہ کاندھوں سے لے کر ٹانگوں تک ڈھانپ دیا۔ چبوترے پر چڑھ کر چادر کے دونوں کونے شانوں کے پیچھے مضبوطی سے پھنسا دیئے۔

گیٹ پر پہنچ کر ہم بھی ایک ایک کر کے تلاشی دے کر گزرنے لگے۔ والد نے مسلمان بزرگ کے دیئے ہوئے نوٹ ہاتھ پر ڈالے ہوئے کمبل کی ایک تہہ میں رکھے ہوئے تھے جو تلاشی میں بچ گئے۔ چچا احمد کے ہاتھ میں زیورات والی چھوٹی سی صندوقچی تھی۔ اسے چھوٹا سا تالا لگا ہوا تھا۔ ایک سکھ فوجی نے کہا کہ اسے کھولو۔ چچا احمد نے کہا کہ چابی کہیں گم ہو گئی ہے۔ یہ آپ لوگ ہی رکھ لیں۔ سکھ فوجی نے صندوقچی نیچے رکھی۔ اپنے

بوٹ سے تالے پر ضرب لگائی۔ معمولی سا تالا ایک ہی ضرف سے کھل گیا۔ سکھ نے صندوقچی کا ڈھکن کھولا پھر چچا کی طرف بغور دیکھا۔ ڈھکن فوراً بند کیا جیسے کوئی دیکھ نہ لے۔

''یہ لے جاؤ'' صندوقچی چچا کے ہاتھ میں دے کر سکھ نے کہا۔ ''تمہارے کام آئے گی۔''

درندوں میں بھی کچھ انسان تھے۔ شیرانوالہ گیٹ کے باہر جو مسلمان تلاشی دے چکے تھے، بیٹھے ہوئے تھے اور باقی تلاشی دے کر ان کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ یہ شہر کے باہر کھلا علاقہ تھا۔ سامنے سٹی ہائی سکول کی عمارت تھی اور اس کے سامنے سڑک کے پار سکول کا وسیع گراؤنڈ تھا جو بارشوں کی وجہ سے جھیل بنا ہوا تھا۔ اس میں بھی بے شمار لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس گراؤنڈ کے جنوبی سرے سے وہ نالہ گزر رہا تھا جو توپ گھاٹ کے میدان کی طرف سے آتا تھا۔ یہ نالہ بھی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔

شام کے چار بجے تک تقریباً سات ہزار مسلمان تلاشی دے کر سڑک کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تھے پٹیالہ شہر کے بچے کھچے مسلمان جنہوں نے جانے کن کونوں کھدروں میں چھپ کر جانیں بچائی تھیں۔ صرف پٹیالہ شہر میں مسلمانوں کی آبادی دو لاکھ تھی جن میں سے یہ صرف سات ہزار مسلمان زندہ بچے تھے۔ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے کشمیر اور حیدرآباد دکن کے بعد پٹیالہ ہندوستان کی تیسری بڑی ریاست تھی۔ 1947ء میں مشرقی پنجاب میں جو دس لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے تھے۔ ان میں صرف ریاست پٹیالہ میں پانچ لاکھ اور باقی پانچ لاکھ بقیہ تمام مشرقی پنجاب میں شہید ہوئے تھے۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام سب سے زیادہ اسی سکھ ریاست میں ہوا تھا۔ پٹیالہ شہر میں دو لاکھ مسلمانوں کا خون بہایا گیا تھا۔ دوسرا سب سے بڑا قتل عام سکھ ریاست کپورتھلہ میں ہوا تھا۔

پانچ بجے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ بہادرگڑھ کے قلعے کی طرف چلو۔ یہ قلعہ جو مغلوں کے دور میں تعمیر ہوا تھا، چھ میل دور تھا۔ ہم سب سڑک پر قافلے کی شکل میں چلنے لگے۔ بڑا ہی دردناک منظر تھا۔ بعض لوگوں نے اپنے شدید زخمیوں کو اپنی پیٹھوں اور کندھوں پر اٹھایا ہوا اور کچھ انتہائی تکلیف اور کرب حالت میں چل رہے تھے۔ شہر پیچھے رہ گیا اور کھیت

آ گئے۔ کھیتوں میں بھی مسلمان کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ پٹیالہ آرمی کے کچھ دستے سڑک دونوں جانب قافلے کے ساتھ چل رہے تھے۔

مغرب کے بعد یہ قافلہ قلعے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ ہمیں دروازے کے ساتھ قلعے کی پہلی کورٹ میں ٹھہرایا گیا۔ ایک بہت ہی لمبا اور تقریباً سو گز چوڑا کورٹ تھا۔ ہمیں حکم دیا گیا۔ رات یہیں گزار دو، صبح قلعے اندر لے جایا جائے گا۔ مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں سجدہ شکر بجالائے۔ خدا نے ان کی زندگیاں شاید بخش دی تھیں۔ تھکے ہارے خوف و ہراس کے مارے ہوئے اور زخموں سے خون ٹپکاتے مسلمان زمین پر بیٹھ کر اپنے رب کے حضور عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے۔ گھپ اندھیرا تھا۔ پیاس شدت سے لگ رہی تھیں لیکن کہیں پانی نہیں تھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ نڈھال ہو کر ہم لوگ زمین پر لیٹ گئے۔

صبح آٹھ بجے دوسرا دروازہ کھلا۔ یکے بعد دیگر چھ دروازوں سے گزر کر ہم قلعے کے صحن میں پہنچے۔ ایک طرف قلعے کی عمارتیں اور ان کے سامنے بہت بڑا وسیع و عریض میدان تھا۔ میدان کے پار ایک چھوٹا سا کچے گھروں کا گاؤں آباد تھا جسے بہادر گوٹھ کہتے تھے۔ گاؤں خالی پڑا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ان کے مکینوں کے ساتھ کیا گزری سنا تھا کہ اس گاؤں میں سبھی مسلمان آباد تھے۔ نہ جانے وہ کہاں گئے قتل کر دیئے یا نکال دیئے گئے۔ اس سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کو قلعے میں جگہ دی گئی اور کچھ کو گاؤں میں ٹھہرا گیا۔ میرے والد بھی گاؤں کے ایک مکان میں آ گئے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ حکیم صاحب بھی قلعے کے اندر ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گاؤں میں دو کنویں تھے۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے کنوؤں سے پانی نکال پیاس بجھائی۔ ریاست کی طرف سے کچھ ٹرک صرف آٹا لے کر آئے اور فی کس ایک پاؤ آٹا چوبیس گھنٹے کے لئے دے کر چلے گئے۔

تین ماہ تک اس کیمپ میں ریاست کے باقی حصوں کے بچے کھچے مسلمان بھی دھکیل دیئے گئے۔ اب یہاں چالیس ہزار کے لگ بھگ مسلمان اکٹھے ہو چکے تھے۔ راشن جو ہمیں دیا جا رہا تھا، وہ مسلم دشمنی سے پاک نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ اس میں کانچ اور نیلے

تھوتھے کی آمیزش کی جانے لگی۔ جس سے مسلمان پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ طبی امداد کا کوئی معقول بندوبست نہ تھا۔ ایک معمولی سی ڈسپنسری تھی۔ میں اور تمام گھر والے بھی بیمار ہو چکے تھے۔ کیمپ میں صفائی کا بھی ناگفتہ بہ انتظام تھا۔ مسلمان انتہائی کسمپرسی میں دن گزار رہے تھے اور اپنے خدا سے یہاں اس قید سے جلد رہائی کے لئے دعا مانگ رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کو شاید اپنے بندوں کا اور امتحان مقصود تھا۔ کیمپ میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور مسلمان دھڑا دھڑ مرنے لگے۔ مردوں کو دفنانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ کچھ لوگ اکٹھے ہوتے، میت کو اٹھاتے اور حکم کے مطابق قلعے کے دروازے پر چھوڑ آتے۔ وہاں سے بھنگی انہیں اٹھاتے اور گڑھا کھود کر دفن کر دیتے۔ ایک ماہ کے اندر اندر کیمپ کے نصف مسلمان موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ مرنے والوں کے لئے کفن تھا اور نہ نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت تھی۔

قلعے کے کیمپ میں ایک سکھ نے یہ بھی بتایا کہ قتل عام کے تیسرے روز پٹیالہ شہر کی سڑکوں پر مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا تھا جنہیں مردوں کے قتل کے بعد اغواء کیا گیا تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کے ایک ہجوم نے ان عورتوں کے گرد وحشیانہ رقص کیا اور انتہائی غلیظ زبان میں فقرہ بازی کی تھی۔

چھ ماہ ہم اس قلعے میں قید رہے۔ یہاں ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں، وہ ایک طویل اور ہولناک داستان ہے۔ چھ ماہ بعد پاکستان کے ایک وفاقی وزیر میاں افتخار الدین کیمپ کے دورے پر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ریاست کے اعلیٰ حکام بھی تھے۔ کسی مسلمان نے ان ریاستی حکام کے ڈر کے مارے وزیر موصوف کو اپنی تکلیفیں بیان کرنے کی جرأت نہ کی۔ میاں افتخار الدین نے کہا کہ یہ کیمپ بہت محفوظ ہے۔ ہم پہلے ان کیمپوں سے مسلمانوں کو پاکستان پہنچا رہے ہیں جو کھلے اور غیر محفوظ ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کم از کم تین ہفتے اور زیادہ سے زیادہ چھ ہفتوں میں آپ لوگوں کو یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ وزیر موصوف واپس چلے گئے۔

اچانک ایک روز قلعے میں مقید مسلمانوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے جب

انہیں یہ نوید سنائی دی کہ پہلی گاڑی چند روز میں مسلمانوں کو پاکستان لے جانے کے لئے آ رہی ہے۔ ریاستی انتظامیہ نے کرنل لطیف کو یہ کام سونپا کہ پہلی ٹرین میں جانے والوں کا انتخاب کریں۔ فہرستیں تیار کریں۔ پہلی ٹرین میں جانے کے لئے ان لوگوں کا انتخاب کیا گیا جو قلعے اور بہادر گڑھ گاؤں کے درمیان کھلے میدان میں پڑے ہوئے تھے۔

اسی روز پہلی ٹرین سے جو مسلمان جا رہے تھے۔ وہ اپنے باقی بھائیوں سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ 7 ہزار مسلمان پہلی ٹرین سے کیمپ کے نزدیک کولی ریلوے سٹیشن سے پاکستان کو روانہ ہو گئے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ لوگ دوسری ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ تشویشناک خبریں سنائی دینے لگیں۔ کیمپ کے مسلمانوں کا تو بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہندو اور سکھ جو سودا بیچنے آتے تھے، باہر کی خبریں سنایا کرتے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ کشمیر میں خوفناک جنگ ہو رہی ہے۔ پٹیالہ ریاست کی بھیجی ہوئی دونوں فسٹ پٹیالہ آرمی اور تھرڈ پٹیالہ آرمی مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہیں۔ سات ہزار کی نفری سے صرف ڈیڑھ سو کے لگ بھگ آدمی زندہ بچے ہیں۔ لوگ خدشہ ظاہر کر رہے تھے کہ ان کا بدلہ کہیں معصوم اور بے گناہ مسلمانوں سے نہ لیا جائے۔ کیمپ کے ہندو سکھ پہریداروں کا رویہ پہلے سے بہت زیادہ سخت ہو گیا تھا۔

آخر دوسری گاڑی مسلمانوں کو لینے آ گئی۔ اس گاڑی میں بھی تقریباً سات ہزار مسلمان پاکستان چلے گئے۔ جانے والوں میں سیکنڈ پٹیالہ آرمی کے مسلمان فوجی بھی تھے جن میں کرنل لطیف بھی شامل تھے۔

کیمپ خاصا خالی ہو گیا تھا۔ باقی رہ جانے والے مسلمان بے چینی سے تیسری ٹرین کے منتظر تھے۔ ایک روز کیمپ میں کرنل گوربخش سنگھ آیا اور میرے والد کو اتنی طویل غیر حاضری کی وجہ بتانے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ”اسے بھی کشمیر بھیجا گیا تھا جہاں ریاست کی دونوں آرمی مکمل طور پر تباہ ہوئیں۔ والد کے ساتھ باتوں میں وہ جہاں پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو گالیاں دے رہا تھا۔ وہاں وہ سکھ لیڈروں، ماسٹر تارا سنگھ اور ہندوستانی وزیر دفاع بلدیو سنگھ

کو بھی گندی گالیوں سے نواز رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ لوگ بھی چند دنوں میں پاکستان چلے جائیں گے۔ ہم لوگ عرصہ دراز سے یہاں بھائیوں اور دوستوں کی طرح رہتے آ رہے تھے لیکن ان لیڈروں کی گندی سیاست نے ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ بہت کم لوگوں نے اس طوفان میں اپنے حواس قائم رکھے۔ اکثریت نے جذبات میں آ کر اپنے دوستوں اور بھائیوں کے خون میں ہاتھ رنگے۔ تم جا رہے ہو۔ ہمیں معاف کر دینا۔ تم دیکھو گے کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا جب سکھ لیڈر اور پوری سکھ قوم پچھتائے گی۔ ہندو کی مکاری نے جہاں مسلمانوں کو ڈنک مارا ہے، سکھ قوم اس کا آئندہ نشانہ بنے گی۔" (1984ء میں سکھوں کے قتل عام نے ہندو کا چہرہ بے نقاب اور 1947ء کی یاد تازہ کر دی۔)

ایک دن کیمپ کے بقایا مسلمان بھی تیسری ٹرین میں سوار ہونے کے لئے کولی ریلوے سٹیشن کو جا رہے تھے۔ گاڑی میں کچھ مسافر ڈبے اور کچھ مال گاڑی کے کھلے چھکڑے تھے۔ مسلمان گاڑیوں کے ڈبوں کے علاوہ چھتوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی مال گاڑی کے چھکڑوں میں بیٹھ گئے تھے۔ اس نازک اور افراتفری کے دور میں پاکستان آرمی کی بلوچ رجمنٹ کے سپاہی اور افسر مسلمانوں کی گاڑیوں اور قافلوں کو اپنی حفاظت میں پاکستان لا رہے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے پوری قوم کا درد ان مٹھی بھر سپاہیوں کے دل میں سمو دیا تھا۔ ہماری گاڑی کے ساتھ بھی بلوچ رجمنٹ کی ایک پلاٹون بطور محافظ موجود تھی۔

ہندوؤں اور سکھوں پر بلوچ رجمنٹ کی اس قدر دہشت تھی کہ انہیں پتہ چل جاتا کہ اس قافلے یا ٹرین کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے جوان ہیں تو وہ ان سے دور ہی رہتے تھے۔

پھر گاڑی رکتی اور چلتی گئی۔ جالندھر سے پیچھے ایک ویران جگہ پر نہ جانے کیوں گاڑی چھ گھنٹے رکی رہی۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان اپنے ڈبے سے اتر آئے تھے۔ وہ مستعد اور چوکس ہو کر گشت کر رہے تھے۔

اتنی دیر رکنے کی وجہ سے مسلمانوں میں خوف اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان سب کو تسلیاں دے رہے تھے۔ سفر میں چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ خدا خدا کر کے گاڑی یہاں سے چلی اور جالندھر سٹیشن پر جا رکی۔ تھکے ماندے

اور بھوکے پیاسے مسلمان دیوانہ وار پانی نلکوں کی طرف دوڑے۔ پہلے تو ہندوستانی پولیس نے انہیں روکا لیکن سٹیشن پر پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر میجر جنرل عبدالرحمٰن موجود تھے۔ ان کی مداخلت پر انہیں پانی لینے کی اجازت ملی۔ میجر جنرل عبدالرحمٰن نے مسلمانوں کو تسلی اور حوصلہ دیا اور کہا کہ صرف چند گھنٹے کی تکلیف ہے۔ آپ پاکستان کی سرحد کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

دو گھنٹے بعد میجر جنرل عبدالرحمٰن ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے کیونکہ افواہ تھی کہ امرتسر ریلوے سٹیشن سے مسلمانوں کی کوئی گاڑی صحیح سلامت گزر کر پاکستان نہیں پہنچ سکی تھی۔ جوں جوں امرتسر نزدیک آ رہا تھا۔ مسلمان اپنے خدا کے حضور دعائیں مانگ رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ گاڑی امرتسر ریلوے سٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو انتہائی رفتار سے سٹیشن کو کراس کر رہی تھی۔ مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے گروپ پلیٹ فارم اور سیڑھیوں پر موجود تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ بتیاں جل رہی تھیں۔ امرتسر سٹیشن بہت پیچھے رہ گیا تھا، مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی اٹاری سٹیشن پر جا کر ٹھہر گئی۔ یہ ہندوستان کا آخری سٹیشن تھا۔ ایک گھنٹہ رکنے کے بعد ٹرین بہت دھیمی رفتار سے چلتی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ یہاں ہمارے فوجیوں، لاہور کے شہریوں اور رضا کار تنظیموں نے ہمارا والہانہ استقبال کیا۔ تمام مسلمان گاڑی سے اتر آئے اور دیوانہ وار پاکستان کی سرزمین کے بوسے لینے لگے۔ نعرۂ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔

......☆......

جموں

مسلمانان جموں وکشمیر نے آل جموں وکشمیر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے یہ واضح طور پر ثابت کردیا تھا کہ انہیں اسلام اور پاکستان سے والہانہ عشق ہے۔ یہ جرم ریاست کا متعصب اور انتہا پسند ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کسی طرح برداشت کرنے کو تیار نہ تھا، لہٰذا اس نے ایک انتہائی بھیانک اور گھناؤنی سازش تیار کی۔ اس نے کانگریس لیڈروں کے ایماء پر انتہا پسند ہندو سکھ تنظیموں اور راشٹریہ سیوک سنگھ، ہندو مہاسبھا، جن سنگھ اور اکالی دل سے رابطہ قائم کیا تا کہ مسلمانوں کا قتل عام کیا جاسکے۔ چنانچہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے مطابق ان دہشت گرد قاتل تنظیموں کے ہزاروں مسلح غنڈوں کو مشرقی پنجاب سے درآمد کیا گیا۔ ان کا ہیڈکوارٹر جموں میں قائم کر کے انہیں فوجی تربیت دی گئی اور وسیع پیمانے پر ریاستی اسلحہ ان میں تقسیم کیا گیا تا کہ مسلمانوں کا قتل عام کرنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اکتوبر 1947ء کے اواخر تک جموں اور کشمیر کے گردونواح کے شہروں اور دیہات میں تمام مسلمان صفحۂ ہستی سے نابود کردیئے گئے۔ جموں میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ تھی۔ ان سب کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ دو لاکھ مسلمان ''غائب'' ہوگئے۔ کلکتہ سٹیٹس مین Statesman کے ایڈیٹر Ian stephen نے لکھا کہ ''یا انہیں ذبح کردیا گیا یا دوسری آفتوں سے مر گئے۔'' مہاراجہ نے دفاع کے بہانے مسلمانوں کی نسلی تطہیر (Ethnic cleansing) یعنی انہیں ختم کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ (A.V. Tunzelmann,p.287) 26 اکتوبر 1947ء کو راجہ ہری سنگھ کشمیر کے

دارالحکومت سرینگر سے بھاگ کر جموں پہنچا اور مسلمانوں کے وحشیانہ قتل عام کی مہم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چنانچہ 5 اور 6 نومبر 1947ء کے دنوں میں خود مہاراجہ کی سرپرستی میں جموں شہر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔

کیونکہ مسلمانوں کی آبادی سارے شہر میں بکھری ہوئی تھی اس لئے پروگرام یہ بنایا گیا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے کے بجائے مسلمانوں کو کسی طرح ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے تاکہ قتل کرنے میں آسانی رہے لہٰذا منادی کرادی گئی کہ تمام مسلمان پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے ہوجائیں جہاں سے انہیں لاریوں میں بھر کر پاکستان پہنچادیا جائے گا جب مہاراجہ اور اس کے چیلوں کو اطمینان ہوگیا کہ تمام مسلمان پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہو چکے ہیں تو پہلے ان کے مکانوں اور دکانوں کو لوٹا گیا اور پھر ان کی "حفاظت" پر مامور پولیس اور فوج نے ان بے بس نہتے مسلمانوں کے کپڑے اور خواتین کے زیورات بھی چھین لئے۔ 5 نومبر 1947ء کی صبح کو انہیں لاریوں اور ٹرکوں میں بھر کر کہا گیا کہ اب انہیں سوچیت گڑھ کے راستے سیالکوٹ پہنچایا جائے گا۔ اس قافلے میں کم ازکم پانچ ہزار مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے جب یہ قافلہ جموں سے چند میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی اوٹ میں پہنچا تو پہلے سے موجود گھات میں بیٹھے ہندو، سکھ قاتلوں اور ان کی مددگار ڈوگرہ فوج اور پولیس نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ سب سے پہلے امت مسلمہ کی جوان بیٹیوں کو زبردستی اٹھا کر لے گئے اور باقی ماندہ مسلمانوں کا فوجی انداز میں قتل عام شروع کردیا، ہزاروں میں صرف چند سو افراد زخمی حالت میں سیالکوٹ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ (A. V. Tunzelmann, p 294) دوسرے روز یعنی 6 نومبر کو جموں سے اور مسلمانوں کو ٹرکوں میں لایا گیا اور پھر وہی وحشیانہ قتل عام دہرایا گیا۔ اس قافلے میں سے صرف تین آدمی زخمی حالت میں سیالکوٹ پہنچنے میں کامیاب ہوسکے۔

9 نومبر 1947ء کو تیس (30) لاریوں پر مشتمل ایک تیسرا قافلہ سوچیت گڑھ کے لئے روانہ کیا گیا لیکن اس سے پیشتر یہ لوگ پاکستان میں داخل ہوسکتے، ان کی حفاظت پر مامور فوج اور پولیس نے تمام مال و اسباب اور عورتوں کو چھین کر مردوں کو گولیوں اور

سنگینوں کا نشانہ بنادیا۔ بین الاقوامی ریڈ کراس کے ایک ذمہ دار فرد نے جس نے ان دنوں ان علاقوں کا دورہ کیا تھا، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کو انٹرویو دیتے ہوئے اس علاقے پر گزرنے والی قیامت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "میں نے ایک وسیع رقبے پر انسانی گوشت کے کٹے ہوئے اور کچلے ہوئے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھے۔ انسانی نعشیں ٹینکوں اور بلڈوزروں کے نیچے کچلی ہوئی پڑی تھیں۔"

سید رکن عالم صاحب جو آگ اور خون کے اس سیلاب سے کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جموں کے ایک مضافاتی گاؤں لنگر پورہ کے مسلمانوں کے درندگانہ قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "سب سے پہلے بچے بھالوں اور کرپانوں کے ذریعے الگ کر دیئے گئے اور ان میں سے بعض کی نعشیں اٹھا کر جھاڑیوں کے اوپر پھینک دی گئیں اور کہا گیا" وہ ہے تمہارا پاکستان" اس کے بعد عورتیں بالکل برہنہ کر دی گئیں اور بالآخر جس طریقے سے قتل کی گئیں وہ حد درجہ ہولناک ہے۔ پھر مرد ذبح کئے گئے اور اس مکروہ طریقے سے کہ ایک ایک عضو کاٹا گیا اور سخت ایذا رسانی کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔" دوسری عورتوں کو ہلاک کرنے سے قبل تین نہایت خوبصورت عورتیں الگ کر لی گئیں۔ جب باقی موت کے گھاٹ اتار دی جا چکیں تو گورکھا فوجی افسران کی طرف متوجہ ہوا اور ان میں سے ایک اپنے لئے چن لی اور ارادہ عصمت دری کا کیا۔ عورت نے شدید مزاحمت کی۔ اس پر وہ ایک درخت سے باندھ دی گئی۔ اب یہ عورت قطعاً برہنہ تھی اور بے دست و پا لیکن وہ گورکھا افسر کو برابر گالیاں دیتی رہی۔ آخر بری طرح آبروریزی کے بعد وہ ان وحشیوں کے ہاتھوں انسانیت سوز طریقے سے ہلاک ہو گئی۔

اس قتل عام کے بارے میں غیر مسلموں کی آراء بھی ملاحظہ ہوں:

"کشمیر ٹائمز" کے ہندو ایڈیٹر مسٹر بج کے ریڈی مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ان وحشیانہ مظالم کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"میں نے خود اپنی آنکھوں

سے پاکستان کی طرف جانے والے بے بس و نہتے مسلمان مہاجرین کو ڈوگرہ سپاہیوں اور غنڈوں کے ہاتھوں گولیوں کی بوچھاڑ میں ڈھیر ہوتے دیکھا ہے۔ ریاست کے افسران اور فوجی حکام ایک مسلح جتھے کو مسلمان مہاجرین پر حملہ آور ہونے اور ختم کرنے کا حکم دے رہے تھے۔ ریاست کے افسران نہایت آزادانہ طور پر ڈوگروں کے ہاتھ اسلحہ اور بارود تقسیم کر رہے تھے۔"

ایک ہندو مورخ پریم ناتھ بزار لکھتے ہیں۔ "مسلمانوں کے وحشیانہ قتل و غارت گری کی یہ صورتحال ریاست کے کسی ایک حصے میں نہیں تھی بلکہ پوری ریاست اس سیلاب ہلاکت کی لپیٹ میں تھی اور ہندو سکھ اور ڈوگرے پوری ریاست میں مسلمانوں کا صفایا کرنے میں مشغول تھے۔"

Alster Lamb اپنی تصنیف Crisis in Kashmir میں لکھتے ہیں "جموں میں پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے داخل ہو گئے جنہوں نے قتل و غارت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے صوبہ جموں کے مسلمانوں کی آبادی دو لاکھ سے کم ہو گئی۔ ہزاروں کو قتل کر دیا گیا اور باقی لوگوں کو مغربی پنجاب میں دھکیل دیا گیا۔"

برطانوی اخبار "لندن ٹائمز" نے اپنے نمائندہ خصوصی مقیم بھارت کے حوالے سے اپنی 10 اکتوبر 1948ء کی اشاعت میں لکھا "فوج نے جموں کے علاقے میں حکومت کی خود اپنی نگرانی میں دو لاکھ سینتیس ہزار مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔"

بے غیرتی یا غداری

رحمت بی بی کو جس کی عمر اس وقت بمشکل 18 برس تھی اور جس کی شادی کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے، اغواء کر کے دوسری 18 لڑکیوں کے ساتھ ایک مکان میں محبوس کر دیا۔ ایک روز انہیں کھلے میدان میں لے جایا گیا۔ وہاں ہندو سکھ درندوں نے انہیں اپنی

اپنی پسند کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیا جس وحشی درندے کے حصے میں رحمت بی بی آئی، اس کا نام گیان تھا جو ایک مدت تک اسے جنسی تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ رحمت بی بی کہتی ہے:

"ایک دن جب گیان گھر پر نہیں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ ریاست کا کٹھ پتلی وزیر اعظم شیخ عبداللہ اس علاقے کے دورے پر آیا ہوا ہے۔ میں شیخ صاحب کو مسلمان سمجھتے ہوئے کسی طرح بچتی بچاتی ان تک پہنچی اور ان سے التجا کی کہ آپ مسلمان ہیں، خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں، میں ایک مظلوم لڑکی ہوں اور ایک ظالم کے پنجے میں پھنسی ہوئی گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہوں، خدا کے لئے مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ میری یہ بات سن کر شیخ صاحب نے کمال بے حمیتی اور سنگدلی سے کام لیتے ہوئے مجھے دھتکارا اور کہا: جا میری آنکھوں سے دور ہوجا، تجھ جیسی کتیاں بہت ہیں جو آوارہ پھرتی ہیں۔" (پروفیسر الیف الدین ترابی، نوائے وقت لاہور 7 نومبر 2013ء)

......☆......

حرفِ آخر

پاکستان جن مقاصد کے لئے حاصل کیا گیا اور قوم نے جس قدر اس کے حصول کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ اس کی مثال دنیا کی کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتی مگر افسوس قائداعظمؒ کی وفات کے بعد اس خداداد مملکت کے عاقبت نااندیش اور مفاد پرست سیاستدانوں اور آمروں نے اس کی عظمت اور قوم کی بے مثال قربانیوں کی کوئی قدر نہ کی، قوم کی اخلاقی اور تعمیری اقدار پامال ہو چکی ہیں۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ، رشوت، بددیانتی اور قتل و غارت گری کے عفریت برہنہ صورت ناچتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ادھر ہندو نے اسلام دشمن طاقتوں سے ساز باز کر کے اس کے مشرقی بازو کو اس سے علیحدہ کر دیا ہے اور بقیہ پاکستان میں صوبائیت کے زہر پھیلانے اور اس کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لئے دشمن گروہ اور طاقتیں دن رات کوشاں دکھائی دیتی ہیں مگر میں قوم کی باصلاحیت شخصیات اور اس کے غیور نوجوانوں سے مایوس نہیں، مجھے یقین کامل ہے کہ میری قوم کے یہ نوجوان جن کی رگوں میں اپنے اسلاف کا خون موجزن ہے اپنی غیرت ایمان کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوئے نہ صرف پاکستان کی عظمت و استحکام کو برقرار رکھیں گے بلکہ سازشوں کے تحت اس سے علیحدہ کئے گئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی سعادت بھی حاصل کریں گے جن کا ذرہ ذرہ آج بھی ان کا منتظر ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد
اقبالؒ

اللہ کرے میری یہ آرزو میری زندگی ہی میں پوری ہو۔ آمین۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.

وتب علینا انک انت التواب الرحیم

میاں محمد ابراہیم طاہر کی دیگر کتب